ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

بُرہان

مُرتّب

سعید احمد اکبرآبادی

بُرہان

جلد ۳۹ شمارہ ۱

جولائی ۱۹۵۷ء مطابق ذی الحجہ ۱۳۷۶ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

مئی کے برہان کے نظرات میں لکھا گیا تھا کہ اسلام کو ہر دور اور ہر زمانہ کی ایک متحرک، انقلابی طاقت بنانے کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ اسلام ہر عہد کے اجتماعی تمدنی اور اقتصادی و سیاسی مسائل جن کا براہ راست تعلق انسانی معاشرہ کے صلاح و فساد سے ہے۔ ان کا بہترین اور کامیاب حل پیش کرے۔۔۔ اور دوسری چیز جو اس سے بھی زیادہ ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اس اسلامی فکر کی حامل جو جماعت ہو اس میں اخلاق اور کردار کے اعتبار سے انفرادیت ہو اور وہ اپنے مخصوص نظامِ فکر و عمل کے ساتھ وابستگی میں سخت کٹر اور متعصب ہو۔

آج کل ہماری زبان میں تعصب کا لفظ جس معنی میں بولا جاتا ہے اور جس کا لازمی نتیجہ تنگ دلی۔ تنگ نظری اور دوسروں کے ساتھ عدم رواداری ہوتا ہے اس کی وجہ سے مذکورۂ بالا عبارت کے آخری الفاظ سے بعض لوگوں کو سخت قسم کا خلجان پیش آگیا ہے۔ اس لئے یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ مسلمانوں کے معاملات کی دو قسمیں ہیں۔ ایک سماجی اور معاشرتی اور دوسرے دینی اور شرعی۔ جہاں تک پہلی قسم کے معاملات کا تعلق ہے ایک مسلمان کو کسی دوسرے مسلمان یا غیر مسلم کے ساتھ معاملہ کرنے میں خوش خلق۔ فیاض۔ عالی حوصلہ اور شگفتہ مزاج ہونا چاہئے اور یہی اسلام کی تعلیم ہے لیکن دوسری قسم کے معاملات میں ضروری ہے کہ مداہنت سے کام نہ لیا جائے اور اس میں تشدد برتا جائے۔

صرف اسلام کے ساتھ مخصوص نہیں۔ دنیا کی ہر پارٹی۔ ہر جماعت اور ہر گروہ کا یہ شیوہ ہوتا ہے کہ جب تک اس پارٹی کا ہر ممبر پارٹی کے تمام اصول کو صحیح سمجھ کر اس پر عمل پیرا نہ ہو پارٹی میں مضبوطی نہیں پیدا ہوتی۔ کوئی حکومت اس کو برداشت نہیں کر سکتی کہ ایک شخص حکومت کے ساتھ وفاداری کا زبانی اظہار کرکے اس کے قانون و ضابطہ کی خلاف ورزی کرے۔ آج روس میں کیا

ہو رہا ہے؟ بڑے بڑے پرانے اور آزمودہ کار کمونسٹوں کو پارٹی کی ممبری سے خارج کر دیا گیا۔ کیوں؟ صرف اس لئے کہ یہ لوگ پارٹی کی موجودہ پالیسی کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے۔ ہمارے ملک میں کانگرس کا جو ممبر جماعت کے اصول کے خلاف عمل پیرا ہوتا ہے۔ کانگرس اس کے خلاف تادیبی کارروائی کرتی ہے اور اس کو پارٹی سے نکال باہر کر دیتی ہے۔ قرآن میں بعض حرام افعال کے ارتکاب پر مرتکب کو عذابِ جہنم ابدی کا سزاوار قرار دیا گیا ہے احادیث میں بعض خاص خاص احکام اسلام کی خلاف ورزی پر اعلان کیا گیا ہے کہ یہ شخص اسلام سے خارج ہو جاتا ہے مثلاً جس نے نماز ترک کی وہ کافر ہو گیا، جس میں امانت نہیں ہے اس میں ایمان نہیں ہے۔ جو بڑوں کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ جب آدمی زنا کرتا ہے تو ایمان اس سے جدا ہو جاتا ہے یہ اور اسی طرح کی دوسری تمام روایات اُن سب کا حاصل اور اصل مقصد یہی یہ بتانا ہے کہ اسلام کی بنیادی تعلیمات سے ہر عملی انحراف اس لائق ہے کہ منحرف کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے اور اُس کو یوں ہی نہ چھوڑ دیا جائے۔ حضرت ابو بکر صدیق نے مانعین زکوٰۃ کے خلاف قتال کا جو اعلان کیا تھا اُس کی اصل روح بھی یہی پارٹی ڈسپلن تھا۔ اس پارٹی ڈسپلن کا تعلق علم کلام کی اُس بحث سے ہرگز نہیں ہے کہ ایمان کے ساتھ عمل کا کیا تعلق ہے؟ وہ ایمان کے لئے شرط ہے یا شطر؟ پس ہم نے احکام اسلام کی بجا آوری میں جس تشدد کا ذکر کیا تھا اُس سے مراد صرف وہی تشدد تھا جو پارٹی ڈسپلن قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے اور جس کے بغیر کسی پارٹی۔ کسی جماعت اور کسی ادارہ میں استحکام (SOLIDARITY) پیدا نہیں ہو سکتا، اسلام میں حدود و عقوبات بھی اسی غرض سے ہیں۔

ایک معاصر جس نے مذکورۂ بالا نظرات پر بڑی لے دے کی ہے حسنِ خلقِ نبوی کا ذکر کر کے لکھتا ہے کہ احکامِ اسلام میں یہ تشدد ہوتا تو پھر حضورؐ صاحبِ خُلقِ عظیم کس طرح ہوتے؟ لیکن ہر شخص جان سکتا ہے کہ اس تشدد کا بد خلقی یا درشت مزاجی سے کیا تعلق ہے؟ حضرت عمرؓ کی نسبت فرمایا گیا ہے "اشدھم فی امر اللہ عمر" تو معاذ اللہ کیا اُس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عمرؓ

اسلام کے اخلاقِ حسنہ کے حامل نہیں تھے اور وہ بدخلق و بدمزاج تھے تاریخ کا طالب علم جانتا ہے کہ اسلامی احکام کی بجا آوری میں نہایت سخت گیر اور متشدد ہونے کے باوجود حضرت عمرؓ کے خلق کا یہ عالم تھا کہ آپ کا ایک نوکر آخری وقت تک غیر مسلم رہا اور آپ نے اس کو مسلمان ہونے پر مجبور نہیں کیا۔ اسی طرح اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سخت گیری کا یہ عالم تھا کہ بنو مخزوم کی ایک عورت جس نے چوری کے جرم کا ارتکاب کیا تھا جب آپ کے پاس اُس کی سفارش پہنچی تو آپ نے اُس کو رد کر دیا اور فرمایا کہ اگر میری بیٹی فاطمہ سے بھی اس جرم کا ارتکاب ہو جاتا تو میں اُس کو معاف نہ کرتا تو بناہِ بخدا کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور فظ اور غلیظ القلب تھے؟

۳ اور ۴ جولائی کو علی گڑھ میں انجمن ترقی اُردو (کل ہند) کی طرف سے ایک اُردو کانفرنس ہوئی تھی۔ موسم کی سخت ناموافقت اور بعض دوسرے اسباب کی بنا پر یہ کانفرنس اجتماع اور شرکا کی تعداد کے اعتبار سے تو کچھ زیادہ کامیاب نہیں رہی۔ لیکن اُس کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ انجمن کی شاخوں کے نمائندے اور اُردو زبان کے بہت سے ادیب اور صاحب قلم ملک کے دور دراز حصوں سے آ کر ایک جگہ جمع ہو گئے اور اس طرح ان کو اردو کے موجودہ معاملات و مسائل پر باہم گفت و شنید۔ بحث و تمحیص اور تبادلۂ خیالات و افکار کا موقع ملا اور اُردو کی ترویج اور اس کی ترقی و اشاعت کے لئے ملک کے مختلف حصوں میں جو کوششیں ہو رہی ہیں اور خود انجمن ترقی اردو نے اب تک جو کام کئے ہیں اور آئندہ جو کام کرنا چاہتی ہے اُن سب کا جائزہ لینے کا موقع ملا۔ کانفرنس کے دو روزہ اجلاس میں متعدد تجاویز منظور ہوئیں جو بہت اہم اور ضروری ہیں۔ لیکن محض تجویزیں منظور کر دینا کافی نہیں۔ اصل چیز اخلاصِ عمل اور سرگرمی و جوش ہے اور کانفرنس میں یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ انجمن کی شاخوں کے جو نمایندے اور دوسرے ادیب اور اہل قلم اس کانفرنس میں شریک تھے معلوم ہوتا تھا کہ وہ سب اُردو کے سچے اور مخلص خادم ہیں اور جوش کے ساتھ ہوش سے بھی عاری نہیں ہیں انجمن ترقی اُردو ہند کے جنرل سکریٹری آل احمد صاحب سرور سے امید ہے کہ وہ شاخوں کی تنظیم پر زیادہ توجہ دے کر اور ان میں باہمی ربط پیدا کر کے اُردو کے مخلص کارکنوں کے جذبہ و عمل سے پورا فائدہ اُٹھائیں گے۔
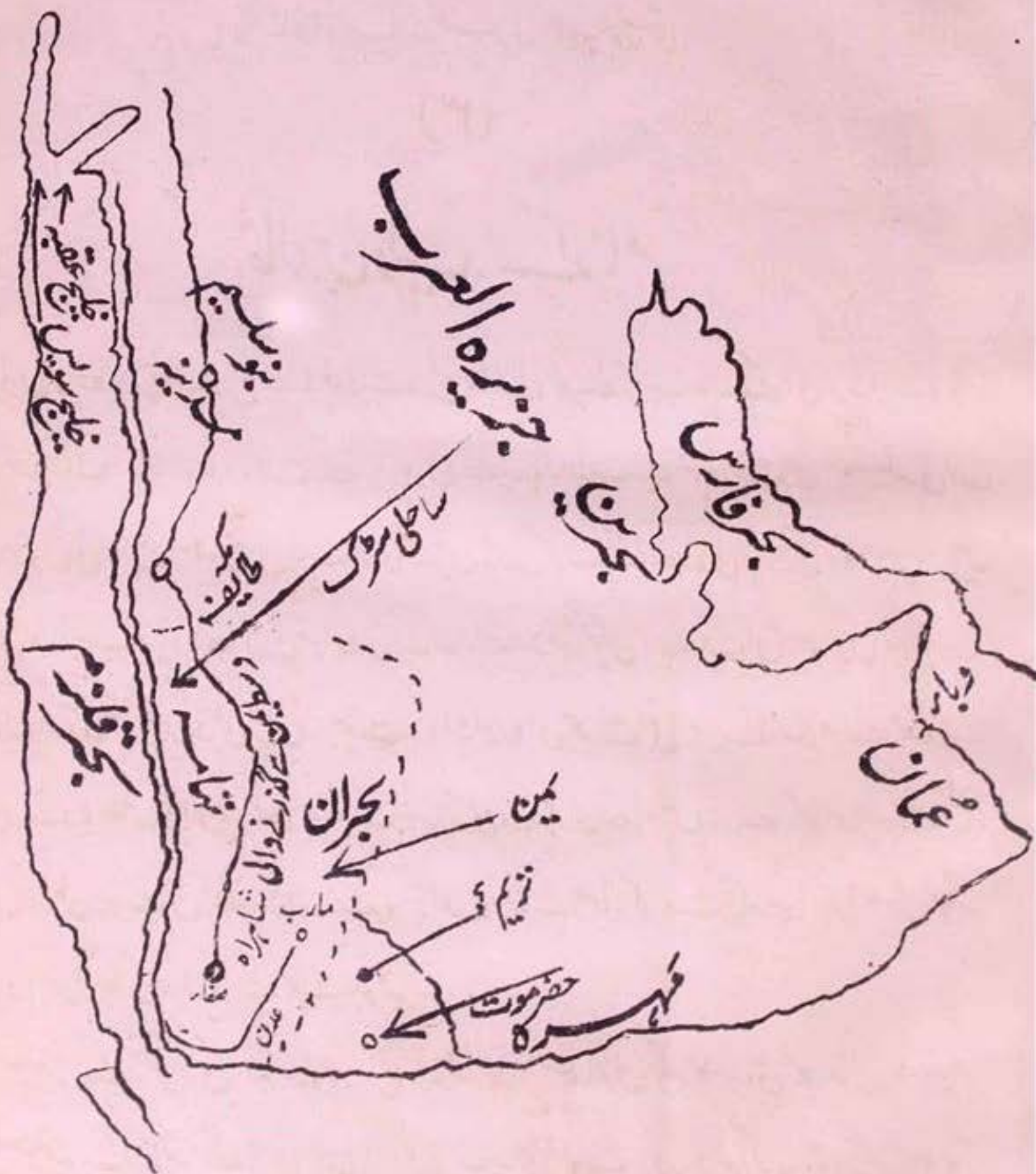
عمان
بحر فارس
بحرین
جزیرۃ العرب
ساحلی سڑک
بنو سلیم
مدینہ
مکہ
طائف
تہامہ
بحر قلزم
خلیج سویز
خلیج عقبہ
نجران
یمن
مارب
حضرموت
مہرہ
بحر ہند

حضرت ابوبکرؓ کے سرکاری خطوط

از

جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب فارق

(استاذ ادبیات عربی دہلی یونیورسٹی)

(۳)

۷۔ خالد بن ولید کے نام

ذیل کا خط ناسخ التواریخ سے ماخوذ ہے۔ فتح یمامہ کی خبر لے کر جب خالد کے ایلچی مدینہ آئے تو ابوبکر نے ان سے جنگ کے حالات دریافت کئے۔ انھوں نے بتایا کہ جنگ بے انتہا سخت تھی، مسیلمہ کی فوج بھوکے چیتوں کی طرح مسلمانوں پر ٹوٹ پڑی اور تین بار ان کو پسپا کیا، خالد کی فوج کی وہ صفیں جن میں بدو عربوں کا تناسب زیادہ تھا ان کی تلواروں کے سامنے منہ موڑ گئیں، یہ صرف ان مسلمانوں کی جنہوں نے رسول اللہ کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ ہمت مردانہ اور دینی حمیت تھی جس نے اسلام کے جھنڈے کو نیچا نہ ہونے دیا، اس کی ان کو بھاری قیمت دینا پڑی، وہ بڑی تعداد میں مارے گئے اور بہت بڑی تعداد میں گھائل ہوئے ان تفصیلات سے ابوبکر اور دوسرے صحابہ کو بہت دکھ ہوا، ان کا دل ہمیشہ سے زیادہ بنو حنیفہ کی طرف سے سخت ہو گیا۔

"مسیلمہ کے قتل کی خبر پہنچی، فتح یمامہ اور مسلمانوں کی کامیابی کا حال معلوم ہوا۔ مسیلمہ کے خاتمہ کے معنی ہیں کہ اہلِ یمامہ کی قوت اور دھاک بھی ختم ہو گئی، کیوں کہ بے سردار کی فوج اس جسم کی طرح ہے جس کا سر کٹ گیا ہو۔ اب ان کے قلعہ کا محاصرہ کر لو، اور جب تک وہ فتح نہ ہو جائے وہاں سے نہ ہٹو، اہلِ یمامہ

چاہے کتنا چاہیں کہ تم سے سمجھوتہ کرلیں پر تم لڑے ہی جانا، اور جب قلعہ فتح ہو جائے تو ان کے سب مردوں کو مار ڈالنا، اور ان کی عورتوں بچوں کو غلام بنا لینا۔ اور ان کی ساری زمینوں، سونے چاندی اور سامان پر قبضہ کرلینا"۔ ناسخ التواریخ محمد تقی بمبئی ۲/ قسم ثانی/ ۹۳

۸۔ طُریفہ بن حاجز کے نام

خلیفہ ہو کر حضرت ابوبکرؓ نے طُریفہ بن حاجز کو بنو سُلیم کے ان عربوں پر جو اسلام پر قائم تھے، والی بنا دیا تھا، یہ مخلص اور جوشیلے کارکن تھے، انھوں نے ایسی مؤثر تقریریں کیں کہ بنو سُلیم[1] کے بہت سے عرب ان سے آملے اور مرتد عرب الگ ہو کر رہ زنی کرنے لگے۔ کبھی طُریفہ اپنے مسلمان ساتھیوں کے ساتھ ان مرتد عربوں پر حملے کرتے اور کبھی یہ مرتد عرب، مسلمانوں پر۔ لوٹ مار کا یہ ڈرامہ جاری تھا کہ بنو سُلیم کا ایک ڈاکو جس کا نام ایاس تھا حضرت ابوبکرؓ کے پاس آیا، چوں کہ یہ اچانک مسافروں اور بستیوں پر حملہ کر کے لوٹا کرتا، اس کا نام فُجاءہ پڑ گیا تھا۔ جب مرتد عربوں کے خلاف فوجیں بھیجی گئیں اور کئی جگہ ان کی سخت گوش مالی ہوئی تو فُجاءہ کو ایک چال سوجھی۔ اس نے اپنے ساتھی نجبہ بن ابی میثاء سے جو اس کی طرح ڈاکو تھا، کہا: میں مسلمان تو ہونے سے رہا، اور یہ جانتا ہوں کہ مسلمانوں کے ہاتھ سے مجھے مرنا ہے، مرنے سے پہلے کیوں ایسے کارنامے نہ کر جاؤں جن سے خالدؓ اور ابوبکرؓ دونوں کے دل ہل جائیں! وہ مدینہ گیا اور خلیفہ سے کہا: "میں رسول اللہ کے ہاتھ پر مسلمان ہوا، ملکِ عرب کی ہر جگہ اور ہر شخص سے واقف ہوں، اسلام سے پہلے قبیلوں میں لوٹ مار اور غارت گری کرتا تھا، بہت سے صحرائی قبیلے میری نظر میں ہیں جو اسلام سے منحرف ہو گئے ہیں اور آپ یا آپ کا کوئی جنرل ان سے واقف نہیں ہے۔ میں ان سب کو مسلمان

---

[1] مدینہ کے مشرق سے لے کر وادی القریٰ اور خیبر (شمال مدینہ) تک بنو سلیم کی بستیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ جزیرۃ العرب ہمدانی صد ۱۳۱

کرسکتا ہوں، اور اگر وہ اسلام نہ لائیں تو ان کی گردن مار سکتا ہوں۔ وہ سارے مرتد جن تک خالد کی رسائی نہ ہو، پکڑ لوں گا اور تلوار کا لقمہ بنا دوں گا، شاید اس طرح میرے گناہوں کا کچھ کفارہ ہو سکے۔ لیکن میری حالت ان دنوں خراب ہے، نہ میرے پاس روپیہ پیسہ نہ سواری، اور نہ سامانِ جنگ، آپ مدد کیجئے۔ ابو بکر نے اس کو دو گھوڑے دئے (تیس اونٹ اور تیس سپاہیوں کے ہتیار۔ (الکتفار، صـ ۲۳۳) اور دس مسلمان چارہ اور ہتیاروں سے مسلح اس کے ساتھ کر دئیے فجاءہ اپنے قبیلے کی طرف چلا اور راستہ میں مرتد عربوں کو اپنے ساتھ ملاتا رہا، جب اس کی بیعت بڑھ گئی تو اس نے پہلے اپنے مسلمان ساتھیوں کو قتل کیا اور ان کا سب سامان لوٹ لیا، پھر اس نے غارت گری شروع کر دی، کبھی اس قبیلہ پر چھاپے مارتا، کبھی اُس قبیلہ پر۔ مسلمانوں کی ایک پارٹی مدینہ جا رہی تھی، ان کو لوٹ کر مار ڈالا۔ جب حضرت ابو بکر کو ان حادثوں کا علم ہوا تو انھوں نے بنو سُلیم میں اپنے نمایندہ طُرَیفہ کو یہ خط لکھا:۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ ابو بکر خلیفہ رسول اللہ کی طرف سے طُرَیفہ بن حاجز کو سلام علیک۔ تم کو معلوم ہو کہ دشمنِ خدا فُجاءہ میرے پاس آیا، اور مسلمان ہونے کا دعویٰ کیا، پھر مجھ سے درخواست کی کہ اسلام سے منحرف عربوں کی سرکوبی کے لئے اس کو ضروری سامان دوں، میں نے اُس کی مدد کی اور ضروری سامان فراہم کیا۔ اب مجھے پکی خبر ملی ہے کہ دشمنِ خدا کیا مسلمان کیا کافر سب کا سامان لوٹ لیا ہے اور جو اس کی بات نہیں مانتے انھیں تلوار کے گھاٹ اُتار دیتا ہے، میری رائے ہے کہ تم اپنے مسلمان ساتھیوں کو لے کر اس کی سرکوبی کو جاؤ، اور اس کو قتل کر دو، یا بیڑیاں ڈال کر میرے پاس لے آؤ" سیاق سباق کا بیشتر حصہ از ناسخ التواریخ ۲/ قسم ثانی /۷۷، ابن اسحاق طَبَری ۳/۲۳۴، الکتفار مخطوطہ دار الکتب قاہرہ صـ ۲۳۳

۲۔ محاذِ یمن

۹۔ طاہر بن ابی ہالہ کے نام

یمن کے مغرب اور جنوب میں بحرِ قلزم کے ساحل پر نشیبی اراضی کی ایک پٹی ہے جسے تہامہ کہتے ہیں اس اراضی میں بہت سی نیچی لیکن تہ بہ تہ پہاڑیاں پائی جاتی ہیں، تہامہ کی شمالی حد مکہ کے قریب پہنچتی تھی اور جنوبی، یمن کے پایۂ تخت صنعاء سے کوئی دو[۲] میل کے فاصلہ پر ختم ہوتی تھی (مسالک الممالک، اصطخری لیدن ص۱۴) تہامہ[۱] یمن کا ایک ضلع تھا جس میں بہت سے گاؤں اور قصبے تھے۔ بادشاہ یمن باذام کی وفات پر سنہ ۱۰ھ میں رسول اللہ نے جب یمن کو سات حصوں میں بانٹ کر عامل مقرر کئے تو تہامہ پر طاہر بن ابی ہالہ کو مامور فرمایا۔ تہامہ میں ادنی درجہ کے عربوں کے علاوہ دو[۲] بڑے اور اہم قبیلے تھے، ایک عک اور دوسرے اشعر، تہامہ سے ہوکر بحر قلزم کے ساتھ ساتھ مکہ سے عدن کو ایک تجارتی شاہراہ بھی جاتی تھی۔

مورخ طبری نے لکھا ہے کہ رسول اللہ کی وفات پر اسلام سے بغاوت کا جھنڈا سب سے پہلے عک اور اشعری قبیلوں کے غنڈوں نے بلند کیا۔ رسول اللہ کی وفات کی خبر پاکر ان قبیلوں کے بہت سے فاقہ مست اور شری عناصر مقامی عامل (طاہر) سے باغی ہوکر ساحل سے گذرنے والی سڑک پر رہ زنی کے ارادہ سے جمع ہوگئے۔ آس پاس کے بہت سے آوارہ بھی ان سے آملے، طاہر نے مرکز کو مطلع کرتے ہوئے لکھا کہ میں ایک فوج لے کر جس میں عک کا رئیس بھی شامل ہے، ان غنڈوں کی خبر لینے جارہا ہوں، جس سرزمین میں باغی جمع ہوئے تھے اس کا نام اعلاب تھا، اسی سرزمین سے ہوکر ساحلی شاہ راہ گذرتی تھی[۲]، باغیوں کے پاس نہ کافی ہتھیار تھے اور نہ ان کے سر پر ڈھنگ کا کوئی قائد تھا، لڑائی ہوئی تو بڑی تعداد میں یہ مارے گئے، شاہراہ دور تک

---

۱ دیکھئے نقشہ ۲ ایضاً

ان کی لاشوں سے پٹ گئی، اس فتح کی خبر ابھی مدینہ نہ پہنچی تھی کہ ابوبکر کا یہ خط طاہر کے اُس مراسلہ کے جواب میں موصول ہوا جو انھوں نے جنگ پر جاتے وقت لکھا تھا:-

"تمہارا خط ملا، جس میں تم نے فوجی پیش قدمی کی خبر دی ہے اور لکھا ہے کہ عَکّ کے رئیس مسروق اور ان کی قوم کو ساتھ لے کر غنڈوں کی سرکوبی کرنے اَعلاب جا رہے ہو تم نے بالکل صحیح قدم اُٹھایا، گوشمالی میں ذرا دیر نہ کرنا، اور غنڈوں کے ساتھ نرمی سے پیش نہ آنا، سرزمینِ اعلاب میں اس وقت تک ٹھہرے رہو جب تک شاہراہ غنڈوں کے خطرہ سے پاک نہ ہو جائے، اور میں نئی ہدایات نہ بھیج دوں" (طَبَری ۳/۲۶۵)

۱۰ یمن کے حِمیَری رئیسوں کے نام

اس خط کو سمجھنے کے لئے حضرت ابوبکر اور اُن سے پہلے رسول اللہ کے عہد میں یمن کے سیاسی تقلبات کا سمجھنا ضروری ہے۔ ہجرت سے کوئی ۷ برس پہلے یمن پر فارسیوں کا تسلط ہو گیا تھا، رسول اللہ کے زمانہ میں یمن کا بادشاہ باذام تھا، صنعار کا معتدل کوہستانی شہر اس کا پایۂ تخت تھا، رسول اللہ نے اس کو اسلام کی دعوت دی، وہ مسلمان ہو گیا، رسول اللہ نے اس کی حکومت بحال رکھی۔ سنہ ۹ھ کے خاتمہ پر اس کا انتقال ہوا، حجۃ الوداع (سنہ ۱۰ھ) سے فارغ ہو کر رسول اللہ نے یمن کے قلمرو میں اپنی طرف سے محصل زکاۃ مقرر کئے، سارے یمن کو سات حصوں میں بانٹا اور ہر حصہ پر ایک عامل مقرر کیا: نجران[1] پر عمرو بن حزم، نجران۔ رِمَع۔ زَبید کے درمیانی علاقہ پر خالد بن سعید بن عاص، ہمدان کے قبیلوں پر عامر بن شہر، صنعار اور اس کے مضافات پر شہر بن باذام، تہامہ یمن کے عک اور اشعری قبائل پر طاہر بن ابی ہالہ، مارب کے دیہاتوں پر ابو موسیٰ اشعری، جَنَد کے ضلعوں پر یعلیٰ بن مُنیہ، معاذ بن جبل آٹھویں عامل تھے، لیکن ان کی حیثیت منتظم یا محصل زکاۃ کی نہ تھی، بلکہ

[1] ملاحظہ ہو نقشہ ۱۰

وہ سارے یمن میں گشت کر کے قرآن اور قانونِ اسلام کی تعلیم دیتے تھے۔ اس وقت یمن میں ایک بڑا ہوشیار کاہن اسود عنسی تھا جس کا سلسلۂ نسب یمن کے قدیم مورث سبا سے ملتا تھا، رسول اللہ کی نبوت کو کامیاب دیکھ کر اس کے دل میں بھی نبی ہونے اور حکومت کرنے کا داعیہ پیدا ہوا، باذام کی زندگی میں اس کی دال نہ گلی، کیوں کہ باذام کی گرفت سارے یمن پر سخت تھی، اس کی وفات پر جب یمن کو چھوٹے چھوٹے سات انتظامی حلقوں میں بانٹ دیا گیا تو اسود نے اپنی خواہش پورا کرنے کے لئے میدان صاف پایا، نبوت کا دعویٰ کر دیا، اس کا قبیلہ پہلے ہی اس کے ساتھ تھا، دوسرے لوگوں نے بھی اس کو دعوت پر لبیک کہا اور آندھی کی طرح اس کی تحریک سارے یمن میں پھیل گئی، اس وقت یمن میں دو اہم طبقے تھے: ایک اصلی باشندے جن کا تعلق صبا اور حمیر کے خاندان سے تھا، اور دوسرے فارسی آباء و اجداد کی نسل جن کو ابناء کہتے تھے، یہ اس وقت یمن کی سب سے مقتدر اقلیت تھے۔ ایک عرصے سے چوں کہ یمن کا حاکم ہجردی حکومت کا ماتحت تھا، اس لئے حکومت کے اکثر عہدے اور منافع ابناء کو حاصل تھے، اس وقت ابناء کے تین لیڈر تھے: شہر بن باذام، فیروز دیلمی، اور داذویہ، اور یہ تینوں مسلمان ہو چکے تھے، انھوں نے اسود کا مقابلہ کیا، پر چوں کہ یمن کے بیشتر رئیس اسود کے ساتھ تھے ابناء کمزور پڑ گئے، پچیس دن کی قلیل مدت میں اسود نے شہر بن باذام (حاکم صنعاء) کو قتل کر کے یمن کے پایۂ تخت اور سب سے بڑے شہر پر قبضہ کر لیا۔ حکمت سے کام لے کر اور مراعاۃ دے کر اس نے ابناء اور ان کے لیڈروں کو بھی توڑ لیا، تہامہ یمن کو چھوڑ کر یمن کے کل قلمرو پر اسود کا پرچم لہرانے لگا۔ رسول اللہ کے عامل یا تو تہامۂ یمن بھاگ گئے، یا حضرموت جا کر پناہ لی، یا مدینہ لوٹ آئے، رسول اللہ کو جوں ہی حالات کا علم ہوا انھوں نے اسود کو مراسلہ بھیجا جس کا کوئی اثر نہ ہوا، انھوں نے ابناء کے لیڈروں اور یمن کے دوسرے رئیسوں کو بھی مراسلے بھیجے اور ان کو اسود کا مقابلہ کرنے پر ابھارا ان رئیسوں میں یہ حمیری رئیس قابل ذکر ہیں: عامر بن شہر، سعید بن عاقب، سُمیفع بن ناکور، حوشب اور شہر۔ انھوں نے رسول اللہ کا فرمان مانا، اسلام پر قائم رہے اور مسلمانوں کی مدد

کے لئے مستعد ہو گئے۔

حکومت و اقتدار پا کر اسود عنسی کی تمکنت ایسی بڑھی کہ اپنے کمانڈران چیف قیس بن عبد یغوث (مکشوح مرادی) اور ابناء کے لیڈروں فیروز اور ذاذویہ کے ساتھ حقارت آمیز برتاؤ کرنے لگا، ان کو اسود سے بغاوت کے لئے سہارے کی ضرورت تھی، وہ رسول اللہ کے خط سے مل گیا۔ یہ تینوں اور ان کے پیرو پھر اسلام کے وفادار ہو گئے اور سازش کر کے اسود کو اس کے محل میں قتل کر دیا۔ اسود کی حکومت تین چار ماہ سے زیادہ نہ چلی۔ اس کے قتل سے صنعاء اور جند کے ضلعوں پر پھر اسلام کا تسلط ہو گیا، لیکن اس کے بہت سے فوجی لیڈر باغی رہے، کچھ صنعاء اور نجران کے درمیانی علاقہ میں ترکتازی کرتے رہے اور کچھ اپنے اپنے قبیلوں میں خود مختاری کا دم بھرتے رہے۔ اسود کے قتل کی خبر جس رات رسول اللہ کو پہنچی اس کی صبح کو ان کی مشعل زندگی بجھ گئی اور ایک خبر یہ ہے کہ قتل کی خبر ان کی وفات کے دس بارہ دن بعد مدینہ پہنچی جب حضرت ابوبکر خلیفہ ہو چکے تھے۔

رسول اللہ کی وفات کا جب یمن میں چرچا ہوا تو سدھرتے حالات پھر خراب ہو گئے، قیس بن عبد یغوث جو فیروز اور ذاذویہ کو ملا کر اسود سے باغی ہو گیا تھا اور جس نے ان کے تعاون سے اسود کو قتل کیا تھا اب پھر اسلام یا مدینہ کی وفاداری سے باغی ہو گیا۔ لایق اور اولوالعزم آدمی تھا، قومی عصبیت کے نشہ میں سرشار، یمن میں فارسیوں کا اقتدار اس کو سدا سے کھٹکتا رہا تھا، اس کے خاتمہ کے بعد وہ ابناء کی خوش حالی اور ان کی اجتماعی و اقتصادی برتری کو خاک میں ملانا چاہتا تھا، ایک کامیاب فوجی لیڈر وہ پہلے ہی سے تھا، اس نے اسود کے فوجی لیڈروں سے سازباز کی اور ابناء کو ملک سے نکالنے کا منصوبہ بنا لیا، فیروز اور ذاذویہ دونوں سے اس نے تعلقات خراب کر لئے، ذاذویہ کو دھوکہ دے کر قتل کر دیا، فیروز قتل ہوتے ہوتے بچ گئے، فیروز نے حضرت ابوبکر کو اپنی اور ابناء کی وفاداری سے مطلع کر کے درخواست کی کہ ہماری مدد کیجئے ہم اسلام کے لئے ہر قربانی کرنے کو تیار ہیں۔ ابوبکر کے پاس اس وقت نہ کافی فوج تھی، نہ سامان

جنگ، خود مدینہ کو کئی طرف سے دشمن گھیرے ہوئے تھے، وہ اسامہ بن زید کی شام سے واپسی کے منتظر تھے، فوج اور سامان کی فراہمی تک وہ ترغیب وترہیب کے خطوں سے کام چلاتے رہے۔

آپ نے ابھی اوپر پڑھا کہ اسود کے یمن پر تسلط کے بعد رسول اللہ نے جن لوگوں کو اسلام کا وفادار رہنے اور اسود کی مخالفت کرنے کے خطوط لکھے تھے ان میں چند حمیری رئیس بھی تھے، انھوں نے رسول اللہ کی بات مانی تھی، اسود سے الگ رہے تھے اور اسلام کی وفاداری پر قائم تھے۔ فیروز کی درخواست پاکر حضرت ابوبکر کی نظر ان رئیسوں پر پڑی، اور انھوں نے یہ مراسلہ ان کے نام بھیجا:۔

"ابوبکر خلیفہ رسول اللہ کی طرف سے عُمیر بن افلح ذی مران، سعید بن عاقب ذی زود، سَمیفع بن ناکور ذی کلاع، حوشب ذی ظُلَیم، اور شہر ذی یناف کے نام، "جو لوگ اَبنار کے درپئے آزار ہیں اور ان سے لڑنا چاہتے ہیں، آپ ان کے خلاف اَبناء کی مدد کیجیے، آپ ابنار کو اپنی حفاظت میں لے لیجیے، فیروز کی بات مانیے اور ان کے مشورہ پر عمل کیجیے، اس کے ساتھ ہوکر باغیوں سے جہاد کیجیے، میں نے فیروز کو جنگ کا سالار اعلیٰ مقرر کر دیا ہے" (سیف - طبری ۲۱۸ - ۲۶۶)

۳ - محاذ حضرموت[1]

۱۱۔ زیاد بن لبید انصاری کے نام

یہ خط اکتفاء سے ماخوذ ہے، عربی وفارسی کی دوسری پیش نظر کتابوں میں اس کا ذکر

---

[1] دیکھئے نقشہ

نہیں ہے البتہ یاقوت نے اپنی معجم البلدان اور بلاذری نے اپنی فتوح میں بعض شیوخِ یمن کی سند پر تصریح کی ہے کہ حضرت ابوبکر نے خلیفہ ہوکر، حضر موت کے عامل (محصل زکاۃ) کو مراسلہ بھیجا تھا جس میں رسول اللہ کی وفات کی خبر دی تھی اور زیاد کو ہدایت کی تھی کہ حضر موت کے قبائل (حمیر اور بنو کندہ) سے ان کے لئے بیعت لیں (معجم البلدان مصر ۳/۲۹۳، فتوح البلدان، مصر، ص ۱۰۹) بالفاظ دیگر معجم یاقوت اور فتوح بلاذری میں صرف خط کے مضمون کی طرف اشارہ ہے، الکتفاء نے خط کا متن بھی دیا ہے اور ان الفاظ میں اس کا سیاق وسباق بیان کیا ہے: جب قبائل کندہ کا وفد ان کے مشرف باسلام ہونے کی خبر دینے رسول اللہ کے پاس آیا (سنہ ۹ھ میں) تو انھوں نے زیاد بن لبید انصاری بیاضی کو بنو کندہ پر عامل مقرر کیا، اور ان کو وفد کے ساتھ بھیج دیا، جب تک رسول اللہ زندہ رہے، زیاد بنو کندہ کی بستیوں سے زکاۃ وصول کرتے رہے، وہ سخت گیر حاکم تھے، جب رسول اللہ کا انتقال ہوگیا اور ابوبکر خلیفہ ہوئے تو انھوں نے ابوہند مولی ابن بیاضہ کے ہاتھ زیاد کو یہ مراسلہ بھیجا:۔

"بسم اللہ الرحمن الرحیم، رسول اللہ کے خلیفہ ابوبکر کی طرف سے زیاد بن لبید کو سلام علیک، میں اس معبود کا سپاس گذار ہوں جس کے سوا کوئی دوسرا عبادت کے لائق نہیں، واضح ہو کہ نبی کا انتقال ہوگیا، فانا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس علم کے ساتھ کہ ہر کام کی سر براہ کاری خدا کی توفیق اور مدد پر منحصر ہے، تمھیں ہدایت کی جاتی ہے کہ کمر ہمت باندھ کر اپنے شایانِ شان کام کر دکھاؤ، اور تمھاری عملداری میں جو لوگ ہوں ان سے (میرے لئے) بیعت لے لو، جو بیعت سے انکار کرے تلوار سے اس کی خبر لو، اور مطیع کی مدد سے نافرمان کا مقابلہ کرو، اس میں مطلق شبہ نہیں کہ اللہ اپنے دین کو سارے دینوں پر غالب کرے گا، مشرکوں کو چاہے یہ بات کتنی ہی ناپسند ہو۔ (فان اللہ مظہر دینہ علی

الدِّینِ کُلِّہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْمُشْرِکُوْنَ - قرآن) اکتفاء ص ۲۶۹)

۱۲- اشعث ابن قیس کے نام

پیشِ نظر کتابوں میں حضرت موت کے قبائل کندہ کی بغاوت اور ان سے لڑائی کا سب سے زیادہ مربوط و مسلسل ذکر اعثم کوفی کی فتوح اور محمد تقی کی ناسخ التواریخ میں ملتا ہے۔ اشعث حضرت موت کے ان قدیم بادشاہوں کی اولاد سے تھے جن کا اقتدار کسی زمانہ میں یمن اور حجاز تک پھیلا ہوا تھا، پے در پے انقلابوں سے ان کی حکومت سکڑتی گئی۔ حتیٰ کہ ظہورِ اسلام کے وقت اس کا دائرہ بہت سے چھوٹے بڑے کندی قبائل تک محدود ہو کر رہ گیا تھا، ہمدانی نے صفتہ جزیرۃ العرب میں لکھا ہے (ص ۸۵) کہ اسلام سے بہت پہلے جب کندہ کے قبیلے بحرین، اور مُشقّر سے جلاوطن ہو کر حضرت موت میں آباد ہوئے تو ان کی تعداد تیس ہزار سے اوپر تھی، ردّہ کے وقت یقیناً ان کی تعداد اس سے بہت زیادہ ہوگی۔ کندہ کے قبیلوں کے الگ الگ مقامی سردار تھے جن کا سلسلہ نسب گذرے ہوئے کندی بادشاہوں سے ملتا تھا، اشعث کو ان سب پر تفوق حاصل تھا، اُن کا دائرہ نفوذ سب سے زیادہ وسیع تھا مغربی حضرموت میں بہت سی پہاڑی وادیاں، گاؤں اور قصبے تھے جہاں کندہ کے قبیلے آباد تھے یہاں کھجور کی فراوانی تھی، گنا اور بعض غلوں کی کاشت ہوتی تھی اور چارہ کی بھی کمی نہ تھی۔ اہم مقامات پر قلعے بنائے گئے تھے، ان میں بعض پہاڑوں پر تھے، اور بعض محفوظ وادیوں میں سنہ ھ میں رسول اللہ کی دعوت پر اشعث اور کندی قبائل مسلمان ہوئے اور جیسا کہ آپ نے اوپر پڑھا۔ رسول اللہ نے زیاد بن لبید انصاری کو قبائل کندہ میں اپنا نمایندہ محصل زکوٰۃ بنا کر بھیجا تھا۔ زیاد سخت گیر حاکم تھے۔ ان کی سخت گیری کا ایک واقعہ ہمارے مورخوں نے بیان بھی کیا ہے۔ اس واقعہ سے سارے حضرموت میں شورش پیدا ہوگئی اور اسلام کے مفاد کو نقصان پہنچا، بہ ہزار خرابی اور خوں ریزی حالات قابو میں

آئے جیسا کہ آپ ابھی پڑھیں گے۔ حضرت ابوبکرؓ کا مذکورہ بالا خط پاکر جب زیاد نے قبائل کندہ سے نئے خلیفہ کی بیعت کو کہا تو ان کے بڑے سردار اشعث بن قیس کو متذبذب پایا، انھوں نے کہا جب سب عرب قبیلے ابوبکرؓ کو خلیفہ مان لیں گے تب میں اور میرے قبیلے بھی ایسا کریں گے، ان کو یہ باور کرنے میں سخت تامل تھا کہ بنو ہاشم ایک مُرّی کی خلافت تسلیم کرلیں گے۔ ابوبکرؓ کا تعلق قبیلہ مُرّہ سے تھا جس کو عربوں کی اجتماعی یا سیاسی زندگی میں کوئی خاص امتیاز حاصل نہ تھا۔ چونکہ اشعث کے خاندان میں حکومت موروثی رہی تھی، اس لئے ان کا اعتقاد تھا کہ خلافت کو بھی موروثی ہونا چاہئے اور اس اعتقاد کے بموجب وہ چاہتے تھے کہ خلیفہ ابوبکرؓ کو نہیں بلکہ رسول اللہ کے کسی قریبی عزیز کو ہونا چاہئے۔ اشعث کی رائے یہ تھی، لیکن ان کے چچازاد بھائی امرا القیس بن عباسؓ کی جو خود ایک ذی اثر کندی سردار تھے، رائے تھی کہ ابوبکرؓ کی خلافت کو تسلیم کیا جائے اور جو فیصلہ مدینہ کے ارباب دانش نے کیا ہے اس کا احترام کیا جائے۔ انھوں نے اشعث کو سمجھایا بجھایا پر وہ نہ مانے اور کہا: محمد کا انتقال ہوچکا، عربوں نے اپنے آبائی بتوں کو پوجنا شروع کردیا، ہم یہاں عربوں سے بالکل الگ تھلگ ہیں، ابوبکرؓ کے لشکر کی ہم تک رسائی نہیں ہوگی" ابن عباسؓ نے ان باتوں کی نہایت معقول تردید کی، لیکن اشعث اپنے موقف سے نہیں ہٹے۔ قبائل کندہ میں دو گروہ ہوگئے، ایک اشعث کا ہم خیال اور دوسرا ابن عباسؓ کا، بایں ہمہ اسلام کی کھلی مخالفت کسی نے نہیں کی۔ کچھ دن بعد زیاد بن لبید نے زکوٰۃ وصول کرنے کی مہم شروع کی، زکوٰۃ زیادہ تر اونٹوں کی شکل میں دی جاتی تھی، زیاد اپنے عملے کے ساتھ گاؤں گاؤں جاتے اور زکوٰۃ وصول کرتے، کہیں نرمی سے کام چل جاتا، کہیں ترشی وسختی استعمال کرنا پڑتی۔ ایک دن کی بات ہے کہ زیاد کے عملے نے کسی کندی جوان کا ایک اونٹ جس پر وہ جوان شیفتہ تھا دغوا کر سرکاری گلہ میں داخل کردیا۔ جوان نے کہا یہ اونٹ مجھے بہت عزیز ہے، اس کو واپس کردو، میں دوسرا دے دوں گا، زیاد نے کہا اونٹ

نہیں واپس ہوگا، اس پر سرکاری مہر لگ چکی ہے۔ جوان نے جاکر اپنے قبیلہ کے سردار سے شکایت کی اور اس کو سفارش کرنے زیاد کے پاس لایا، زیاد نے سفارش نہیں مانی، سردار کو زیاد کی سختی بہت ناگوار ہوئی، وہ غصہ میں بھر کر سرکاری گلہ میں گھس گیا اور جوان سے کہا اپنا اونٹ کھول لو، اگر کوئی تمہیں روکے گا تو اس تلوار سے اس کا سر پُر غرور اتار لوں گا، جب تک رسول اللہ زندہ تھے۔ ان کے فرمان کی تعمیل میں زیاد کے تابعدار رہے، اب اگر رسول اللہ کے خاندان کا کوئی شخص خلیفہ ہوگا تو اس کی بھی تابعداری کریں گے، ابو قحافہ کے لڑکے کا ہم پر حکم نہیں چل سکتا۔ اسی موضوع پر اس نے کچھ شعر بھی موزوں کئے اور زیاد کو بھیجے۔ اعثم کے راوی کہتے ہیں کہ ان اشعار کا زیاد پر بہت برا اثر ہوا، انھوں نے محسوس کیا کہ ان کا اشعث کی عمل داری میں رہنا سخت خطرناک ہے، چناں چہ انھوں نے زکوٰۃ کے اونٹ لئے اور اپنی چھوٹی سی جمعیت کے ساتھ مدینہ کی راہ لی۔ دو منزل چل کر انھوں نے چند شعر بھیجے جس میں بنو کندہ کو عبرت ناک سزا دینے کی دھمکی تھی، ان اشعار کا جب چرچا ہوا تو کندی قبائل میں اشتعال کی لہر دوڑ گئی، اشعث اور دوسرے لیڈروں نے احتجاجی تقریریں کیں جن کا ماحصل یہ تھا کہ ابوبکرؓ کی خلافت سے یہ دلی بڑھ گئی، اور قبیلے دفاعی تیاری میں مشغول ہو گئے۔ زیاد نے فوجی کمزوری کے پیش نظر اپنا مرکز چھوڑا تھا اور یہ بنو کندہ کے اس علاقہ میں تھا جہاں اشعث کی ریاست تھی، انھوں نے زکاۃ کے اونٹ مدینہ روانہ کئے اور خود اسی عزم سے رک گئے کہ اگر آس پاس کے قبیلوں نے ان کی مدد کی تو وہ ان کو ساتھ لے کر اپنے مرکز لوٹ جائیں گے اور حالات کا مقابلہ کریں گے، چناں چہ وہ کندہ کی شاخ بنو ذہل میں پہنچے اور ان سے اشعث کی شکایت کی، لیکن یہ لوگ اشعث کے ہم خیال نکلے، زیاد کی مطلق مدد نہ کی، اور ان کو نکال دیا، زیاد نے اب کندہ کی ایک دوسری شاخ کی طرف رجوع کیا، اور ان کو ابوبکرؓ کی بیعت کی دعوت دی، پھر وہاں بھی ناکامی ہوئی۔ یہی نہیں بلکہ وہ کندہ کی جس جس شاخ میں گئے ان کو مایوس ہونا پڑا، مجبور

ہوکر وہ مدینہ چلے گئے اور خلیفہ سے سب حالات بیان کئے۔ حضرت ابوبکرؓ کو تفصیلات سن کر بڑا ملال ہوا، انھوں نے چار ہزار فوج زیاد کے ساتھ کی اور بنو کندہ کے سرکشوں کی گوشمالی کے لئے بھیجا۔ اس لشکر جرّار کی خبر بنو کندہ کو ہوئی تو وہ گھبرا گئے، اشعث کی ریاست میں روز جلسے اور تقریریں ہونے لگیں۔ سمجھ دار لوگ اطاعت اور ترک مخالفت کی رائے دیتے اور شری طبیعتیں تمردکی، خود اشعث کا رجحان اطاعت کی طرف تھا۔ زیاد نے غیر معمولی جوش سے گوشمالی کی مہم شروع کردی، جو کندی گاؤں بیعت یا اطاعت سے انکار کرتا یا تردد ظاہر کرتا، ان سے لڑتے اور ان کی عورتوں، بچّوں کو غلام بنا لیتے، اور گاؤں لوٹ لیتے، کندہ کے متعدد دور افتادہ قبائل جن کے نام اعثم کی فتوح میں مذکور ہیں، عبرت ناک سزائیں دیں۔

زیاد اشعث کی ریاست میں داخل ہوگئے، اشعث ان کندی قبائل کی تباہی پر خار کھائے بیٹھے تھے جن کو زیاد تباہ کرکے آئے تھے، اب مصیبت خود ان کے سر پر آن پڑی، انھوں نے جنگی تیاری شروع کردی اور جتنے کندی سرداران کے ہم خیال تھے (اور ان کی تعداد اس وقت زیادہ نہ تھی) وہ حسب استطاعت فوج لے کر آگئے، اشعث کے پاس ایک ہزار سوار جمع ہوگئے۔ زیاد کی جمعیت چار ہزار سے زیادہ تھی، بڑے دو کندی قبیلے سکاسک اور جُون زیاد کی خون بار تلوار سے ڈر کر سر تسلیم خم کر چکے تھے اور ان کے پانچ سو جوان اسلامی فوج میں حاضر تھے۔ حضرت موت کے تریمؔ[1] نامی شہر میں زیاد کا اشعث سے مقابلہ ہوا، اشعث

---

[1] فتوح اعثم اور ناسخ التواریخ دونوں نے بریم لکھا ہے۔ جغرافیہ کی کتابوں میں حضر موت یا یمن میں اس نام کے کسی شہر یا قصبہ کا ذکر نہیں ہے۔ غالباً بریم تریم کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ حضر موت کے دو صدر مقام تھے، ایک تریم اور دوسرا شبام، یہ دونوں شہر اب تک موجود ہیں" دیکھئے معجم یاقوت مصر ۲/ ۳۸۵ اور ۳/ ۲۹۳، نیز اصطخری ص۲۸، حضر موت ایک پہاڑی علاقہ ہے جس کو ایک بڑی وادی مغرب سے مشرق کی طرف چیرتی ہوئی جاتی ہے اور پھر جنوب کی طرف مڑ کر ساحل سے مل جاتی ہے۔ اس بڑی وادی سے بہت سی چھوٹی وادیاں پھوٹتی ہیں جیسے تنے سے شاخیں، تریم اس بڑی وادی کے بائیں کنارہ حضر موت کے شمال میں واقع تھا اور اب تک موجود ہے... اقتباس از مقالہ جے ٹرائٹن ذکر تریم انسائکلوپیڈیا آف اسلام ۴/ ۶۷۳ و مقالہ جے شلیفر ذکر حضر موت انسائکلوپیڈیا آف اسلام ۲/ ۲۰۷

کی چھوٹی سی فوج میں ایسا سچا جوش تھا، اور خود اشعث نے ایسی لیاقت سے قیادت کی کہ زیاد کی فوج کے چھکے چھڑا دیئے، تین سو مسلمان شہید ہوئے، باقی بھاگ گئے اور تریم کے نزدیک ایک قلعہ میں پناہ لی، مسلمانوں کے کیمپ میں جو سامان اور غلام تھے اشعث نے ان پر قبضہ کرلیا اور ان قبائل کو واپس کر دیا جہاں سے سامان لوٹا گیا تھا اور یہ غلام پکڑے گئے تھے، اشعث نے قلعہ کو آنے جانے والے سارے راستوں پر کڑا پہرہ بٹھا دیا، زیاد کے آدمی اور جانور بھوکوں مرنے لگے، بہ ہزار مشکل زیاد نے مہاجر بن امیہ کو (جو اس وقت صنعاء یا مارب کے آس پاس تھے) خط بھیجا جس میں فوری امداد طلب کی گئی تھی۔ مہاجر دھاوے مارتے آئے، اشعث نے ان سے کچھ تعرض نہ کیا اور اپنی فوج دور ہٹا کر مہاجر کو قلعہ میں داخل ہونے دیا، اس کے بعد پھر محاصرہ کرلیا۔ اشعث کے سفیر سارے حضرموت میں دورے کرتے اور کندیوں کو جنگ میں شرکت کی دعوت دیتے، چند ہفتوں میں اشعث کے پاس کافی رسد آگئی جس کا بڑا حصہ ارقم، بنو حجر، بنو عمرو اور بنو ہند کے جوانوں پر مشتمل تھا، مدینہ سے لوٹ کر ان قبیلوں پر زیاد نے سخت مار لگائی تھی، محصور مسلمان بڑی ضیق میں تھے، نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔ غذائی صورت حال سخت نازک تھی، باہر نکلنا تباہی کو دعوت دینا تھا، ہزار تدبیروں سے زیاد نے حضرت ابوبکر کو کیفیت احوال سے مطلع کیا۔ شاید خلیفہ نے اس وقت محسوس کیا کہ قبائل کندہ کے معاملہ میں اتنی سخت گیری نامناسب تھی جتنی کی گئی، تدبیر سے ان کی تمکنت بہ فتح پائی جاسکتی تھی، چناں چہ انھوں نے اشعث اور ان کے ہم خیال دوسرے کندی سرداروں کے نام ایک مراسلہ بھیجا جس میں تالیف قلب کی پوری کوشش کی گئی تھی، اعثم نے فتوح میں لکھا ہے کہ یہ مراسلہ ان الفاظ پر ختم ہوتا تھا:

"میں تمہیں اسلام پر ثابت قدم رہنے کی نصیحت کرتا ہوں، دشمن دین شیطان کے دھوکے میں نہ آؤ، اگر تمہارے انحراف کا سبب زیاد کا (سخت) طرز عمل ہو تو میں ان کو معزول کر کے تم پر ایسا عامل مقرر کروں گا جو تمہارے ساتھ اچھا برتاؤ

کرے گا۔ میں نے اپنے ایلچی سے کہدیا ہے کہ اگر وہ تمہیں اطاعت و فرمانبرداری کے لئے تیار پائے تو زیاد کو میرے پاس بھیج دے، تم اپنے کئے پر نادم ہو اور توبہ کرو کہ آیندہ ایسے کام نہیں کروگے۔"

اس عبارت کو ناسخ التواریخ نے کل خط قرار دیا ہے، حمزہ نہیں، جیسا کہ اعثم کی فتوح میں ہے۔ طبری، الکتفاء، فتوح البلدان، اخبار الطوال وغیرہ دوسری قدیم تاریخوں میں نہ تو یہ خط نقل ہوا ہے اور نہ کندہ کی بغاوت کا حال اس تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

۱۳۔ عکرمہ بن ابی جہل کے نام

مذکورہ بالا خط پڑھ کر اشعث نے ایلچی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ہم نے ابو قحافہ کے لڑکے کو خلیفہ ماننے میں ذرا دیر کی تو ہمیں کافر سمجھ لیا اور زیاد بن لبید کو حکم دیا کہ میرے چچازاد بھائیوں (یعنی دوسرے کندی رئیسوں کو) جو مسلمان ہیں کفر کی تہمت میں گردن مار دے۔ ایلچی نے جس کا نام ناسخ التواریخ میں مسلم بن عبداللہ بتایا گیا ہے، اشعث کی تردید کرتے ہوئے کہا: جب مہاجر و انصار نے باتفاق رائے ابوبکر کو خلیفہ مان لیا اور پھر بھی تمہارے چچازاد بھائیوں نے ان کو خلیفہ نہیں مانا، تو بلاشبہ وہ کافر ہوگئے"۔ ابھی مسلم نے بات ختم بھی نہ کی تھی کہ نبو مرہ۔

باقی

شعرِ عربی کی مختصر تاریخ

از

جناب پروفیسر ڈاکٹر سید رغیب حسین ایم اے
(پی ۔ ایچ ۔ ڈی) صدر شعبۂ فارسی بریلی کالج ۔ بریلی

(۲)

دورِ جاہلیہ

تبصرہ | ۱ ۔ زہیر پہلا عربی شاعر ہے جس نے شعر کے صلہ میں مال حاصل کیا ۔

۲ ۔ یہ پہلا شاعر ہے جس نے کلام کی بلندی اور ترقی کے لئے سال بھر تک کلام پر خود نظر ثانی کرتے رہنے اور اُس کو اسقام سے پاک کرتے رہنے کا مفید طریقہ ایجاد کیا ۔ اس کا قول تھا کہ بغیر خود کانٹ چھانٹ کئے ہم کلام کا بہتر اور بلند ہونا ممکن نہیں ۔ چنانچہ یہ اپنا کلام وقتاً فوقتاً خود نظر ثانی کر کے درست کرتا پھر اپنے خاص احباب کو سُناتا کہ اگر غلطیاں ہوں تو درست کر لوں ۔ اس کے بعد وہ انہیں مجمع عام میں پڑھنا پسند کرتا تھا ۔ اُس کے اکثر قصائد "حولیات" کے نام سے مشہور ہیں ۔

۳ ۔ یہ اس کی خصوصیت ہے کہ اس کا کلام اس کی باوقار اور متین زندگی کا پُورا عکس اور پرتو ہے جیسا یہ خود حلیم اور حکیم انسان تھا ایسے ہی حلم اور حکمت بھرے اُس کے اشعار تھے ۔

۴ ۔ اس کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کے یہاں کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مضامین اور محاسن پائے جاتے ہیں اور یہ اثر سال سال بھر تک خود نظر ثانی کرتے رہنے کا ہے ۔

۵ ۔ اُس کی زبان سادہ اور عام فہم ہوتی ہے اور مضامین دلنشین حکمت اور نصیحت کے لئے یہی طرزِ کلام زیادہ موزوں اور مفید ہوتا ہے ۔

۶ ۔ مدح میں طرفہ کی طرح یہ بھی جھوٹ اور مبالغہ سے بچتا صرف واقعی خوبیوں ہی کا بیان کرنا

پسند کرتا۔

۷۔ اس کا کلام لفظی پیچیدگی، معنوی ابہام، نامانوس لغات سے اس قدر پاک ہے کہ بعض کے نزدیک اس کا درجہ طرفہ۔ نابغہ بلکہ امرؤالقیس سے بھی بڑھ کر ہے۔ یعنی اشعر العرب یہی ہے۔

نمونہ کلام یہ ہے۔

فلا تکتمن اللہ ما فی صدورکم　　لیخفی۔ ومہما یکتم اللہ۔ یعلم

یؤخر فیوضع فی کتاب فیدخر　　لیوم الحساب او یعجل فینقم

وفیہم مقامات حسانٌ وجوھھم　　واندیۃ ینتابھا القول والفعل

علی مکثریھم رزق من یعتریھم　　وعند المقلین السماحۃ والبذل

(۴) لبید رضؓ

تذکرہ | آپ کا نام لبید اور کنیت ابو عقیل تھی۔ والد کا نام ربیعہ تھا۔ ہوازن مضر کی ایک بہادر شاخ بنو عامر سے تھے۔ اُن کی ولادت ۵۴۳ء (۸۲ قبل نبوت) میں ہوئی۔ بڑے ہوئے تو طبیعت کے فطری مادہ نے شعرگوئی کی طرف مائل کر دیا۔ شعر کہتے اور سلامت ذوق سے اصلاح لیتے رہے۔ اُن کی شہرت کا ایک خاص واقعہ ہوا۔ نعمان بادشاہ کے دربار میں اُن کے قبیلہ بنو عامر کے کچھ لوگ اور قبیلہ بنو عبس کے کچھ لوگ اس لئے حاضر ہوئے کہ آپس کی ایک نزاع میں اُس سے فیصلہ کرائیں۔ عبس کا سردار ربیع بن زیاد نام ایک مشہور اور ہوشیار شخص تھا۔ وہ پہلے سے نعمان کا مصاحب اور ہم نوالہ و ہم پیالہ تھا۔ اُس نے اپنے سابقہ رسوخ کے باعث پہلے ہی سے نعمان کے کان عامریوں کے خلاف بھر رکھے تھے۔ عامری وفد جو حضرت لبید کے چچا ایک مشہور نیزہ باز کی سرکردگی میں وہاں گیا تو حضرت لبید بھی ساتھ تھے۔ نعمان نے عامریوں کی طرف رُخ بھی نہ کیا۔ یہ صورتِ حال بنو عامر کے لئے سخت مضر اور پریشان کن تھی اور وہ مایوس ہو کر دربار سے قیامگاہ پر دل شکستہ واپس آئے۔ حضرت لبید اُن دنوں کم عمر لڑکے تھے اُنھوں نے چچا سے پریشانی اور دل شکستگی کا سبب پوچھا لوگوں نے لڑکا سمجھ کے اُن کو ٹال دیا۔ آخر بار بار اصرار کرنے پر دربار کا قصہ بتایا تو سیف زبان لڑکے نے کہا "بہت اچھا کل میں

اس شرارت کا اتنا سخت انتقام عبسیوں سے لوں گا کہ وہ یاد ہی کریں گے" رات میں انھوں نے عبسیوں کی ایک بڑی سخت ہجو کہی اور صبح کو اپنے چچا سے اصرار کیا کہ دربار میں آج مجھے بھی ہمراہ لے چلئے۔ چنانچہ چچا کے ہمراہ بادشاہ کے دربار میں گئے جہاں علاوہ بادشاہ اور اس کے مقربین کے منخل اور نابغہ ذبیانی جیسے قادر الکلام شاعر بھی موجود تھے۔ پہونچتے ہی سیف زبان لبید نے کہا میں کچھ اشعار سنانا چاہتا ہوں۔ بچہ سمجھ کر لوگوں نے اجازت دیدی تو انھوں نے عبسیوں کی ہجو میں جو قصیدہ رات کو تیار کیا تھا بڑے جوش سے پڑھا اس کا پہلا مصرع تھا "ع مھلاً! ابیت اللعن! لا تاکل معہ" نظم بڑے زور کی تھی۔ قصیدہ کی برجستگی، زبان کی روانی، عبسیوں کی شرارتوں کی تفصیل، شاعر کے تیور ان سب چیزوں نے مل کر تمام حاضرین کو محو حیرت کر دیا۔ بادشاہ پر اس کا بڑا اثر ہوا اور اس نے عبسیوں کی طرفداری چھوڑ دی اور بنو عامر کی بڑی عزت کی اور ان کے مقدمہ کا فیصلہ انصاف سے کیا اور انعام دیکر ان کو رخصت کیا۔ دربار سے واپس ہوتے ہوئے نابغہ نے حضرت لبیدؓ سے دریافت کیا کہ ۔ "صاحبزادے! یہ اشعار تمہارے ہی تھے یا کسی اور کے تھے؟ انھوں نے کہا جی میرے ہی تھے اور رات ہی کو نظم کئے۔ کہنے لگا کچھ اور اشعار اگر کہے ہوں تو سناؤ۔ انھوں نے اپنا ایک دوسرا قصیدہ پڑھا جس کا پہلا مصرع یہ ہے:۔ "الم ترجع الی الدمن الخوالی" الخ نابغہ نے کہا صاحبزادے! میں تم کو ایسا نہیں سمجھتا تھا تم تو بنو عامر کے سب سے بڑے شاعر معلوم ہوتے ہو۔ اچھا کچھ اور کہا ہو تو سناؤ انھوں نے اپنا ایک تیسرا قصیدہ پڑھا "طلل لخولۃ فی الرسیس قدیمؒ" اب تو نابغہ پھڑک گیا اور اس نے کہا تم نہ صرف بنو عامر کے بہترین شاعر ہو بلکہ تم تو بنو قیس کے بھی سب سے بڑے شاعر ہو (پھر شاید اسی سفر میں یا کسی اور موقع پر) نابغہ نے ان سے کہا کہ اپنا کلام سناؤ تو انھوں نے اپنا وہ قصیدہ سنایا جو سبعہ معلقہ میں ہے۔ جس کا مطلع یہ ہے۔

عفت الدیار محلھا فمقامھا ۔۔۔ بمنیً تأبّد غولھا فرجامھا

تو نابغہ اس سنگلاخ زمین میں اتنا عمدہ قصیدہ سنکر پھڑک اٹھا اور اس نے کہا "میرے نزدیک تم خاندان ہوازن کے سب سے بڑے شاعر ہو" نابغہ جیسے ملک الشعراء کی یہ داد اور یہ رائے معمولی

چیز نہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا شعرائے عرب میں کیا درجہ ہے۔

حضرت لبیدؓ نے ہجرت سے قبل مکہ ہی میں بعمر ۹۰ سال اسلام قبول کیا اور جیسے قرآن اُترتا گیا یہ اُسے یاد کرتے گئے۔ اگرچہ اس کے بعد بھی تقریباً ۵۵ سال اور بھی زندہ رہے مگر قرآن کا پُرشوکت اور معجزانہ کلام دیکھ کر اس قدر متاثر ہوئے کہ بجز ایک دو شعر کے پھر اُنھوں نے شعر نہیں کہے۔ جب لوگ شعر کہنے کو کہتے تو فرماتے یکفینی القرآن فنعم ھو بدلاً من الاشعار (یعنی مجھے قرآن کافی ہے کیونکہ وہ شعر و شاعری کا بڑا ہی اچھا بدل ہے)

بعض مورخین نے لکھا ہے کہ اُنھوں نے اسلام کے بعد بس یہ دو شعر کہے۔

الحمد للہ اذ لم تاتنی اجلی	حتی اکتسیت من الاسلام سربالا
ما عاتب الحر الکریم کنفسہ	والمرء یصلحہ الجلیس الصالح

ان کا انتقال ۴۱ھ ۶۶۱ء میں بعہد حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ بعمر ۱۴۷ سال کوفہ میں ہوا۔ اُن کا دیوان طبع شدہ ہے۔

تبصرہ | ۱۔ اُن کے اشعار میں زائد اور بھرتی کے لفظ نہیں ہوتے۔

۲۔ اُن کے کلام میں حکمت اور نصیحت کے مضامین زیادہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ اُن کے ایک شعر کی تعریف خود حضور اکرم سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی کہ اصدق کلمۃ قالھا شاعرٌ کلمۃُ لبیدٍ

الا کل شی ما خلا اللہ باطلٌ - وکلُّ نعیمٍ لا محالۃ زائلٌ

۳۔ اُن کے یہاں الفاظ نہایت پرشوکت اور بندش نہایت چست ہوتی تھی۔

۴۔ مرثیہ گوئی پر اور دردناک مضامین کے ادا پر اُن کو بہت قدرت تھی۔

۵۔ مناظر کی تصویر کشی یا واقعات کی جذبات نگاری میں بھی اُن کو کمال حاصل تھا۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنے معلقہ میں نیل گائے اور گورخر کی جو تصویر کھینچی ہے وہ بے مثل ہے۔

اُن کے کلام کا نمونہ ہے:-

فلا جزع ان فرق الدھر بیننا ۔ فکل امرء یوماً به الدھر فاجع
وما الناس الا عاملان ۔ فعامل ۔ یقبّر ما یبنی واخر رافع
فمنھم سعید آخذ بنصیبه ۔ ومنھم شقیّ بالمعیشة قانع
الا کل شئ ماخلا الله باطل ۔ وکل نعیم لا محالة زائل
وکل اناس سوف تدخل بینھم ۔ دویھیة تصفر منھا الانامل

---

(۵) عمرو بن کلثوم

تذکرہ: اس کا نام عمرو اور اُس کے باپ کا نام کلثوم تھا۔ عمرو کی کنیت ابو الاسود تھی۔ بنو تغلب کا سردار تھا۔ اس کی ماں لیلیٰ مہلہل کی بیٹی تھی۔ اور اس کا باپ کلثوم عرب کا مشہور شہسوار تھا چونکہ اُس نے رئیسوں، بہادروں اور شاعروں میں پرورش پائی تھی اس لئے اُس کے اندر خودداری فخر، بہادری، شاعری کے مادے بدرجہ اتم موجود تھے۔ عمرو ابھی پندرہ برس کا نوعمر لڑکا ہی تھا جب اس کو قبیلہ کا سردار بنا دیا گیا چنانچہ اُس نے اپنے معلقہ والے قصیدہ میں اس کمسنی کی سرداری کا ذکر ذرا مبالغہ کے ساتھ مگر بڑے مزہ میں کیا ہے۔ کہتا ہے:۔

اذا بلغ الفطام لنا صبیٌّ ۔ تخرّ له الجبابر ساجدینا

یعنی ہمارے قبیلہ میں بہادری موروثی اور عام ہے کہ جس وقت ہمارے خاندان کے کسی بچہ کا دودھ چھڑایا جاتا ہے اسوقت بھی اُس کے اندر بہادری اور سرداری کے ایسے جوہر ہوتے ہیں کہ دُنیا کے بڑے بڑے جبار اور ترم باز بھی اُس کی سرداری تسلیم کر کے اُس کے سامنے سجدے کرنے لگتے ہیں۔

بنو تغلب اور بنو بکر میں "بسوس کی جنگ" عرصہ تک چلتی رہی اس میں عمرو نے کئی معرکے سر کئے تھے۔ آخر عمرو بن ہند شاہ حیرہ نے بیچ بچاؤ کر کے دونوں قبیلوں میں میل کرا دیا۔ لیکن ایک بار شاہ حیرہ عمرو بن ہند کے دربار میں بنو بکر کا مشہور شاعر حارث بھی موجود تھا اور ابن کلثوم بھی تھا کسی معاملہ میں طرفین میں گفتگو ہونے لگی بات بڑھ گئی اور گالی گلوچ ہونے لگی۔ ابن ہند بادشاہ نے حارث

سے باہمی تعلقات کے بارہ میں پوچھا تو اُس نے برجستہ اپنا وہ قصیدہ کہا جو سبعہ معلقہ میں آخر میں موجود ہے۔ اس میں اس نے نہایت متانت سے اپنے قبیلہ بنو بکر کے مفاخر اور بنو تغلب کی مسلسل زیادتیاں دکھائیں۔ ابن ہند بادشاہ پر اس قصیدہ کا اتنا اثر ہوا کہ اس وقت سے وہ بنو بکر کا طرفدار ہوگیا۔ ابن کلثوم ناراض اور مایوس ہوکر بے اجازت وہاں سے واپس چلا آیا۔ ابن کلثوم کی اس حرکت پر بادشاہ اُس سے ناخوش ہوگیا اور اُس نے چاہا کہ تغلبیوں کا غرور کسی طرح توڑے۔ اہل دربار سے پوچھا "ہے عرب بھر میں کوئی ایسا ناک ٹیک والا جس کی ماں میری ماں کی خدمت کرنے سے عار کرے۔" لوگوں نے کہا "ہمارے خیال میں تو عمرو بن کلثوم تغلبی کی ماں لیلیٰ ایسی ہی ہے کیونکہ اس کا باپ مہلہل تھا جو تغلب کا ایک مشہور رئیس اور مشہور بہادر اور ممتاز شاعر تھا۔ پھر کلثوم اس کا شوہر تھا جو عرب کا ممتاز ترین شہسوار تھا۔ پھر عمرو بن کلثوم اس کا بیٹا ہے۔ جو مشہور شاعر بہادر اور سردار قبیلہ ہے وہ یقیناً ایسی ناک ٹیک والی ہے کہ بادشاہ سلامت کی والدہ کی خدمت کرنے سے شاید عار کرے۔"
یہ سُنکر ابن ہند بادشاہ نے امتحان کے لئے عمرو بن کلثوم کو دعوت دی اور یہ کہلایا کہ اپنی والدہ کو بھی ہمراہ لاؤ اُن کی ہم نے بہت تعریفیں سُنی ہیں۔ ابن کلثوم اپنی والدہ کو اور چند سواروں کو لے کر بادشاہ کے یہاں پہونچا۔ بادشاہ نے ابن کلثوم کو اپنے قریب ٹھہرایا اور لیلیٰ کو اپنی ماں اور بیوی کے پاس زنان خانہ میں پہونچا دیا اور بادشاہ نے پہلے ہی اپنی ماں کو سمجھا دیا تھا کہ لیلیٰ تغلبی آئے گی تو تم ذرا خوبصورتی سے اُس سے کسی کام کو کہنا ذرا دیکھو کہ وہ کردیتی ہے یا قومی غرور میں اینٹھ کر انکار کردیتی ہے چنانچہ کئی دن تک دعوتیں رہیں۔ ایک دن بادشاہ کی ماں نے باتوں باتوں میں لیلیٰ سے کہا "بی بی ذرا وہ سینی تو اُٹھا دینا" لیلیٰ بولی "جسے ضرورت ہو اُسے خود اُٹھانا چاہیئے۔" بادشاہ کی ماں نے کہا۔ "اے ذرا اُٹھا دیتیں تو کیا شان کم ہوجاتی" لیلیٰ اُس پر سخت برافروختہ ہوکر اُٹھ کھڑی ہوئی اور صحن میں نکل کر اُس نے بلند آواز سے کہا "دہائی ہے بنو تغلب کی" اس وقت بادشاہ اور ابن کلثوم بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ماں کی دہائی کی آواز جو اُس کے کان میں پڑی تو وہ سمجھا کہ شاید میری ماں کو ذلیل کیا گیا ہے۔ بس اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ بادشاہ کی تلوار سامنے دیوار میں لٹکی ہوئی تھی لپک کر اُس نے

اُسے اُتار کر سونت لیا اور بجلی کی تیزی سے بادشاہ پر وار کیا اور سر اُڑا دیا۔ اہلِ دربار نے اس پر حملہ کیا مگر وہ نہایت مردانہ وار اُن سے مقابلہ کرتا ہوا باہر نکل آیا اور نہایت پھرتی سے اپنی ماں کو گھوڑے پر ساتھ لیکر روانہ ہو گیا اور اپنے سواروں کو جلد واپسی کا حکم دیا وہ سب بھی لڑتے بھڑتے نکل گئے۔ اگلے سال اُس نے بھی عکاظ کے مشہور بازار یا میلے میں ایک قصیدہ بالبداہت اور برجستہ کہا جس کا مطلع یہ تھا۔

الا ھُبّی بصحنک فاصبحینا ولا تبقی خمور الاندرینا

یہ قصیدہ سبعہ معلقہ میں پانچواں قصیدہ ہے اور بحر کی روانی۔ الفاظ کی خوبی۔ فخر کی چاشنی جوانی کی مستی۔ خودداری اور بانکپن کی نمود کے باعث بہت پسند کیا۔ اور بنو تغلب کے تو بچہ بچہ نے اسے یاد کر لیا۔ سال بھر تک ملک کے گوشہ گوشہ میں ہر طرف اسی قصیدہ کی گونج سُنائی دیتی تھی۔ یہاں تک کہ بنو بکر کے ایک شاعر نے طعنہ دیتے ہوئے کہا۔

الھٰی بنی تغلب عن کل مکرمۃ قصیدۃٌ قالھا عمرو بن کلثوم

یعنی عمرو بن کلثوم نے ایک قصیدہ کیا کہہ دیا ہے کہ اب بنو تغلب کو سوا اس کے پڑھتے رہنے کے خود کوئی بھلمنساہت کا کام کر دکھانے سے کوئی مطلب ہی نہیں رہ گیا۔ ابن کلثوم تقریباً ۵۷۰ء میں مرا ہے۔ اس کے معلقہ کے سوا اُس کے اور اشعار بہت ہی کم ہیں اور جو ہیں وہ بھی فخر نسب اور ذکر فضائل ہی سے بھرے ہوئے ہیں۔

تبصرہ | ۱۔ بدیہہ گوئی میں یہ شاعر اپنے حریف حارث سے کسی طرح کم نہیں تھا۔

۲۔ فخر اور غرور کے مضامین کو قلبی جوش اور جوانی کے بانکپن کے ساتھ اور شاعرانہ لطافتوں کے ساتھ جس طرح اُس نے بیان کیا ہے اس طرح شاید ہی کسی نے کیا ہو۔

۳۔ غیرت اور قومی حمیت اور خودداری اور ذلت کے لئے آمادہ نہ ہونا۔ جس طرح اُس نے کام سے ظاہر کیا اسی طرح اپنے کلام میں بھی ظاہر کیا جس کے اثر سے آج بھی مردہ دافسردہ دل گرما اُٹھتے ہیں۔

۴۔ اُس کے ایک قصیدہ نے اُسے حیاتِ دوام بخشی۔ سلاست اور بندش کی صفائی تو اُس کی

کنیز معلوم ہوتی ہے۔

نمونہ کلام یہ ہے

وقد علم القبائل من معدٍ ۔۔۔ اذا قُبَبٌ باَبطحِها بُنِیا

بانا التارکون اذا سخطنا ۔۔۔ وَأنّا الآخذون اذا رضینا

الا لا یجھلن احدٌ علینا ۔۔۔ فنجھلَ فوق جھل الجاھلینا

اذا بلغ الفطام لنا صبیٌّ ۔۔۔ تخر له الجبابر ساجدینا

(۷) عنترہ

تذکرہ | اس کا نام عنترہ اور باپ کا نام شداد تھا جو قبیلہ بنو عبس کے شرفا میں تھا مگر عنترہ کی ماں زبیبہ نام ایک حبشی لونڈی تھی اس لئے باپ نے عنترہ کو برادری میں شامل نہیں کیا بلکہ اپنا غلام ہی بنائے رکھا۔ وہ اس سے اونٹ چرواتا اور دوسرے کام لیتا۔ مگر چونکہ عنترہ کی رگوں میں شریف خون تھا اس لئے وہ صاحب حوصلہ تھا۔ اونٹ چرانے جاتا تو اپنے طور پر تیر چلاتا۔ نیزہ چلاتا گھوڑے کی سواری وغیرہ فنون جنگ کی مشق کرتا۔ یہاں تک کہ ان سب کاموں میں خوب ماہر ہوگیا۔ عنترہ کو اپنے باپ کی یہ بات بہت ناگوار تھی کہ وہ برادری میں اُسے اپنا بیٹا نہیں بلکہ برابر غلام ہی کہتا ہے۔ ایک دفعہ کچھ ڈاکوؤں نے بنوعبس پر ڈاکہ مارا۔ شداد نے عنترہ سے کہا دیکھتا کیا ہے تو بھی حملہ کر وہ بولا "غلام کو لڑنے اور حملہ کرنے سے کیا تعلق! شداد نے کہا" اچھا تو آج سے آزاد اور برادری میں سب کا ہمسر ہے جا لڑ۔ یہ سُنکر خوش ہوگیا اور جان توڑ کر لڑا اور بالآخر ڈاکوؤں کو مار بھگایا۔ اس دن سے اُس کی بجھی طبیعت ابھرنے لگی اور اسی دن سے اُس نے شعر بھی کہنے شروع کئے ورنہ غلامی کے زمانہ میں اُس نے ایک مصرع بھی نہیں کہا تھا۔ جنگ داحس میں عنترہ نے بڑی جوانمردی اور بہادری دکھائی یہاں تک کہ عرب کے مشہور شہسواروں اور بہادروں میں گنا جانے لگا۔ اُس کا دیوان چھپ گیا ہے۔ اُس کی بہادری کے افسانے تفریحی داستانوں میں بہت مشہور ہیں۔ اُس کا انتقال سنہ ۶۱۰ء میں قبل ہجرت ہوا۔

تبصرہ | ۱۔ اُس کی شاعری میں الفاظ کی موزونیت اور بندش کی چستی کے باعث ایک خاص موسیقیت اور ترنم محسوس ہوتا ہے جس سے اُس کا کلام بہت دلکش ہو گیا ہے۔

۲۔ اُس کے کلام میں تغزل کی چاشنی اور فخر کی بلند آہنگی دونوں چیزوں کی ایک نہایت لطیف آمیزش پائی جاتی ہے۔

۳۔ اس کے کلام میں زہیر اور ابن کلثوم کی طرح سہل اور عام فہم طرز میں ہیں جو فصاحت کی اعلیٰ قسم ہے۔

۴۔ اس کے یہاں زیادہ تر یہ مضامین پائے جاتے ہیں۔ فخر۔ شجاعت۔ رحمت۔ سخاوت عشق۔ مروت۔ وفا۔

نمونہ کلام یہ ہے۔

یا دار عبلة بالجواء تکلمی	وعمی صباحاً دار عبلة واسلمی
ولقد شربت من المدامة بعد ما	رکد الهواجر بالمشوف المعلم
فاذا سکرت فاننی مستهلك	مالی - وعرضی وافرٌ لم یُکلمِ
واذا صحوت فلا اقصر عن ندیً	وکما علمتِ شمائلی وتکرمی
لما رأیت القوم اقبل جمعهم	یتذامرون کررت غیر مُذمم

---

(۷) حارث

تذکرہ | اس کا نام حارث اور اس کے باپ کا نام حلزہ تھا۔ حارث کی کنیت ابو الظلیم تھی قبیلہ بنو بکر میں سے یشکرؔ کے گھرانہ سے تعلق تھا اس کا درجہ بنو بکر میں وہی تھا جو بنو تغلب میں عمرو بن کلثوم کا تھا۔ بنو بکر اور بنو تغلب باہم رشتہ دار بھی تھے۔ چنانچہ ابن کلثوم کے نانا مہلہل کے بھائی کلیب کی شادی بنو بکر میں ہوئی تھی اس قرابت کے باوجود دونوں میں باہم رقابت اور چشمک بھی تھی۔

حارث کا جو قصیدہ سبعہ معلقہ میں ہے وہ ابن کلثوم کے قصیدہ سے پہلے کہا گیا ہے۔ واقعہ یوں ہوا تھا کہ دونوں قبیلوں میں "بسوس کی جنگ" جب عرصہ تک ہوتی رہی تو حیرہ کے بادشاہ عمرو بن ہند نے دونوں میں صلح کرا دی۔ اس صلح کے بعد کچھ تغلبی سوار بادشاہ کے حکم سے بنو بکر کی بستیوں کے پاس سے گذرتے ہوئے کسی اور جگہ جا رہے تھے بنو بکر کے ایک تالاب پر اپنی منزل کا راستہ دریافت پوچھا لوگوں نے صحیح راستہ بتا دیا۔ اتفاق سے تغلبی سوار راستہ بھٹک کر کسی جنگل بیابان میں جا پڑے جہاں ان کو پانی نہ مل سکا اور وہ سب مر گئے۔ تغلبیوں نے یہ واقعہ سنا تو انھوں نے ابن کلثوم کو بادشاہ کے پاس بنو بکر کی یہ شکایت لیکر بھیجا کہ "بنو بکر نے نہ ہمارے سواروں کو اپنے تالاب پر اُترنے دیا اور نہ انھیں صحیح راستہ بتایا بلکہ قصداً غلط راستہ بتا کر سب کو ہلاک کر دیا چونکہ اُن سواروں کے پیاسے مرنے کے ذمہ دار بنو بکر ہیں اس لئے ان سے ہمارے ان سواروں کا خون بہا دلایا جائے" بادشاہ نے بنو بکر کو جواب دہی کے لئے طلب کیا ان کی طرف سے یہی حارث چند سوار لے کر دربار شاہی میں حاضر ہوا۔ چونکہ اس کے چہرہ پر برص (پھلبہری اور سفید داغ) کا اثر تھا اس لئے بادشاہ نے حکم دیا کہ اسے جواب دہی کے لئے کسی پردہ کے پیچھے کھڑا کرو اس پر میری نظر نہ پڑنے پائے جب حارث پردہ کے پیچھے آ گیا تو بادشاہ نے پہلے ایک دفعہ پھر ابن کلثوم سے اس کا دعویٰ پوچھا اُس نے اپنا دعویٰ دُہرایا۔ حارث نے پردہ کے پیچھے سے اس کی تردید کی۔ اس پر ابن کلثوم نے اُسے جھوٹا کہا اس نے ابن کلثوم کچھ بُرا بھلا کہا تو بادشاہ نے ابن کلثوم کو روک کر حارث سے کہا کہ تم کل واقعات باہمی رنجش کے اور یہ تازہ واقعہ صاف صاف بیان کرو۔ اتنا موقع جو حارث نے پایا تو اُس نے نثر میں گفتگو چھوڑ کر بالبدیہہ وہ قصیدہ کہا جو معلقہ میں شامل ہے اس کا مطلع یہ ہے۔

آذنتنا ببینها اسماء ربّ ثاوٍ یمل منه الثواء

اس وقت حارث اپنی کمان پر ٹیک لگائے اور سہارا دیئے کھڑا بداہتہً جوش میں اشعار کہے جا رہا تھا اور کمان کی نوک اس کی ہتھیلی میں گڑتی چلی جا رہی تھی یہاں تک کہ آر پار ہو گئی مگر اُسے جوش میں کچھ پتہ نہ چلا۔ اُس نے قصیدہ شروع کیا تو حسب دستور ایک فرضی عشق و محبت کی داستان

ہے، پھر بنو تغلب کی متعدد اور مسلسل زبادنیاں اور ہٹ دھرمیاں بیان کیں. اُسی کے بیچ بیچ میں اپنی قوم کے وقار اور مفاخر کو نہایت متانت اور سنجیدگی سے بیان کیا اور بیچ میں بادشاہ کی عنایتوں کا اور انصاف کا بھی برابر ذکر کرتا گیا۔ اس طرز خطاب سے بادشاہ بہت محظوظ بلکہ متاثر اور مسحور ہوتا رہا آخر اُس نے بیچ کا پردہ ہٹوادیا اور غایت عنایت میں اُس نے حارث کو اپنے تخت پر اپنے پاس بٹھالیا جس وقت قصیدہ ختم ہوا اُس وقت بادشاہ تغلبیوں کے بالکل خلاف اور بنو بکر کا بالکل طرفدار ہو چکا تھا۔ یہ حال دیکھ کر ابن کلثوم بادشاہ سے خفا اور مایوس ہو کر بے اجازت دربار سے اٹھکر چلا گیا۔ بادشاہ نے تغلبیوں کا یہ غرور دیکھا تو اُن کو ذلیل کرنے کے لئے اُس نے ابن کلثوم کو مع اس کی والدہ لیلیٰ کے بُلوایا تھا جس کا قصہ ہم ابن کلثوم کے حالات میں لکھ آئے ہیں اُس نے یہ قصیدہ ۱۳۵ برس کی عمر میں کہا ہے۔ اس کا انتقال تقریباً ۵۳۰ء میں ہوا ہے۔

تبصرہ ۱۔ حارث اگر اپنا معلقہ والا قصیدہ ایک برس کی طویل مدت میں بھی کہتا تو بھی لاجواب تھا نہ کہ فی البدیہہ کہنا۔

۲۔ اُس کے کلام میں بلاکی آمد اور روانی ہے۔

۳۔ اس کے قصیدہ کے واقعہ نظم ہے اور خود اس قصیدہ سے اس کی قادرالکلامی اور حاضر جوابی۔ شجاعت اور بیباکی۔ انصاف پسندی۔ متانت اور ان سب سے بڑھ کر اس کی حکمت اور موقع شناسی کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ اپنی جنگوں کا حال قومی مفاخر۔ بادشاہ کی عنایتوں کا اعتراف۔ رقیب قریب بنو تغلب کی زیادتیاں۔ اپنے قبیلہ کی بردباری وغیرہ امور کو نہایت خوبی اور دلکش روانی کے ساتھ اور شاعرانہ لطافتوں کے ساتھ اُس نے ادا کیا ہے گویا ایک فصیح البیان بیرسٹر اپنے مقدمہ کی پیروی بہت کامیابی کے ساتھ کر رہا ہے۔

۴۔ تفاخر اور متانت کی بہترین آمیزش ہم کو اسی کلام میں ملتی ہے اور یہ اس کی پختہ عمری کا باعث ہے۔

۵۔ اس کا کلام بھی زہیر بن ابی سلمیٰ کے کلام کی طرح حکمت اور تجربہ ضرب المثل ہونے کے لائق

مصرعوں سے بھرا ہوا ہے

۶۔ اس کے اور ابن کلثوم کے قصائد میں موازنہ یہ ہے کہ (الف) حارث کے یہاں جہاندیدہ تجربہ کار کی پختہ کاری ہے اور ابن کلثوم کے یہاں جوانوں کی مستی اور تیز زبانی (ب) حارث عین مقدمہ کی پیشی کے وقت بادشاہ کے دربار میں بالبداہت برجستہ قصیدہ نظم کرتا گیا اور سناتا گیا اور ابن کلثوم نے بھی اگرچہ عکاظ میں بالبدیہہ ہی قصیدہ نظم کر کے سنایا لیکن بادشاہ کی عدالت اور مقدمہ کی پیشی سے غالباً سال بھر کے بعد کہا (ج) ابن کلثوم نے ایک چلتی ہوئی بحر اپنے قصیدہ کے لئے انتخاب کی جس کو ترنم سے اچھی طرح گایا جا سکتا ہے اور جس میں نومشق شاعر کہا کرتے ہیں جسے عام لوگ خصوصاً نوجوان بہت پسند کرتے ہیں یعنی بحر وافر اس میں اس نے اپنی عمر کی رعایت کی تھی لیکن حارث نے عام رواجی بحروں سے ذراہٹ کر استادانہ بحر اختیار کی جسے ایک پختہ کار اور صاحب ذوق شاعر ہی سنبھال سکتا ہے (د) ابن کلثوم کے یہاں حسن تشبیب کے علاوہ اگر کوئی مضمون سارے قصیدہ بھر میں پایا جاتا ہے تو وہ صرف تعلی اور تفاخر ہے لیکن حارث کے یہاں حلم و وقار، حکمت، شجاعت اور اس کے ساتھ عفو و درگذر، احسان اور اس کے ساتھ عدم امتنان وغیرہ بہت سے مفید مضامین ہیں اس کے کلام کا نمونہ یہ ہے :-

ان اخواننا الاراقم یغلو ـــــ ن علینا فی قیلھم احفاء

یخلطون البریٔ منا بذی الذ ـــــ نب ولا ینفع الخلی الخلاء

ایھا الناطق المرقش عنا ـــــ عند عمرو وھل لذاک بقاء

اترکوا الطیخ والتعاشی فاما ـــــ تتعاشوا ففی التعاشی الداء

بقیہ اصحاب معلقات:۔ حماد راویہ کے نزدیک جو اصحاب معلقات تھے اُن کا ذکر تو ہم کر چکے لیکن تبریزی کی روایت اور پسند کے معلقات چونکہ دس ہیں اور وہ بھی ادبار کے نزدیک معتبر ہے اس لئے بقیہ تین اصحاب معلقات کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

---

(۸) نابغہ

تذکرہ | اس کا نام زیاد، کنیت ابو امامہ اور لقب نابغہ ہے۔ باپ کا نام معاویہ تھا۔ اُس کا تعلق قبیلہ قیس کی ایک مشہور شاخ ذُبیان سے تھا۔ کہتے ہیں کہ اُس نے نہ تو بچپن میں کوئی شعر کہا اور نہ جوانی میں۔ حالانکہ شعر و دیگر فنون لطیفہ کیطرف عمومًا انھیں دو مراحل عمر میں رجحان اور میلان ہوا کرتا ہے۔ بلکہ جب ادھیڑ عمر کو پہونچا تو یکایک شعر کہنے لگا گویا طبیعت میں کوئی سوت تھی جو پھوٹ بہی یا کوئی رگ تھی جو کھُل گئی!! اور اشعار کے اسی یکایک بہہ نکلنے پر لوگ اُسے نابغہ کہنے لگے۔

بعض علماء ادب کا خیال ہے کہ جاہلیت کے شعراء میں بجز امرؤ القیس کے اور کوئی اُس کے ٹکر کا نہیں۔ حیرہ کے بادشاہ نعمان نے اُس کی بہت سرپرستی کی۔ کیونکہ وہ علم پرست اور شعر نواز بادشاہ تھا۔ اُس نے نابغہ کو انعامات دیکر مالا مال کر دیا۔ چنانچہ مشہور ہے کہ نابغہ کے پاس نہایت وافر مال، چاندی سونے کے برتن اور کئی کئی کنیزیں اور غلام تھے اور وہ چاندی سونے کے برتنوں میں کھانا کھاتا تھا۔ عرب میں ایک شاعر کا اتنا دولت مند ہونا اور پھر شعر کے ذریعہ کسب کمال اور جلبِ زر کرنا اور پھر اس شاعر کا ادھیڑ عمر میں یکایک شاعر ہو جانا۔ یہ تینوں باتیں بہت عجیب تھیں اس لئے نابغہ کی شہرت بہت جلد اور بہت زیادہ ہو گئی۔

مشہور ہے کہ نعمان بادشاہ کی ایک بیوی جس کا نام متجردہ تھا بہت حسین تھی۔ نعمان کی فرمائش پر نابغہ نے اُس کی تعریف میں ایک قصیدہ کہا اس میں نابغہ نے تو متجردہ کے حُسن اور موزونیٔ اعضا کا بیان محض اپنی قوت متخیلہ سے کیا لیکن اس کا بیان کچھ اس حد تک واقعیت اور صحت کے قریب تھا کہ نعمان کو شبہ ہوا کہ اُس نے متجردہ کو ضرور قریب سے دیکھا ہے دربار میں ایک شاعر منخل بھی تھا اُس نے اپنا پردہ رکھنے کے لئے اس شبہ کی تائید کی۔ اس پر نعمان نابغہ کو سزا دینے کی تدبیر میں تھا کسی طرح نابغہ کو اس کا پتہ لگا تو وہ بھاگ کر غسان کے بادشاہ عمرو کے پاس پناہ لینے پہونچا۔ یہاں بھی وہ نعمان کا دربار اور اُس کے انعامات کو بھولا نہیں آخر اُس نے ایک قصیدہ معذرت میں لکھکر نعمان کے پاس بھیجا جس سے اُس کی غلط فہمی دور ہوئی اور نابغہ ایک بار پھر نعمان کے دربار میں آ گیا۔

عکاظ کے بازار میں جب یہ شرکت کو جاتا تو اُس کے لئے ایک ممتاز سُرخ چرمی خیمہ نصب کیا جاتا اور لوگ بادشاہوں کی طرح اُس کی قدر کرتے۔ اُس نے طویل عمر پائی آخر ہجرت نبوی سے کچھ ہی قبل ۶۰۴ء میں مرگیا۔

تبصرہ | ۱۔ یہ سب سے پہلا شخص ہے جس نے شعر گوئی کو ذریعہ معاش بنایا۔ اسی وجہ سے آزاد عرب اسے بے وقعت جانتے۔

۲۔ اس کے کلام میں انتخابِ الفاظ ایسا بے مثل ہوتا کہ اس کا کلام سیدھا دل میں اُتر جاتا۔

۳۔ عرب کے غیر متمدن ملک میں اس کا درجہ وہ تھا جو متمدن ممالک میں "ملک الشعراء" کا ہوتا ہے یہ جس طرح نعمان کے دربار میں ملک الشعراء تھا اسی طرح عکاظ کے بازار میں عوام بھی ملک الشعرائی کا درجہ دیکر دیگر شعراء کے کلام کو جانچنے اور ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کے لئے اسی کو حکم بناتے۔

۴۔ اُس کے یہاں آمد۔ روانی۔ سادگی اور برجستگی غضب کی ہوتی۔ تکلف اور آورد اُس کے یہاں نام کو بھی نہ ہوتا۔

۵۔ بعد کے شعراء میں سے صرف متنبی نے اُس کا چربہ اُڑایا ہے۔ چنانچہ متنبی کے کلام پر اسی کے کلام کا اثر ہے۔

۶۔ خوف اور معذرت اس کا خاص مضمون اور خاص میدان ہے۔ یہ مضامین اس سے بہتر کسی نے نہیں بیان کئے۔ اس کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

فَاِنَّكَ شمسٌ والملوكُ كواكبٌ ... اذا طلعت ۔ لم يبدُ منهن كوكبُ

ولا عيب فيهم غير انّ سيوفهم ... بهنّ فلولٌ من قراع الكتائب

نُبِّئتُ ان ابا قابوس اوعدني ... ولا قرار على زأرٍ من الاسد

---

(۹) میمون اعشیٰ

تذکرہ | اس کا نام میمون اور کنیت اعشیٰ اور ابو بصیر تھا۔ باپ کا نام قیس تھا۔ بنو بکر بن وائل سے

اس کا تعلق تھا۔ یہ شخص پہلے ایک مشہور شاعر ابن علس کا صرف راوی تھا اور یمامہ کے شہر منفوحہ میں رہتا تھا۔ ابن علس کی صحبت سے اس کا ذوق شاعری بہت نکھر گیا اور پھر اس نے بھی اشعار کہنے شروع کئے اس نے بھی نابغہ کی طرح امراء و رؤسا کی مداحی کو ذریعہ معاش بنایا۔ چونکہ یہ اپنے اشعار گا کر پڑھا کرتا تھا اس لئے لوگ "صناجۃ العرب" کہنے لگے۔ صناجہ کے معنی جھانجھ کے ہیں جو ایک باجہ ہے۔

یہ جس طرح مدح میں مشہور ہے اسی طرح ہجو کرنے میں بھی بہت مشہور ہے۔ لوگ اگر ایک طرف دل سے یہ تمنا کرتے کہ کاش اعشیٰ میری فلاں صفت یا فلاں چیز کی تعریف میں کچھ اشعار کہہ دیتا تاکہ اس کی شہرت عام ہوجائے اور لوگ اس کی طرف متوجہ ہوں تو دوسری طرف اس کی ہجو سے بھی بہت ڈرتے رہتے تھے اور ایسے امور سے بچتے جن سے وہ ناخوش ہوکر ہجو کہنے لگے کیونکہ پھر وہ سارے عرب میں بدنام ہوجاتا۔

ایک شخص محلق کی تین بیٹیاں تھیں جن کو بر نہیں ملتا تھا اور ان کی عمریں زیادہ ہوتی جارہی تھیں آخر محلق نے اعشیٰ کی دعوت کی۔ اس میں بہت اہتمام کیا اسے شراب بھی پلائی۔ جب اسے سرور ہوا تو محلق نے کہا کہ میں لڑکیوں کی شادی نہ ہونے سے سخت فکر مند ہوں۔ بر ملتے نہیں اگر آپ اس میں میری کچھ مدد کرسکیں تو کردیجئے۔ اس نے ان لڑکیوں کی مدح میں قصیدہ کہا اور اپنے راوی کو دیدیا۔ قصیدہ کا مشہور ہونا تھا کہ بڑے اونچے اونچے خاندانوں سے ان لڑکیوں کے لئے پیام آنے لگے آخر بہت جلد وہ تینوں لڑکیاں اُٹھ گئیں۔

آخر عمر میں اس کی بینائی جاتی رہی۔ اسی زمانہ میں اس نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف اور نبوت کا حال سنا تو کچھ کشش اسے اسلام کی طرف ہونے لگی تو اس نے ایک قصیدہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کہا جس کا مطلع یہ تھا۔

الم تغتمض عیناك لیلۃ ارمدا   وبت کما بات السلیم المسھدا

اور آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے روانہ ہوا۔ کسی طرح کفار کو اس کی خبر لگی تو وہ بہت گھبرائے اور انھوں نے سوچا کہ اگر کہیں اعشیٰ اسلام لے آیا اور اس کا قصیدہ حضور کی شان میں عرب میں پھیل گیا تو غضب

ہی ہو جائے گا۔ پھر تو لوگ دھڑا دھڑ اسلام لانا شروع کر دیں گے۔ مگر چونکہ حق تعالےٰ کو یہ منظور نہ تھا کہ ورأیت الناس یدخلون فی دین اللہ افواجاً کا منظر کسی انسانی کوششوں کا رہین منت ہو بلکہ اُسے اللہ تعالےٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے بے شرکت غیرے خود ظاہر فرمانے والے تھے اس لئے یہ صورت پیدا ہوئی کہ کفار مکہ سو اونٹ لیکر راستہ ہی میں اُس سے جا کر ملے اور اُسے یہ انعام دیکر راستہ ہی سے واپس کر دیا۔ اس کی قسمت میں اسلام لانا نہ تھا۔ اتفاق یہ ہوا کہ منفوحہ پہونچنے بھی نہیں پایا تھا کہ اُس کی اونٹنی ٹھوکر کھا کر گری۔ اعشےٰ بھی اونٹنی سے نیچے گرا اور اُس کی گردن ٹوٹ گئی اور مر گیا۔ یہ واقعہ ۶۲۹ء کا ہے۔

تبصرہ | اکثر مورخین ادبِ عربی امرؤ القیس کے بعد نابغہ کو اور نابغہ کے بعد زہیر اور اعشیٰ کو درجہ دیتے ہیں چنانچہ ان چاروں کو "اربعۃ الفحول" کہتے ہیں۔

۲۔ اعشیٰ بہت پُر گو شاعر تھا۔ کلام کی زبادتی میں یہ اُن سب میں ممتاز ہے۔

۳۔ شراب کی تعریف اور اُس میں مبالغہ اُس کا خاص مضمون ہے جس میں اُس کا کوئی حریف نہیں۔ چنانچہ بعض لوگوں کا فیصلہ مشہور ہے کہ گھوڑے کا وصف امرؤ القیس کا حصہ ہے۔ طمع اور رغبت کا مضمون زہیر سے بہتر کسی نے نہیں کہا خوف اور معذرت کے بیان میں نابغہ کا کوئی ہمسر نہیں اور شراب اور مستی کے ذکر میں اعشیٰ اپنا جواب نہیں رکھتا

۴۔ اس کے کلام میں زور اور تاثیر کا یہ حال تھا کہ اُس نے نہ معلوم کتنے گمنام اور ادنےٰ لوگوں کو مشہور اور باعزت بنا دیا اور کتنے باعزت کو ذلیل کر دیا۔ کسی مائل کو متنفر اور متنفر کو مائل بنا دینا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا

۵۔ چونکہ یہ فارس اور روم کی سیر کو آیا اور مختلف قسم کے رؤسا کے پاس بیٹھ چکا تھا اس لئے اُس نے غیر ملک کے بعض الفاظ بھی اپنے اشعار میں داخل کر کے اُن میں ایک جداگانہ لطف پیدا کر دیا۔

۶۔ بعض ادبا کا خیال ہے کہ اگر اس کا شعر کوئی پڑھ رہا ہو تو چونکہ اعشیٰ کے کلام میں ایک خاص قسم کی موسیقی بلکہ گونج اور دلکشی ہے اس لئے یہ محسوس ہوتا کہ کوئی دوسرا شخص اس کے ساتھ مل کر گا رہا ہے۔

اُس کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

فآلیت لا ارثی لھا من کلالۃ ولا من حفی حتی تلاقی محمداً (صلی اللہ علیہ وسلم)
نبی یری مالا یرون و ذکرہ اغار لعمری فی البلاد وانجدا
لہ صدقات ماتغب ونائل ولیس عطاء الیوم یمنعہ غداً

مسلم سلاطین اور مسیحی فرماں رواؤں کا تقابل

از

(مولانا ابو القاسم رفیق دلاوری)

انگریز حکام نے ہندوستان میں اپنی حکومت کا قیام و بقا تفرقہ اندازی پر موقوف سمجھ رکھا تھا۔ اُن پر یہ واہمہ متسلط تھا کہ اگر وہ رعایا کو باہم مُتصادم نہ رکھیں گے تو اس پر کامیابی اور آبرومندی کے ساتھ حکومت نہ کرسکیں گے۔ اس بنا پر ان کی انتہائی کوشش ہمیشہ یہی رہی کہ ملک کی مختلف قوموں میں باہم سرپھٹول جاری رہے۔ اور اگر اتحاد و اتفاق کی صورت پیدا ہو تو کوئی نئی فتنہ انگیزی کر کے پھوٹ ڈال دیں۔

اس سلسلۂ شر انگیزی میں انہوں نے مسلمانوں کے خلاف جذبۂ نفرت وعناد پھیلانے کے لئے نصابِ تعلیم میں انگریز مصنفوں کی لکھی ہوئی جو تواریخ ہند مقرر کیں، ان میں مسلمان بادشاہوں کو انتہا درجہ کے ظالم، نابکار، نالائق اور غیر مسلم رعایا کے حق میں سخت جابر ظاہر کیا گیا ہے۔ کسی انگریز مصنف کی کوئی تاریخ ایسی نہ ملے گی جس میں موحّد سلاطین پر طعن و تشنیع کی غلاظت نہ اُچھالی گئی ہو۔ اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ بطور ردِ عمل خود انگریز مصنّفوں کی کتابوں سے مسلمان اور مسیحی حکمرانوں کا کچھ تقابل دکھایا جائے۔

رعایا سے خلفائے ہسپانیہ کا سلوک

مسلمان قریباً آٹھ سو سال تک اسپین (ہسپانیہ یا اُندلس) پر حکمراں رہے۔ اس عرصہ میں انہوں نے اپنی یہودی و نصرانی رعایا سے جو عادلانہ و مشفقانہ برتاؤ کیا، اُس کی کیفیت خود یورپی مورخوں کی زبان سے سُنیئے۔ مسٹر ایس، پی، سکاٹ کتاب ہسٹری آف دی مُورش امپائر اِن یورپ میں لکھتے ہیں:۔

مسلمان فاتحین نے عہد سابق کے مسیحی قوانین کا احترام قائم رکھا۔ البتہ اس کے دستور العمل

اسلامی قوانین کے تابع کر دئے۔ مفتوحین پر وہی قانون نافذ تھا مگر اُسی حد تک کہ اسلامی شریعت کے خلاف نہ پڑے۔ مسلم تاجداروں نے اپنے عدل و انصاف، مسامحت و رواداری اور مراحم خسروانہ سے بہت جلد دلوں کو مسخر کر لیا۔ یہودی مرفہ الحال ہو گئے۔ عیسائی اپنے مذہبی تعصبات بھول گئے۔ غلاموں نے وہ کلمۂ توحید پڑھ لیا جس سے اُن کا داغ غلامی ہمیشہ کے لئے مٹ گیا اور وہ اپنے حکمران سلاطین کے مساوی ہو گئے (ہسٹری آوف دی مورش اِمپائر اِن یورپ مطبوعہ لندن جلد اول ص ۲۵۸)

مسلمان بادشاہوں نے یہودیوں کے ساتھ امید سے بڑھ کر سلوک کیا اور ان سے اِس خوبی اور انصاف کے ساتھ پیش آئے کہ اس کی مثال عہدِ جاہلیت اور عیسائی تاجداروں سے ان کو کبھی نہیں ملی تھی۔ مسلمانوں نے انہیں اپنی مسجدوں کے سامنے معابد بنانے کی اجازت دی (ایضاً جلد ۳ ص ۱۳۱) مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار سے ان مظلوم و مقہور قوموں کو جو مدتِ دراز سے لگد کوبِ زمانہ ہو رہے تھے بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ چناں چہ افریقی یہودیوں نے مسلمانوں کا اسی جوش و خروش کے ساتھ خیر مقدم کیا جیسا کہ ایک ستم رسیدہ اور مایوس و مضطر آدمی کو کرنا چاہئے (ایضاً ص ۱۳۴)

مسلمان والیانِ ملک کی یہودی رعیت نے اپنے لئے اُس نمونہ پر ایک نظامِ حکومت قائم کر لیا جو اُن کے بزرگوں میں چلا آتا تھا اور جس کو کوئی حلیم سے حلیم بادشاہ بھی گوارا نہیں کرتا، چہ جائے کہ عیسائیوں جیسے تشدد پسند اور کینہ توز فرمانروا اس کو برداشت کرتے۔ یہودی اسلامی مملکت میں رہ کر اپنے میں سے کسی اعلیٰ خاندان کے کسی سرآوردہ شخص کو اپنا بادشاہ منتخب کر لیتے تھے۔ یہودی اس کو کچھ محصول ادا کرتے تھے۔ یہ بادشاہ اپنے دیوانی اور فوج داری حکام اور دینی مقتدا خود انتخاب کرتا تھا۔ خلفائے ہسپانیہ اس نظامِ حکومت اور اُس بادشاہ کو دیکھتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ لیکن اتنی بات تھی کہ یہودی حکمران اور اس کے مقرر کردہ حکام کو خلیفۂ وقت کے احکام کا پابند رہنا پڑتا تھا (ایضاً ص ۱۳۸)

یہودی دینِ اسلام کی مسامحت و رواداری سے برابر فائدہ اٹھاتے جاتے تھے۔ چودھویں صدی عیسوی میں جب کہ ہنوز غرناطہ کے اندر اسلامی سلطنت قائم تھی، وہاں یہودیوں کے پندرہ ہزار خاندان آباد تھے۔ غرناطہ کو چھوڑ کر باقی تمام جزیرہ نمائے اسپین میں جہاں جہاں از سرِ نو مسیحی حکومت قائم ہوگئی تھی، یہودی رعایا بدامنی اور انقلاب کے چنگل میں گرفتار تھی۔ محتسب پادری ان کو ایذائیں دیتے تھے۔ مسیحی فرمانروا اُن کو لوٹتے تھے۔ مگر غرناطہ میں یہ لوگ وہاں کے دو آخری مسلمان شاہی خاندانوں کے ظلِّ عاطفت میں نہایت امن و عافیت کے ساتھ اپنے کاروبار میں مصروف تھے۔ یہاں تک کہ اُدھر عیسائیوں نے مسلمانوں کو غرناطہ سے بے دخل کیا، اِدھر یہودی تباہ ہوگئے۔ (ایضاً ص ۱۴۹)

اسی طرح مسٹر ایچ، ایم، اسٹیفنس تاریخ پرتگال میں لکھتے ہیں:۔

سلاطین بنو اُمیّہ کی دانش مند اور حلیم و بردبار سلطنت کے ماتحت اسپین اور پرتگال بدستور عروج و ترقی سے ہمکنار رہے۔ اگرچہ عرب فاتحین کو اپنے اسلامی عقائد سے بڑا شغف تھا، تاہم اُموی سلاطین روشن خیال فرمانروا تھے۔ وہ مسیحیت کے مؤیّد و پشت پناہ نہیں تھے اور رعایا کو قبول مسیحیت کی تحریص و ترغیب نہیں دیتے تھے، تاہم اُس وقت تک مسیحیت کے حامی تھے، جب تک عیسائی پادریوں کی طرف سے اسلام کے خلاف معاندانہ سرگرمیوں کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ (تاریخ مطبوعہ لندن صفحہ ۱۲)

اور مسٹر جون ڈیون پورٹ لکھتے ہیں کہ اگر عربوں اور ترکوں کی بجائے اہلِ یورپ ایشیا کے مالک ہوتے تو وہ اسلام کو اس طرح برداشت نہ کرتے، جس طرح مسلمانوں نے مسیحیت کو برداشت کیا اور مسٹر جیبٹ فیلڈ نے ہسٹوریکل ریویو (صفحہ ۱۱۳) میں بیان کیا کہ اگر عرب، ترک اور دوسرے اسلامی قبائل عیسائیوں سے وہی سلوک کرتے جو یورپی قوموں نے قرآن ماننے والوں سے روا رکھا تو اغلب ہے کہ ایشیا کی سرزمین سے مسیحیت کا نام و نشان مٹ جاتا (اپالوجی فار محمد اینڈ دی قرآن مطبوعہ لندن ص ۴۴)

رعایا سے مسیحی حکمرانوں کا سلوک اب اس کے مقابلہ میں ذرا مسیحی رواداری اور رعایا پروری کے چند تابناک نمونے ملاحظہ ہوں۔ مسلمانوں سے پہلے ہسپانیہ پر گوتھ عیسائیوں کی حکومت تھی۔ گوتھوں کی رعایا ہسپانیہ کے عیسائی اور یہودی تھے۔ اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ تمام حکمران احسان و مروّت کا سلوک کرتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ گوتھ عیسائیوں نے غیر مذہب یہودی رعایا کے ساتھ کیا برتاؤ برتا؟ اسی طرح اُن ہسپانوی عیسائیوں کی رعیت پروری پر بھی ایک نظر ڈالنی چاہئے جو اسلامی حکومت کے زوال کے بعد ہسپانیہ کے مالک ہوئے اور جن کی غیر مسیحی رعایا مسلمان اور یہودی تھے۔

یہودیوں کا لحم خنزیر کھانے پر مجبور کیا جانا چھٹی صدی عیسوی کے اواخر میں ہسپانیہ اور پرتگال پر گوتھ نسل کے عیسائیوں کی عمل داری تھی۔ ان فرمانرواؤں کے قوانین کا ایک بڑا حصہ یہود سے متعلق تھا۔ یہ آئین یہودیوں کو بہت سے حقوق سے محروم کرنے، اُن کے مذہبی رسوم کے روکنے اور ان کے جرائم کی فہرست اور عقوبتوں کی تفصیل سے مملوّ تھے۔ ان قوانین کے رو سے یہودی اپنی کوئی قومی عید نہیں منا سکتے تھے۔ کسی عیسائی کے خلاف شہادت نہیں دے سکتے تھے۔ اگر کوئی عیسائی عورت کسی یہودی سے شادی کر لیتی تھی تو وہ شادی کالعدم متصور ہوتی تھی۔ اگر اس تعلق سے کوئی بچہ پیدا ہوتا تھا تو پادریوں کو حق حاصل تھا کہ اس کو والدین سے چھین کر مسیحی تعلیم دیں۔ ختنہ کرانا بھی یہود کے لئے قانوناً ممنوع تھا۔

اس مضحکہ خیز قانون کی ظلم آرائی نے یہودیوں کو لحم خنزیر کھانے پر بھی مجبور کر رکھا تھا حالاں کہ (اسلام کی طرح) یہودی مذہب میں بھی یہ قطعاً حرام ہے اور یہودی خاندانوں میں نسلاً بعد نسل حرام اور نجس ہی یقین کیا جاتا رہا ہے۔ اگر کوئی یہودی ان ظالمانہ احکام کی خلاف ورزی کرتا تھا تو وہ عموماً زندہ آگ میں جلا دیا جاتا تھا۔ ہاں اگر کبھی سزا میں نرمی اختیار کی جاتی تو مجرم کو سنگسار کر دیا جاتا تھا۔ گوتھ بادشاہوں کے عہد سلطنت میں جو یہودی جتنا زیادہ دولت مند تھا، اتنا ہی زیادہ مجرم تھا۔ ہزاروں یہودی گرفتار ہوئے۔ لوٹے اور قتل کئے گئے۔

نوّے ہزار یہودیوں کا بالجبر عیسائی بنایا جانا جو مذہبی کونسل بادشاہوں کا انتخاب کرتی تھی، اس میں پادریوں کی اکثریت تھی۔ اُن کے اثر و اقتدار سے بادشاہ کے حلف نامہ میں یہ دفعہ بھی بڑھادی گئی کہ میں اپنے ممالک محروسہ میں رومن کیتھولک مذہب کے سوا کسی دین یا مذہب کو سرسبز نہ ہونے دوں گا۔ کثیر التعداد یہودیوں کو جن کی تعداد نوّے ہزار بتائی جاتی ہے بجبر و اکراہ عیسائی بنالیا گیا اور کھلے خزانے ان کو اصطباغ دیا گیا۔ یہود کی ایک کثیر جماعت دین کو جلاء وطنی پر ترجیح دے کر فرانس، اٹلی یا دوسرے ممالک کو بھاگ گئی (ہسٹری آف دی مُورِش امپائر اِن یورپ جلد ۳ ص ۱۲۸-۱۲۹)

پادری یہ چاہتے تھے کہ تمام یہودی جبراً عیسائی بنائے جائیں۔ ان پر اس شدت سے ظلم توڑے گئے کہ بعض اوقات ان کو دیکھ کر اُس زمانہ کی نیم وحشی اور متعصب آدمی بھی بدحواس ہوجاتے تھے (ایضاً جلد اوّل صفحہ ۱۸۰)

لاکھوں یہودیوں کی جلاوطنی گوتھ فرمانرواؤں نے اپنی یہودی رعایا کے ساتھ جو سفّاکانہ سلوک کیا، اُس کا ایک دھندلہ سا عکس قارئینِ کرام کی نظر سے گذرا، اب ذرا ان عیسائیوں کی "روشِ شفقت مآبی" بھی ملاحظہ ہو جنھیں اسلامی حکومت کے زوال کے بعد وہاں چترِ شاہی نصیب ہوا۔ مسٹر اسکاٹ لکھتے ہیں :-

"جیسے جیسے مسلمانوں کو زوال آتا گیا، ہسپانیہ کے پادری یہودیوں کو زیادہ تکلیفیں دیتے گئے۔ (ہسٹری آف دی مُورِش امپائرانِ یورپ جلد ۳ ص ۱۵۴) مسٹر ہنری چارلس لی لکھتے ہیں کہ ۱۴۹۲ء میں جب غرناطہ پر عیسائیوں کا عمل و دخل ہوا تو اس فتح کی خوشی میں یہودیوں کو ہسپانیہ سے خارج کر دینے کا فیصلہ ہوا۔ چناں چہ کئی لاکھ یہودی جلاوطن کئے گئے (موریسکوز آف اسپین مطبوعہ لندن ص ۱۶)

مسلمان رعایا سے مسیحی حکمرانوں کا برتاؤ مسیحی حکمرانوں نے مسلمان مفتوحین سے جو سلوک کیا، وہ اس برتاؤ سے کہیں زیادہ سفّاکانہ و بہیمانہ تھا جو یہودیوں سے روا رکھا گیا تھا۔ مسٹر ہنری چارلس لی

رقمطراز ہیں:-

۱۳۲۷ء میں تاراگونڈا کے اسقفِ اعظم آرنلڈ نے پوپ سے درخواست کی کہ وہ ہسپانوی صوبہ ارغون کے فرمانروا کو حکم دے کہ مسلمانوں اور یہودیوں کو اپنی مملکت سے خارج کردے اور سربرآوردہ لوگوں کو اختیار دیا جائے کہ مسلمانوں کو پکڑ پکڑ کر غلاموں کی حیثیت سے بیچ ڈالیں اور ان کی جائدادیں فروخت کردیں کیوں کہ وہ ملک کے دشمن اور کافر ہیں اور اس طرح جو زرِ نقد حاصل ہو، وہ ملک کے سود و بہبود پر خرچ کیا جائے۔ (مورِ سکوز آوف اسپین مطبوعہ لندن ص ۱۰)

۱۳۴۸ء میں حکم ہوا کہ اگر کہیں عشائے ربانی لے جایا جاتا ہو تو مسلمان اور یہودی بازاروں میں گھٹنے ٹیک کر کھڑے ہو جایا کریں اور عیسائیوں کے تمام تیوہار منائیں۔

اسی سال مسلمانوں اور یہودیوں پر سرکاری ملازمت کے دروازے قطعاً بند کردے گئے۔ (ایضاً ص ۹)

مسجدوں کی گرجوں میں تبدیلی ایک کوشش یہ کی گئی کہ مسجدوں کو گرجے بنا لیا جائے چناں چہ چند مسجدیں گرجوں میں تبدیل بھی کی گئیں۔ بعض مسجدوں میں مسیح (علیہ السلام) اور مریم عذراؑ کی تصاویر چسپاں کردی گئیں۔ پادریوں نے بعض مساجد میں عیسائی طریقہ پر نماز بھی پڑھائی جس میں وہ مسلمان بھی شامل ہوئے جن کو بالجبر بپتسمہ دیا گیا تھا لیکن جس دین (مسیحیت) کا طوق ان کے گلے میں ڈالا گیا تھا، اس پر وہ چند روز سے زیادہ قائم نہ رہے، جیسے ہی انھیں احساس ہوا کہ تشدد اور خطرہ جاتا رہا، انھوں نے از سرِ نو اسلامی طور طریقے اختیار کرلئے اور پہلے کی طرح مسجدوں میں جاکر اسلامی نمازیں پڑھنی شروع کردیں۔ بہت سے مسلمانوں نے اپنی سلامتیٔ ایمان ہجرت پر منحصر دیکھی، اس لئے افریقہ بھاگ گئے۔ اس موقع پر کم از کم پانچ ہزار اسلامی مکانات خالی ہوگئے (ایضاً ص ۶۷)

رونگٹے کھڑے کردینے والے دردناک حادثے "مسیحی رحم و کرم" کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو۔ جب اسپین میں

مسلمانوں کو جبراً عیسائی بنایا جارہا تھا تو ملک کے طول و عرض میں شورش بپا تھی۔ اس سلسلہ میں عربوں کے ایک سرگروہ عبداللہ نام درجۂ شہادت پر فائز ہوئے تھے۔ مسٹر ہنری چارلس لی ان کی نسبت لکھتے ہیں:۔

عبداللہ کی لاش کی ہر طرح سے بے حرمتی کی گئی۔ ان کا سر کاٹ کر ایک آہنی پنجرہ میں بند کر کے ایک چوک کی محراب میں رکھ دیا گیا۔ یہ سر کئی سال تک الفجارہ کی طرف دیکھتا رہا۔ جن اضلاع میں نئی نئی بے چینی پھیلی تھی، ان میں فوج کے چھوٹے چھوٹے دستے چھوڑ دیے گئے اور ہر سپاہی سے کہہ دیا گیا کہ جو کوئی ڈیزا کے پاس کسی عرب کو پکڑ لائے گا، اس کو بیس ڈوکیٹ فی عرب انعام ملے گا۔ جب کوئی عرب ڈیزا کے سامنے پیش کیا جاتا تو وہ اس کو غور سے دیکھتا۔ اگر معمولی حیثیت کا آدمی ہوتا تو اسے جہازوں پر مشقت کے لئے بھیج دیتا اور اگر معزز و سرآوردہ آدمی ہوتا تو پہلے تو چمٹے گرم کرا کرا کر اس کی کھال نچواتا۔ پھر پھانسی دے دیتا (مورسکوز آف سپین ص ۲۶۳) انا للہ وانا الیہ راجعون۔

پاپائے اعظم اور مسلم فرمانرواؤں کی رواداری کا مقابلہ

اسلامی اور مسیحی رواداری کا جو مقابلہ سطور بالا میں پیش کیا گیا، وہ ہر دو مذاہب کے تاجداروں سے متعلق تھا۔ اب مسلم حکمرانوں کی مسامحت و رواداری کا تقابل حضرت پوپ کی "آشتی اور بلند نظری" سے کیا جاتا ہے۔ پوپ یا پاپائے اعظم مسیحی فرقہ رومن کیتھولک کے سب سے بڑے مذہبی پیشوا کا لقب ہے جو حضرت مسیح علیہ السلام کا جانشین سمجھا جاتا ہے اور جس کا مرکز و مستقر اٹلی کا پایۂ تخت رومہ ہے۔ آج کل تو یہ حالت نہیں رہی، لیکن ایک وہ زمانہ تھا جب کہ رومن کیتھولک مذہب کے بادشاہ کٹھ پتلی کی طرح پوپوں کے اشاروں پر رقص کیا کرتے تھے۔ مسٹر اسکاٹ رومن کیتھولک فرقہ کی تنگ نظری کے ذکر میں لکھتے ہیں:۔

"جس خاص وضع کے مذہب کے داعی و منادا اپنی کامیابی کا مدار اس پر سمجھتے ہوں کہ ان لوگوں کا نام صفحۂ ہستی سے محو کر دیا جائے جو ان کے خود ساختہ اصولوں کو تسلیم نہیں کرتے ایسے

لوگ فی الحقیقت اپنے الہامی مذہب اور اُس کے سچے اصولوں پر ایمان نہیں رکھتے کہ جن کو وہ بجبر و قہر دنیا میں رائج کرنا چاہتے ہیں۔ جس زمانہ میں پوپوں کی عظمت آسمان سے باتیں کر رہی تھی، غیر مذاہب کا کوئی فرد جس پر ان کا قابو چل سکتا تھا، اس کی جرأت نہیں کر سکتا تھا کہ اپنے مذہب کا اظہار کر سکے یا اظہار کر کے زندہ سلامت رہ سکے۔ برخلاف اس کے اسلامی خاندانوں بنو امیہ اور بنو اغلب کے عہد سلطنت میں غیر مذاہب کے لوگ بلکہ بت پرست بھی جزیہ دے کر ہر طرح سے امن و امان کی زندگی بسر کرتے تھے (ہسٹری آوف دی مورِش ایمپائر اِن یورپ جلد ۳ ص ۱۴۷)۔

سلطان صلاح الدینؒ اور شاہ رچرڈ کا اخلاقی موازنہ

مسٹر ڈیون پورٹ لکھتے ہیں کہ سلطان صلاح الدّین ایّوبی کی ذات میں اہل اللہ کا سا تقویٰ و تقدس پایا جاتا تھا۔ وہ خلقِ خدا کے حق میں بڑے رحیم و شفیق تھے۔ ان کا حلم و وقار ان کے حریفوں تک کے لئے قابلِ تقلید تھا۔ سلطان بلاشبہ اعلیٰ درجہ کی شجاعت، بلند ہمتی، عقل و دانش اور فیاضی کے انسان تھے جب سلطان کا دمشق میں انتقال ہوا ہے تو وصیت کر گئے تھے کہ میراث کو غرباء و مساکین میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس کے مقابلہ میں سلطان کے حریفِ مقابل رچرڈ اوّل شاہ انگلستان کی طرف دیکھو کہ جس کی ساری ٹھاٹھ اُن بڑی بڑی رقموں کے طفیل قائم ہوئی تھی جو رعایا پر جور و ظلم کر کے بجبر وصول کی گئی تھیں۔ اس کی آتشِ حرص و آز کبھی بجھتی نہ تھی۔ اس کی بے لگام نفس پرستی نے نہ صرف اُس کو اپنی حسین ملکہ برنجیریا کی طرف سے بے رُخی برتنے پر مائل کر رکھا تھا بلکہ اُس سے ایک ایسا ناشدنی گناہ بھی کرایا تھا جو بالکل ناقابلِ بیان ہے۔ ایک غریب راہب نے شاہ رچرڈ اول پر بھری عدالت میں اُس کے ایک نہایت ناپاک جرم پر بُری طرح لے دے کی تھی اور کہا تھا کہ تم ایسی سیاہ کاریوں کا ارتکاب کرتے وقت ذرا سدوم کی تباہی کو پیشِ نظر رکھ لیا کرو۔

سلطان محمود غزنوی کا شاہانِ یورپ سے مقابلہ

مسٹر ڈیون پورٹ لکھتے ہیں:۔ مسلم حکمران خاندانوں کے اکثر بادشاہ غیر معمولی اخلاق و اطوار کے مالک گزرے ہیں۔ سلطان محمود غزنوی کی فہم و فراست،

عاقبت اندیشی، اولوالعزمی، فراخ حوصلگی اور علوم وفنون کی پشت پناہی، ایسے صفات ہیں جن کا کوئی انصاف پسند انکار نہیں کرسکتا۔ سلطان نے مشاہیرِ وقت کے حق میں وہ فیاضیاں کیں کہ دار السلطنت غزنی اصحابِ علم وفضل کا مرجع بن گیا۔ جس طرح سلطان محمود دولت فراہم کرنے میں مستعد تھے، اسی طرح اس کے خرچ کرنے کا بھی اُن کو پورا سلیقہ تھا۔ ان کے چاروں اوّلیں جانشین بھی علوم وفنون کے سرپرست تھے۔ یہ پانچوں بہترین حکمران ہونے کے باعث اپنی رعایا کے بڑے محبوب تھے۔ کیا ان پانچوں کے مقابلہ میں ولیم اوّل اور اس کے جانشینوں میں بھی اس قسم کی کوئی خوبی اور اخلاقی پاکیزگی دکھائی جاسکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔

جب بارھویں صدی میں لوئیس ہفتم شاہ فرانس شہر ویٹری پر قابض و دخیل ہوا تو اس نے فوج کو حکم دیا کہ شہر کو نذرِ آتش کردیا جائے۔ اس غیر انسانی حکم کا انجام یہ ہوا کہ تیرہ سو انسان آگ کے شعلوں میں جل کر راکھ ہوگئے۔ انہی ایام میں انگلستان کے اندر خانہ جنگی کی آگ اس شدت سے شعلہ زن تھی کہ آلاتِ زراعت تک ضائع ہوگئے اور زمین بلا کاشت رہ گئی۔ اسی طرح چودھویں صدی عیسوی میں فرانس کے اندر محاربات کا جو سلسلہ چھڑا، اس سے وہ تباہی آئی جو کسی ملک اور کسی زمانہ میں کسی کے مشاہدہ میں نہ آئی ہوگی۔

انگلستان اور اسلامی ہند کے نظام حکومت کا مقابلہ

مسٹر جون ڈیون پورٹ لکھتے ہیں کہ مسلمان فاتحین کی انتہائی خیر اندیشی اور شفقت مآبی کے جو زبردست ثبوت اور قوی دلائل ملتے ہیں، ان کے مقابلہ میں ان کے ظلم وبے انصافی کے بیانات سخت ناقابل التفات ہیں۔ البتہ ان کے ہم عصر عیسائی فاتحین کی جفاکاریوں اور ظلم رانیوں کی شہادتیں اس کثرت سے موجود ہیں کہ جن سے انکار کرسکنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ کیا کوئی ہے جو اُن کے جور وبے داد کے مقابلہ میں ان کی کوئی نیکیاں اور شفقتیں بھی پیش کرسکے؟ ہرگز نہیں۔

اس کے بعد مسٹر ڈیون پورٹ نے سلطان فیروز شاہ تغلق، بابر بادشاہ، نصیر الدین ہمایوں، شیر شاہ، اکبر شاہ، نور الدین جہانگیر، شہاب الدین شاہ جہاں وغیرہ سلاطین ہند کی رعایا پروری،

فیض رسانی، معدلت گستری اور رفاہِ خلق کے واقعات درج کر کے ان کو تمام ہم عصر مسیحی تاجداروں پر فوقیت دی ہے اور لکھا ہے کہ جن ایام میں ہندوستان مسلم سلاطینِ ہند کے زیرِ حکومت شاہراہِ ترقی کی منزلیں طے کر رہا تھا، اُن دنوں سارے انگلستان میں آب پاشی کے لئے ایک نہر بھی کہیں دکھائی نہ دیتی تھی۔ چند سڑکوں کے سوا باقی تمام گزرگاہیں محض پیدل چلنے کی پگڈنڈیاں تھیں۔ پانی کی بہم رسانی یا پولیس کی حفاظت کے اعتبار سے ہمارے انگلستان کے بڑے سے بڑے شہر بھی سلطنت دہلی کے ادنیٰ ادنیٰ قصبوں کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ اُن ایام میں کسی انگریز مسافر کو جو لندن سے ہائی گیٹ جانے کا قصد کرتا تھا، اپنی منزلِ مقصود پر خیر و عافیت سے پہنچ جانے کا اتنا وثوق نہ تھا، جتنا کہ پنجاب کی سرحد سے دہلی یا دہلی سے الہ آباد جانے والے مسافروں کو اپنے صحیح وسلامت پہنچنے کا یقین ہوتا تھا۔

عہدِ اسلامی میں سفر کی سہولتیں

مسٹر جون ڈیون پورٹ نے موقع کی رعایت سے مسٹر ہالویل نام ایک انگریز کا بیان درج کیا ہے جو بہت مدت تک اسلامی ہندوستان میں رہ چکے تھے۔

مسٹر ہالویل کا بیان ہے کہ سرزمینِ ہند میں لوگوں کی جان و مال اور عزت ہر طرح سے محفوظ ہے۔ چوریوں یا ڈاکوں کا کبھی ذکر تک نہیں آسکا۔ مسافر خواہ تن تنہا سفر کر رہا ہو یا مالِ تجارت ساتھ رکھتا ہو، براہِ راست حکومت کی نگرانی میں ہوتا ہے۔ مسافروں کو ایک سے دوسری منزل تک پہنچانے کے لئے سرکاری محافظ بلا اجرت مہیا کئے جاتے ہیں۔ جب مسافر دوسری منزل پر پہنچ جاتا ہے تو پہلی منزل کے محافظ اس کو دوسری منزل کے نگران کے سپرد کرتے ہیں۔ نگران مسافر کا بیان لے کر پہلی منزل کے محافظوں کو رسید لکھ دیتا ہے کہ مسافر امن و عافیت کے ساتھ پہنچ گیا۔ جب یہ محافظ رسید لے کر اپنی چوکی پر واپس آتے ہیں تو پہلی منزل کا داروغہ اس رسید کو درج رجسٹر کر کے اس کی رپورٹ حاکم مجاز کے پاس بھیج دیتا ہے۔ مسافر اسی کامیاب نگرانی و محافظت کے ساتھ اطراف و اکنافِ ملک میں سفر کرتا ہے۔

اگر مسافر اسی طرح منزل بہ منزل سفر کرتا جائے تو اُسے اپنی خوراک اور قیام پر یا اسباب

یا مالِ تجارت کے اٹھالے جانے پر کچھ خرچ نہیں کرنا پڑتا۔ لیکن اگر وہ پڑاؤ پر تین دن سے زیادہ مدت ٹھہرنا چاہے تو زائد مدت کا خرچ خوراک اپنی گرہ سے خرچ کرتا ہے بشرطیکہ بیمار نہ پڑ گیا ہو یا کوئی اور ناگزیر حادثہ پیش آگیا ہو۔ اگر کسی علاقے میں مسافر کی کوئی چیز مثلاً زرِ نقد کی تھیلی یا کوئی اور قیمتی چیز گم ہو جائے تو اس کے پانے والا شخص اُس کو اگلے درخت پر لٹکا دیتا ہے اور قریب کی چوکی میں اس کی اطلاع دیتا ہے۔ جب چوکی کے نگراں کو اس کی اطلاع ملتی ہے تو وہ فوراً قرب وجوار کے تمام مقامات میں اس کی منادی کرا تا ہے۔

سلاطین ہند کے انگریز معاصرین کی اخلاقی پستی

اس کے بعد مسٹر ڈیون پورٹ لکھتے ہیں:۔ اب ہمیں اس کے مقابلہ میں یہ دیکھنا ہے کہ متذکرہ صدر مسلم سلاطینِ ہند کے عہد ہائے سلطنت میں اُن کے ہم عصر مسیحی فرمانرواؤں اور "روشن خیال" انگلستان کی اخلاقی حالت کیا تھی۔ بلاحظہ ہو۔

سنہ ۱۳۸۱ء وٹ ٹائلر کی شورش۔ اس آتشِ فتنہ کے منطفی ہونے کے بعد جو شورش پسند اشخاص تختہ دار پر چڑھائے گئے، اُن کی تعداد ڈیڑھ سو سے کم نہیں تھی۔ ان میں اکثر ایسے تھے جن پر مقدمہ نہیں چلایا گیا تھا۔

سنہ ۱۳۹۴ء وکلف نام ایک مصلح کے پیروں کو بُری طرح ستایا گیا اور طرح طرح سے دُکھ دیئے گئے۔

سنہ ۱۳۹۸ء شاہ رچرڈ ثانی کی ظالمانہ سلطنت۔ سنہ ۱۳۶۷ء کے ایک قانون پر آئرلینڈ میں بغاوت۔ اس قانون کے رُو سے کسی انگریز آباد کار کا آئرلینڈ کے کسی باشندہ سے رشتہ مصاہرت قائم کرنا سخت غداری قرار دیا گیا۔ اہلِ آئرلینڈ کا سالباس پہننے اور ان کی وضع قطع اختیار کرنے کی سزا ضبطی جائداد یا قید تجویز ہوئی۔ آئرلینڈ والوں کو اپنی خانقاہوں میں لانے یا ان کے گویّوں اور قوّالوں کو مدعو کرنا جرم قرار دیا گیا۔

سنہ ۱۳۹۹ء بولنگبروک نے رچرڈ دوم شاہ انگلستان کو تاج و تخت سے علیحدہ کر کے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا اور خود ہنری چہارم کے لقب سے شاہ انگلستان بن بیٹھا۔ اس نے تخت کے دونوں جائز وارثوں کو ونڈسر کے قصرِ شاہی میں قید کر دیا۔

۱۴۱۰ء۔ جون باڈبی نام ایک انگریز جنٹلمین بدعت و الحاد کے الزام میں سمتھ فیلڈ کے مقام پر زندہ جلادیا گیا۔

۱۴۱۳ء الحاد کی بیخ کنی کے لئے قانون وضع کیا گیا۔

۱۴۱۵ء جون کلیڈن اور رچرڈ ٹرمن بدعت و الحاد کی پاداش میں بمقام سمتھ فیلڈ نذرِ آتش کیے گئے۔

۱۴۴۱ء بہت سے لوگ جادو گری کے الزام میں گرفتار ہوئے۔ انھیں مختلف قسم کی سزائیں دی گئیں جن میں سے ایک شخص مارگری جورڈین آگ میں زندہ جلایا گیا۔ ڈچس گلوسیسٹر کو اسی الزام میں عبور دریائے شور کی سزا دی گئی۔ بولنگ بروک کو تختۂ دار پر لٹکایا گیا۔

۱۴۵۵ء انگلستان میں خانہ جنگی شروع ہوئی جو ۱۴۸۵ء تک یعنی تیس سال تک جاری رہی۔ اس لڑائی میں شاہی خاندان کے بارہ شاہزادے، طبقۂ امراء کے دوسو افراد اور تعلیم یافتہ اور شریف خاندانوں اور عوام الناس میں سے کئی لاکھ آدمی مارے گئے۔ قریب قریب سارا انگلستان ویران ہوگیا اور امارت کی شان وہاں سے مٹ گئی۔

۱۴۷۶ء ساحروں کو گرفتار کر کے موت کے گھاٹ اتارا گیا۔

۱۴۸۳ء رچرڈ سوم نے تختِ انگلستان پر غاصبانہ قبضہ جمالیا۔ اور اپنے بھتیجوں شاہ ایڈورڈ پنجم اور ڈیوک آوف یارک کو لندن کے شاہی قیدخانہ میں مروا ڈالا۔ لارڈ رورز اور دوسرے مقتدر لوگوں کو پومفرٹ کے قصر میں قتل کرا دیا۔

۱۴۸۵ء ہنری ہفتم تخت نشین ہوا۔ اس نے استحصال بالجبر کا شیوہ اختیار کیا۔ لوگوں کی جائدادیں ضبط کر کے بڑی دولت جمع کر لی جس کی بدولت وہ پارلیمنٹ کی امداد کے بغیر حکومت کرنے کے قابل ہوگیا۔ اُس نے ایک قسم کا ظالمانہ ٹیکس جو پہلے منسوخ ہوچکا تھا، پھر لگا دیا۔

۱۵۰۹ء ہنری ہشتم انگلستان کے تخت سلطنت پر بیٹھا۔ یہ بڑا موذی اور جلاد حکمراں تھا۔ اکثر فخر سے کہا کرتا تھا کہ میں نے غصہ کے وقت کسی مرد کو اور نفسانی خواہش کے وقت کسی عورت کو کبھی نہیں چھوڑا۔

۱۵۳۲ء ایک شخص کو زہر خورانی کے الزام میں اُبلتے پانی میں ڈال کر ہلاک کرایا گیا۔

۱۵۳۴ء دو آدمی سمتھ فیلڈ کے مقام پر الحاد کے الزام میں زندہ جلائے گئے۔

۱۵۳۸ء دو پادری بدعت کے الزام میں شعلوں کی نذر کئے گئے۔

۱۵۳۹ء مقامات ریڈنگ، گلاسٹن بری اور کول چیسٹر کے سجادہ نشینوں نے شاہ ہنری کے افسر پادریاں ہونے سے انکار کیا، اس لئے انھیں پھانسی دی گئی اور ان کے ہاتھ پیر کاٹے گئے۔ سکاٹلینڈ میں بہت سے آدمی جو مسیحیت میں اصلاح و ترمیم چاہتے تھے سزایاب ہوئے۔ سات پادریوں کو آگ کے شعلوں میں ڈال کر موت سے ہمکنار کیا گیا۔ انگلستان اور ویلز میں تمام مذہبی ادارے بند کر دئے گئے۔ یہ ادارے ۶۴۳ صومعوں، ۹۰ کالجوں، ۲۳۷۴ گرجوں اور ۱۰۰ ہسپتالوں پر مشتمل تھے۔ اس کی وجہ سے ہزارہا مخلوق جس کی روزی کا وسیلہ یہی ادارے تھے تباہ ہو گئی۔

۱۵۴۰ء بادشاہ نے بڑے بڑے نائٹوں کی جائدادیں ضبط کر لیں۔

۱۵۴۱ء سالسبری کی ایک نہایت معزز خاتون مارگیرٹ نام شاہ ہنری ہشتم کے حکم سے قتل کی گئی یہ جارج ڈیوک آوف کلارنس کی بیٹی تھی۔ اس نے پھانسی کے تختہ پر سر رکھنے سے انکار کر دیا اور بولی جب مجھے اپنا کوئی قصور ہی معلوم نہیں ہے تو میں مجرموں کی طرح مرنا نہیں چاہتی۔ جب جلاد نے اس کی گردن اڑانے کا قصد کیا تو وہ عالم اضطراب و سراسیمگی میں پھانسی کے تختہ کے ارد گرد دوڑ دوڑ کر جان بچانے کی کوشش کرنے لگی۔ جلاد اس کا تعاقب کرتا اور اسے ضربیں لگاتا ہوا۔ آخر جلاد اس

جرم نا آشنا کا سر تن سے جدا کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

۱۵۴۷ء شاہ ہنری نے چھٹی شادی کیتھرن پارے کی جو اس کی موت کے بعد تک زندہ رہی۔

۱۵۴۶ء اینے ایسکیو نام ایک عورت الحاد کے الزام میں قتل کی گئی۔ اسی کے ساتھ تین مرد بھی آگ میں زندہ جلا دیے گئے۔

۱۵۴۹ء دریوزہ گری اور تباہ حالی تمام انگلستان میں پھیل گئی۔ ہر طرف بھیک منگے دکھائی دیتے تھے۔ نہایت تشدد آمیز قوانین نافذ ہوئے۔ ججوں کو اختیار دیا گیا کہ بے کاروں اور آوارہ گردوں کے جسم میں حرف وی (V) کا نشان لگائیں۔ اور جو کوئی کسی عدالت میں کسی آوارہ گرد کی اطلاع دے، عدالت دو سال کے لئے اس آوارہ گرد کو اس کی غلامی میں دے دے۔ اس سال نارفوک میں ہیبت ناک بغاوت پھوٹ پڑی۔

۱۵۵۳ء ملکہ میری تخت نشین ہوئی۔ اس نے عیسائیوں کے پوپری فرقہ کو از سر نو رائج کیا اور تقویت دی۔

۱۵۵۴ء لیڈی جین گرے اور لارڈ گلڈ فورڈ کو پھانسی دی گئی۔

۱۵۵۵ء ملکہ میری نے پروٹسٹنٹ عیسائیوں پر ظلم توڑے۔ اوکسفورڈ میں رڈلے اور لاٹیمر نام دو پادری ملحد قرار دے کر زندہ آگ میں جلائے گئے۔ تمام قید خانے ایسے ملحدوں سے بھر گئے۔

۱۵۵۸ء ملکہ میری طعمۂ اجل ہوئی۔ اس کی صرف پنج سالہ مدتِ حکمرانی میں دو سو پچاسی آدمی آگ میں زندہ جلائے گئے۔ اس تعداد میں پانچ بشپ (لارڈ پادری)، اکیس[۲۱] عام پادری، چھپن عورتیں اور چار بچے بھی داخل تھے۔ علاوہ ازیں ہزارہا آدمیوں نے طرح طرح کے جانی اور مالی نقصان اٹھائے۔ میری کے بعد ملکہ الزبتھ انگلستان کے تختِ حکومت پر بیٹھی۔ پوپ کو دعویٰ تھا کہ مجھے مذہباً اس بات کا اختیار حاصل ہے کہ ملکہ کو تخت سے اتار دوں۔ اور ملکہ اس اختیار کو تسلیم نہ کرتی تھی۔ چونکہ انگلستان

کے بہت سے پادریوں نے پوپ کے اس دعوے کی صحت سے انکار نہ کیا، اس لئے ملکہ نے ان پر بڑے بڑے ظلم ڈھائے اور بہتوں کو آگ میں جلا دیا۔

۱۵۸۶ء سکاٹس کی ملکہ میری پر اس الزام میں مقدمہ چلایا گیا کہ اس نے ملکہ الزبتھ کے خلاف سازش میں حصہ لیا۔ میری نہایت خوش جمال عورت تھی لیکن ہشت سالہ قید و بند کے مصائب نے اسے بالکل زرد فام اپاہج بنا دیا۔

۱۵۸۷ء سکاٹس کی ملکہ میری کی گردن مار دی گئی۔

۱۵۸۸ء آئرلینڈ کے پادریوں پر نہایت خوفناک سختیاں کی گئیں۔

۱۶۰۱ء کوئین الزبتھ مری اور جیمز اول جو سکاٹس کی ملکہ میری مقتولہ کا بیٹا تھا اس کا جانشین ہوا اس نے اعلان کیا کہ مذہبی امور میں کسی سے نرمی اور رواداری نہ برتی جائے گی۔ اس بنا پر پیوریٹن فرقہ کے عیسائی انگلستان سے ہجرت کر کے امریکہ چلے گئے۔ جیمز اول کے عہدِ حکومت میں صرف برطانیہ کے اندر تین ہزار ایک سو بانوے آدمی جادوگری کے الزام میں ہلاک کئے گئے۔ ان لوگوں میں جو اس طرح مارے گئے دو بیوائیں بھی تھیں جنھیں چیف جسٹس ہیل نے ان کے دشمنوں کے محض اس بیان پر پھانسی لٹوا دی کہ انھوں نے تین بچوں پر جادو کر دیا ہے۔

۱۶۰۴ء جیمز نے کوشش کی کہ سکاٹلینڈ میں تثلیث پرستی کو دبائے اور بالکل معدوم کر دے اس سلسلہ میں دس لیڈر قید کر دئے گئے۔ تین سو پادری جلاوطن کئے گئے۔ اس کے بعد بہت سی گرفتاریاں ہوئیں۔ جادوگری کے خلاف قانون وضع ہوا۔

۱۶۲۵ء چارلس اول تخت نشین ہوا۔

۱۶۲۹ء پرائن نام ایک بیرسٹر نے ایک رسالہ شائع کیا جس میں شاہی درباریوں پر کچھ نکتہ چینی کی گئی تھی۔ اس جرم میں وہ بیرسٹری سے برطرف کر دیا گیا۔ اور صرف یہ سزا کافی نہ سمجھی گئی بلکہ حکم ہوا کہ وہ یکے بعد دیگرے دو مقامات ویسٹ منسٹر اور چیپ سائڈ میں لے جاکر

اُس شکنجہ میں داخل کیا جائے جس میں مجرم کا سر اور ہاتھ ڈال کر عذاب دیتے تھے۔ اور دونوں مقامات پر اس کا ایک ایک کان کاٹا جائے۔ مزید برآں پانچ ہزار پونڈ جرمانہ بادشاہ کو ادا کرے اور حبسِ دوام کی سزا پائے۔ اسی طرح کرنیل للبرن پر ایک باغیانہ رسالہ تالیف کرنے کا الزام لگایا گیا۔ حکم دیا گیا کہ اس کے کوڑے لگا کر اسے شکنجہ میں بند کریں اور پھر وہاں سے نکال کر قید خانہ میں ڈال دیں۔ جب کرنیل للبرن پر کوڑے پڑ رہے تھے تو وہ عالم بدحواسی میں زور سے چلّایا۔ "اے خلقِ خدا دیکھو! حکومت کتنا ظلم کر رہی ہے۔" یہ دیکھ کر سٹار چیمبر کے ججوں نے حکم دیا کہ اس کے منہ میں گوڈر ٹھونس دیا جائے تاکہ فریاد نہ کر سکے۔ لنکولن کے فاضل جج ولیمز کے مواعظ یہاں تک مقبول ہوئے کہ کینٹربری کے آرچ بشپ کے دل میں اس کی طرف سے حسد پیدا ہوا۔ چناں چہ آرچ بشپ نے جس کا نام لاڈ تھا، اس کو ذلیل کرانے کا تہیہ کر لیا۔ چناں چہ ایک بہتان تراش کر اس کو نہ صرف فرض منصبی سے سبک دوش کرا دیا بلکہ اس کو دس ہزار پونڈ جرمانہ کرا کر اتنے زمانہ تک کے لئے شاہی قلعہ میں قید کرا دیا جب تک شاہ رچرڈ اول اس کی قید کو پسند کرے۔ اور انہی چیرہ دستیوں پر اکتفا نہ کیا گیا بلکہ اس کی تمام کتابوں اور فرنیچر کو بھی ضبط کر لیا گیا۔ اس کے مکان کی تلاشی لیتے وقت چند چٹھیاں برآمد ہوئیں جو اوبل ڈسٹون نام کسی سکول ماسٹر نے اس کے نام بھیجی تھیں، اس لئے آٹھ ہزار پونڈ مزید جرمانہ عائد کر دیا گیا۔ سکول ماسٹر کے لئے حکم ہوا کہ پانچ ہزار پونڈ جرمانہ ادا کرے اور سکول کے سامنے اس کے کان اس مشین میں داخل کر کے ان میں کیلیں ٹھونکی جائیں۔ جس میں مجرموں کے اعضا داخل کر کے سزا دی جاتی تھی۔

۱۶۴۱ء آئرلینڈ میں بغاوت پھوٹ پڑی۔ رومن کیتھولک مذہب کے عیسائیوں نے پروٹسٹنٹ فرقہ کے چالیس ہزار عیسائی تہ تیغ کر دیے۔

۱۶۴۲ء انگلستان میں پھر خانہ جنگی شروع ہوئی۔

۱۶۴۹ء انگلستان کی رعایا اپنے بادشاہ چارلس اوّل کی ظلم رانیوں اور بدکرداریوں سے تنگ آکر اُس کی دشمن ہوگئی۔ چناں چہ گرفتار کرکے اُس پر مقدّمہ چلایا گیا۔ جب یہاں اس پر مردم آزاری، غدّاری، خون آشامی و سفاکی اور اپنے ملک کی بدخواہی کے جرم ثابت ہوئے۔ اس لئے اس کی گردن ماردی گئی۔ اس کے قتل پر جمہوری حکومت کا اعلان کیا گیا۔

۱۶۵۶ء کروم ویل نے لارڈ پروٹیکٹر کی حیثیت سے عنانِ حکومت سنبھالی۔ اس کے عہدِ حکومت میں ظلم و تشدّد کا دور دورہ رہا۔ لوگ مقدّمہ چلائے بغیر پھانسی کے تختے پر لٹکادئے جاتے تھے بے شمار اسیرانِ جنگ اور انگلستان کے پچاس شرفار جو کروم ویل کی حکومت سے ناخوش تھے بار باڈوز کو جلاوطن کردئے گئے اور حکم ہوا کہ وہاں پہنچنے کے بعد سب کے سب غلاموں کی حیثیت سے فروخت کردئے جائیں۔ انگلستان فوجی اضلاع میں تقسیم ہوا۔ ہر ضلع ایک میجر جنرل کے ماتحت کیا گیا۔ ان میجر جنرلوں کو اختیار دیا گیا کہ خطرناک قسم کے افراد اور مشتبہ لوگوں کو گرفتار کرکے زندانِ بلا میں ڈال دیں۔ غرض اہلِ انگلستان قرنوں تک انہی خوف ناک بدنظمیوں اور روح فرسا مظالم کے چنگل میں گرفتار رہے۔ حالاں کہ اسلامی ہند کے باشندے ہمیشہ امن و عافیت کی زندگی بسر کررہے تھے۔ اس تقابل سے جو اوپر دکھایا گیا صاف نظر آتا ہے کہ ہندوستان کے ادنیٰ سے ادنیٰ مسلم تاجدار بھی اخلاقی نقطۂ نظر سے انگلستان کے بہتر سے بہتر تاج داروں پر فوقیت رکھتے تھے با ایں ہمہ جس انگریز نے بھی ہندوستان کی تاریخ لکھی اس نے مسلم سلاطین کو نہایت بھیانک شکل میں پیش کرکے دیانت و انصاف کا بہت بُری طرح گلا گھونٹا لیکن خدا بھلا کرے مسٹر ڈیون پورٹ کا جنھوں نے اظہارِ حقیقت کرکے اس طلسم کا پردہ چاک کردیا۔

انگریز مورخوں کا فسادِ نیت

مسٹر ڈیون پورٹ لکھتے ہیں کہ انگریز مورخوں نے ہندوستان کی جو تاریخ بھی لکھی ہے، اُس میں مسلمان حکمرانوں کی سخت مذمت کی ہے۔ اگر ان مورخوں کی نیت میں فساد نہ ہوتا تو وہ ہندوستان پر مسلمانوں کی فتوحات کا نارمنوں کی فتح سے مقابلہ کرتے جو اسی زمانہ میں انھیں انگلستان پر حاصل ہوتی تھی۔ اسی طرح سلاطینِ اسلام کے عادات وخصائل کا اُن کے ہم عصر شاہانِ یورپ کے اخلاق سے موازنہ کرتے اور اُن لڑائیوں کو جو ہندوستان میں چودھویں صدی عیسوی میں ہوئیں، ہماری فرانسیسی لڑائیوں یا صلیبی جنگوں سے مقابلہ کرتے اور اسلامی فتوحات کے اثر کا جو ہنود کے دل ودماغ اور اخلاق پر ہوا۔ نارمنوں کی فتح کے اس اثر سے مقابلہ کرتے جو انھوں نے مفتوح انگریزوں کے اخلاق پر ڈالا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ انگلستان کا باشندہ ہونا عیب میں داخل اور سخت عار سمجھا جاتا تھا اور حرام کاری کی اتنی بہتات تھی کہ ایک رات ایک شہزادی کو اپنے حفظِ عصمت وناموس کے لئے فقیری لباس پہننا پڑا تھا۔ ان ایام میں سرزمین انگلستان پر ہر طرف ظلم وبیداد کی حکومت تھی اور خلقِ خدا کے حفظ وامن کی باگ ڈور ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں تھی جو رعایا کے حق میں درندوں سے بڑھے ہوئے تھے۔ (اپالوجی فار محمد اینڈ دی قرآن ص ۹۸ مطبوعہ لاہور ص ۷۲)

ہندوستان میں انگریزی حکومت کا عہدِ ظلمت

مسٹر ڈیون پورٹ نے جس طرح مسلم سلاطینِ ہند کے اخلاقِ حمیدہ کا انگریز فرمانرواؤں کے چال چلن سے مقابلہ کیا ہے، اسی طرح ہندوستان کی انگریزی عمل داری پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ چناں چہ لکھتے ہیں:-

اَب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہندوستان میں حصولِ اقتدار کے بعد ہم انگریزوں کا اپنا رویہ اور چلن کس قسم کا تھا جب انگریزوں نے میر قاسم کو حکومتِ بنگال سے برطرف کر دیا تو اس کے بعد بنگال کو جس تباہی اور بربادی کا سامنا کرنا پڑا، اس کی کیفیت کلائیو کے لفظوں میں سنئے۔ وہ لکھتا ہے کہ میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ ایسی بدنظمی اور رشوت ستانی

اور ظلم رانی کسی ملک میں دیکھی یا سنی نہ گئی ہو گی جو بنگال میں رونما ہوئی۔ بنگال، بہار اور اڑیسہ کی مال گذاری ۳۰ لاکھ پونڈ تھی۔ لیکن جب سے میر جعفر کو صوبہ داری واپس ملی ہے بنگال، بہار اور اڑیسہ براہِ راست ملازمین کمپنی کے زیر اہتمام ہیں۔ ان تینوں صوبوں میں ملکی اور فوجی دونوں محکموں نے نواب سے لے کر نہایت ادنیٰ درجہ کے زمیندار تک ہر شخص پر چوتھ مقرر کر رکھی ہے جو ہر ایک سے جبراً وصول کی جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بنگال کے اکناف و اطراف میں قحط، گرانی اور تنگیٔ معاش کا دور دورہ ہے۔

لارڈ کارنوالس گورنر جنرل نے بنگالہ کے متعلق لکھا کہ مجھے یہ بیان کرتے ہوئے سخت تکلیف ہوتی ہے کہ اس ملک کی تجارت اور زراعت رفتہ رفتہ زوال پذیر ہے۔ بنیوں کی قوم کے سوا تمام باشندے مفلس ہوتے جاتے ہیں۔ ہماری بد انتظامی کی وجہ سے صرف ہماری رعایا کو نقصان نہیں پہنچا، بلکہ راجاؤں کی عمل داری میں بھی یہ خرابی پھیل گئی ہے۔ جب سے نوابِ اودھ سے ہمارا ارتباط ہوا ہے، اُس کا ملک بھی ایک بے جان لاش بن کر رہ گیا ہے۔

لارڈ ہیسٹنگز گورنر جنرل نے اپنے عہد حکومت میں لکھا کہ ہماری دست اندازیوں اور بے باکیوں کی وجہ سے تمام ہندستانی سرکاریں ہم سے ایسی ہی خوف زدہ ہیں جیسی کہ ہماری فوج سے خائف ہیں۔ ہر ہندوستانی ہم سے خط و کتابت کرنا خطرناک سمجھتا ہے کیوں کہ ہندستانی دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں سے ہم نے دوستی کی وہی تباہ و برباد ہوئے۔ اس کا بڑا باعث ہمارے اودھ کے معاملات ہیں۔ مسٹر بل مورخ کا قول ہے کہ اس سے پیشتر ملک اودھ بام ترقی پر پہنچا ہوا تھا اور اس کی سالانہ آمدنی تین کروڑ روپیہ سالانہ تھی۔ لیکن جب ہم نے نواب اودھ کی قلم رو میں کچھ انگریز افسر اور فوج مقرر کی تو نواب عرصۂ قلیل قلاش ہو گیا اور عسرت کے عالم میں بسر اوقات کرنے لگا اور اس کے چند ہی سال بعد اسے احساس ہوا کہ اودھ کے محاصل پہلے سے نصف رہ گئے ہیں۔ کمپنی کے ملازموں نے نو سال میں ۴۳ لاکھ روپے

فی سال نواب سے بجبر وصول کئے۔

لارڈ ہیسٹنگز گورنر جنرل نے لکھا کہ ہزارہا افراد کمپنی کے ملکی اور فوجی نوکروں کی تنخواہوں، پنشنوں اور رشوتوں کی وجہ سے مفلس ہو گئے ہیں اور نواب کے خزانہ میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ ہمارے نوکروں کو بھی راضی کرے اور اپنے نوکروں کو بھی تنخواہ دے۔ اکثر لوگوں کے نزدیک یہ امر بیجا ٹھیرے گا کہ ہم نے نواب کی حفاظت کے لئے ایسی فوج بھیجی ہے جس کی تنخواہ دینے کا اُسے مقدور نہیں اور نہ اُسے اس فوج کی کوئی حاجت ہے۔

ہیسٹنگز کے بعد لارڈ کارنوالس نے اس سے بھی زیادہ فوج نواب پر مسلط کر دی۔ ہر چند نواب نے التجائیں کیں لیکن کوئی اثر نہ ہوا۔ اس کے بعد سر جون شور نے نواب سے مالی امداد طلب کی اور رفتہ رفتہ پچیس ۲۵ لاکھ روپیہ سالانہ سے ستر لاکھ سالانہ تک نوبت پہنچا دی۔

اس کے بعد لارڈ ولزلی گورنر جنرل نے ۱۸۰۱ء میں نواب کو دھمکی دی کہ ہم تم سے تمہارا سارا ملک چھین لیں گے اور نواب سے اُس کا نصف ملک جس کی آمدنی ایک کروڑ تیس لاکھ روپے سالانہ تھی، اُس ستر لاکھ کے عوض میں لے لیا جو کمپنی نے نواب پر تاوان عائد کیا تھا۔ مگر ہماری ظلم آرائی اور زرطلبی اب بھی موقوف نہ ہوئی۔ ۱۸۱۵ء اور ۱۸۲۵ء کے درمیان ہم نے نواب سے چالیس لاکھ روپے سے کچھ زیادہ رقم بطور قرض لی۔

لارڈ ہیسٹنگ گورنر جنرل کا بیان ہے کہ یہ روپیہ ہم نے نواب سے قرض نہیں لیا تھا بلکہ اپنی طاقت کا رعب ڈال کر وصول کیا تھا اور اس کے عوض میں نواب کو بادشاہی کا خالی لقب اور تھوڑا سا غیر آباد علاقہ جو بیابان سے بہتر نہ ہوگا دے دیا۔ اس کے بعد لارڈ ڈلہوزی نے ۱۸۳۷ء میں عہد نامہ کو توڑ ڈالا اور اودھ کی سرزمین نواب سے چھین لی۔ اس ملک پر صرف اس دلیل سے قبضہ کیا گیا کہ یہ خطہ بہت اچھے موقع پر ہندوستان کے وسط میں واقع ہے اور بہت زرخیز ہے۔

انگریز کسی عہد و پیماں کا پابند نہیں

مسٹر ڈیون پورٹ لکھتے ہیں کہ نظام حیدر آباد کی مملکت

ہمارے مقبوضات کے شمال میں واقع تھی نظام نے کمپنی کے چند اضلاع سپرد کرکے ان کا
سالانہ خراج لینا ٹھیرالیا۔ مگر ہم نے خراج نہ دیا۔ اس بدمعاملگی کو دیکھ کر نظام دکن نے کہنا شروع کیا
کہ انگریز ایسی قوم ہے جو نہ کسی عہد وپیماں کی پابند ہے اور نہ اسے انصاف و دیانت سے کچھ
سروکار ہے۔ اس کے بعد نظام نے حیدر علی کو ہمارے خلاف رزم خواہ ہونے کے لئے بلا بھیجا
اور کہا کہ جب تک ہندوستان میں انگریزوں کے پاس ایک انچ زمین بھی رہے گی کوئی
ہندوستانی امن سے نہیں رہ سکے گا (اپالوجی فار محمد اینڈ دی قرآن مطبوعہ لندن ص ۱۱۴۔
۱۱۹)۔

ریاستیں ضبط کرنے کی عیارانہ چال انگریز مورخوں کی تواریخ ہند میں بے شمار ایسے بیانات ہیں جو
یا تو سرے سے بالکل بے بنیاد ہیں یا ان کا بیشتر حصہ غیر صحیح ہے۔ حالاں کہ اگر یہ مورخ انصاف و
دیانت کی جبل متین کو ہاتھ سے نہ چھوڑتے تو انہیں صحیح وقائع نگاری کے ذرائع تمام دوسری
مغربی قوموں سے زیادہ میسّر تھے۔

مثال کے طور پر کلکتہ کی کال کوٹھری کو لیجئے۔ قریب قریب ہر انگریز مورخ نے اس
داستان کو بڑے طمطراق کے ساتھ بیان کیا ہے۔ حالاں کہ جس قدر زیادہ اس کو شہرت دی
گئی، اتنا ہی یہ زیادہ لغو اور بے بنیاد نکلی۔ سر جان کیئی (Sir J. Kaye) کتاب ہسٹری
اوف دی سپائی وار جلد سوم (History of the sepoy war vol. III)
میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ہم لوگوں کا یہ عام دستور رہا ہے کہ جب ہم کسی دیسی حکمراں کی ریاست
ضبط کرنے کا تہیہ کرتے ہیں تو پہلے اُس حاکم کو بدنام کرتے ہیں اور اس کے خلاف غلط افواہوں
کو شہرت دیتے ہیں۔ اس کے بعد بدنظمی کا الزام تراش کر اسے انگریزی عمل داری میں شامل کر لیتے ہیں۔

کلکتہ کی کالی کوٹھری بھی انگریز دروغ بافوں کا دماغی اختراع ہے جس کی کوئی اصلیت
نہیں۔ یہ قصہ محض اس لیے وضع کیا گیا تھا کہ نواب سراج الدولہ مرحوم کو ظالم وسفاک ثابت کرکے
اس حملہ کی کاغذی وجہ جواز بہم پہنچائی جائے جو بنگال کو انگریزی عمل داری میں شامل کرنے کے لئے
نواب پر کیا گیا تھا۔

غزل

از

جناب الم مظفرنگری

نیاز مندِ محبت سے وہ رمیدہ سہی — کبھی تو آئیں گے آخر بدل کشیدہ سہی

ہے میرا اشکِ ندامت حریفِ بحرِ کرم — تری نگاہ میں یک قطرۂ چکیدہ سہی

حریمِ عشق کے نالوں کا ہو سکی نہ جواب — صدائے دیر و حرم گرچہ برگزیدہ سہی

ہر انقلاب ہے نظمِ حیات کا ضامن — یہ چشم دیدہ حقیقت ہے گو شنیدہ سہی

مذاقِ درد کو سینے میں گرم رکھتی ہے — ہماری آہِ رسا آہِ نارسیدہ سہی

کسی کے عزمِ غلط کا بھی رکھ لیا پردہ — صداقت اپنی جگہ پیرہن دریدہ سہی

اڑے گی وقت پہ منزل کی سمت شبنم تر — بفرشِ سبزۂ گلستاں میں آرمیدہ سہی

ہجومِ لالہ و گل میں سکوتِ سرو کو دیکھ — نیاز مندِ گلستاں ہے سرکشیدہ سہی

کسی بہارِ گزشتہ کی یادگار تو ہے — ہمارا باغِ تمنا خزاں رسیدہ سہی

نہیں ہے کوئی بھی گھڑی شوق سے خالی — ہر اشکِ چشمِ وفا اشکِ ناچکیدہ سہی

نہ دیکھ اس کو حقارت سے پیرِ میخانہ — یہ جامِ جم تو ہے گو جامِ ناخریدہ سہی

دلِ تباہ کا یوں اپنے انتقام نہ لے — فغاں کو روک ذرا تو ستم رسیدہ سہی

یہ راز دار ہے ہر شورشِ جنوں کا الم

چمن میں دامنِ گل دامنِ دریدہ سہی

"زمزمۂ بہار"

از جناب کاشف راجپوری

نسیم شاخسار ہے، شمیم عطر بار ہے، ترنم ہزار ہے، بساط لالہ زار ہے
یہ رنگ ہے روش روش کہ خلد بھی نثار ہے
اب آمدِ بہار ہے، اب آمدِ بہار ہے

یہ جستجوئے آرزو، برس گئی ہے نمو، گلوں سے بھر لئے سبو، عروقِ بادہ کاخ و کو
یہ پردہ ہائے رنگ و بو میں حسن آشکار ہے
اب آمدِ بہار ہے، اب آمدِ بہار ہے

الٹ گئی ردائے گل، بہشت زیرِ پائے گل، گمانِ دل بجائے گل، بہشت زیرِ پائے گل
عنایتِ جمال سے نگاہ زیر بار ہے
اب آمدِ بہار ہے، اب آمدِ بہار ہے

محیط ابرِ قطرہ زن، چمن ہے جنتِ عدن، یہ نسترن وہ یاسمن یہ حاجبانِ انجمن
نظر گناہ گار ہے مستِ دل گناہ گار ہے
اب آمدِ بہار ہے، اب آمدِ بہار ہے

فروغِ میکدہ عجب، تمام مست و با ادب، نگاہ مہوشاں غضب نشاطِ شرح کا سبب
نگاہِ ساقیٔ چمن عجیب تازہ کار ہے
اب آمدِ بہار ہے، اب آمدِ بہار ہے

یہ کائنات کا سفر، یہ منزلیں یہ رہگذر، یہ رنگ و بو یہ بال و پر، یہ کارزار خیر و شر
بفیضِ عشق معتبر تمام کاروبار ہے
اب آمدِ بہار ہے، اب آمدِ بہار ہے

وہ دورِ شیشہ گر گیا، وغذرِ بال و پر گیا، وہ خواب کا اثر گیا، نہ پوچھ اب کدھر گیا
قدم بڑھا کہ زندگی کو تیرا انتظار ہے
اب آمدِ بہار ہے، اب آمدِ بہار ہے

شبِ سیاہ اب نہیں، بلائے راہ اب نہیں، غلط نگاہ اب نہیں، سوئے گناہ اب نہیں

مصائبِ سفر نہیں عطائے اختیار ہے

اب آمدِ بہار ہے، اب آمدِ بہار ہے

یہ کائناتِ زندگی، حوادثاتِ زندگی، تعیناتِ زندگی، بقدرِ ذاتِ زندگی

کشاکشِ حیات سے حیات کامگار ہے

اب آمدِ بہار ہے، اب آمدِ بہار ہے

یہ کہتری یہ بہتری، یہ بندگی یہ سروری، نظر فریبِ خود گری، رہے تری قلندری

بنائے کارِ زندگی اسی پہ استوار ہے

اب آمدِ بہار ہے، اب آمدِ بہار ہے

اسیرِ کیف و کم نہ رہ، مقیدِ الم نہ رہ، زباں دراز غم نہ رہ، شہود میں عدم نہ رہ

کہ "زمزمہ بہار" کا حیات کی پکار ہے

اب آمدِ بہار ہے، اب آمدِ بہار ہے

فروغِ گلستاں ہے تو، بہارِ جاوداں ہے تو، فلکِ ہم عناں ہے تو، امیرِ کارواں ہے تو

ثبات و ناثبات کا تجھی پہ اختیار ہے

اب آمدِ بہار ہے، اب آمدِ بہار ہے

اٹھا حجابِ تیرگی، غلط ہے خود سپردگی، بدل نظامِ زندگی، خودی ہی تیری خواجگی

نہ کر اطاعتِ جہاں جہاں غلط شعار ہے

اب آمدِ بہار ہے، اب آمدِ بہار ہے

نہ کر قبول قیدِ غم، نہ چھوڑ دامنِ کرم، نہ ہو اسیرِ موجِ یم، نظر اٹھا بڑھا قدم

ترا بلند حوصلہ نشانِ افتخار ہے

اب آمدِ بہار ہے، اب آمدِ بہار ہے

لوائے حق بلند کر، خودی کو ارجمند کر، جنوں کو نقش بند کر، خرد تہِ کمند کر

کرشمہ سازئ جنوں تجھی کو سازگار ہے

اب آمدِ بہار ہے، اب آمدِ بہار ہے

تبصرے

درود و سلام | از مولانا نور محمد صاحب مظاہری تقطیع خورد ضخامت ۲۷ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت ۱۰ ار پتہ: مکتبۂ نورانی کنز العلوم ٹانڈہ ضلع فیض آباد۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجنا ایک بہت بڑی نیکی ہے اور اس کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دیا ہے اور اس لئے دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ خود بھی اور تمام فرشتے آپ پر درود بھیجتے ہیں۔ اس رسالہ میں درود کے فضائل و برکات اور اس سلسلہ میں چند متعلقہ امور پر گفتگو کرکے مسلمانوں کو اس اہم کار خیر و فلاح کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ رسالہ عام مسلمان مردوں اور عورتوں کے مطالعہ کے لائق ہے۔

تکفیری افسانے | از مولانا نور محمد صاحب مظاہری تقطیع خورد ضخامت ۱۹۰ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد دو روپے مذکورہ بالا پتے سے ملے گی۔

بد قسمتی سے ہندوستان میں علما کا ایک طبقہ ایسا ہے جو مذہبی معاملہ ہو یا سیاسی۔ دینی ہو یا دنیوی کسی امر میں بھی اپنی مخالفت کا اظہار اس کے سوا اور کسی طریقہ سے کر ہی نہیں سکتا کہ اپنے مخالف کو کافر قرار دے۔ اس کو مرتد اور ملعون کہہ کر عذاب جہنم کا مستحق قرار دے۔ اس گروہ کے ناوک تکفیر کی ہمہ گیری کا یہ عالم ہے کہ اس کی زد سے نہ دیوبند بچا اور نہ ندوہ۔ نہ فرنگی محل محفوظ رہا اور نہ علی گڈھ۔ نہ نیشلسٹ مسلمان کو امان ملی نہ لیگی کو۔ اس کتاب میں اسی قسم کی تمام تحریروں کے اقتباسات یکجا کر دئے گئے ہیں۔ لیکن کتاب کا نام اگر تکفیری نشانے ہوتا تو زیادہ موزوں رہتا۔ بہرحال لائق مرتب کو معلوم ہونا چاہئے کہ صاحب کو دل نہ دینے پر خواہ کتنا ہی غرور ہو وہ ایسے غیرت مند کہاں ہیں کہ یہ کاغذی آئینہ دیکھ کر اپنا سا منہ لے کر رہ جائیں۔ جو لوگ اس خاص قسم کی مذہبی تحریروں کا ذوق رکھتے ہوں ان کو یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہیے۔

رسالہ نجاتیہ | تقطیع متوسط ضخامت ۵۶ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت ۱۲ ار

پٹنہ :۔ جمعیت اہل حدیث لاہور۔ مولانا محمد فاخر صاحب زائر الٰہ آبادی حضرت شاہ ولی اللہ الدہلوی کے معاصرین میں ایک صوفی مشرب جید عالم تھے۔ نواب صدیق حسن خان مرحوم نے اتحاف النبلاء میں ان کے متعلق لکھا ہے کہ "بعلم سبقت بر رسابقین می افراشت"۔ حدیث سے خاص لگاؤ رکھتے تھے اور مسلک کے اعتبار سے عدم تقلید کی طرف مائل تھے۔ موصوف نے عقائد سلف میں ایک مختصر رسالہ فارسی زبان میں لکھا تھا جس کو نواب صدیق حسن خاں صاحب نے اپنے اضافات کے ساتھ شائع کیا تھا۔ اب اسی رسالہ کا اردو ترجمہ مولانا محمد اسحاق صاحب لاہور نے کیا ہے۔ ترجمہ صاف و سلیس اور شگفتہ ہے اور کتاب میں ذات و صفات باری کے علاوہ بعض اور کلامی مسائل پر عالمانہ اور فاضلانہ گفتگو کی گئی ہے طلبائے علوم اسلامیہ کے مطالعہ کے لائق ہے۔

چچا چھکن کے کارنامے | از محترمہ قدسیہ زیدی تقطیع خورد ضخامت ۷۲ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ پتہ :۔ آزاد کتاب گھر کلاں محل دہلی۔

سید امتیاز علی تاج کے چچا چھکن سے اردو زبان و ادب کا کون صاحب ذوق بے خبر ہوگا ایک زمانے میں اس کی بڑی شہرت تھی۔ محترمہ قدسیہ بیگم نے اسی سلسلہ کی چار کہانیوں کو ڈراما دیا ہے جو اسکولوں اور کالجوں میں اسٹیج کئے جاسکتے ہیں۔

حج کیا ہے | از جناب سید حامد علی صاحب تقطیع خورد ضخامت ۹۶ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت ۸ پتہ :۔ مکتبہ جماعت اسلامی (ہند) رام پور (یوپی) اسلام کی ہر عبادت کا اصل مقصد تذکیہ نفس۔ تجلیہ باطن اور انابت الی اللہ ہے اور چوں کہ حج سب سے بڑی عبادت ہے اس بنا پر تذکیہ نفس بھی کامل درجہ کا ہونا چاہئے۔ اسی وجہ سے حدیث میں ہے کہ حج کرنے کے بعد ایک مسلمان ایسا ہی پاک صاف ہو جاتا ہے جیسا کہ ایک بچہ جو آج پیدا ہوا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ مسلمان عام طور پر اس عبادت کو بھی اس کی اصل معنوی روح سے خالی ہو کر ادا کر دیتے ہیں اور اس کا یہ نتیجہ ہے کہ کئی کئی حج کر لینے کے بعد

بھی ان کی عام زندگی میں کوئی بہتر انقلاب پیدا نہیں ہوتا۔ یہ کتاب حج کے اسی اصل مقصد اور اس کی غرض وغایت کی طرف متوجہ کرنے کے لئے لکھی گئی ہے۔ اس کے علاوہ آخر میں حج کے ارکان وآداب اور ان کے بجالانے کا بھی تذکرہ ہے۔ کتاب اس لائق ہے کہ ہر مسلمان اس کا مطالعہ کرے۔

(۱) سماجی بہبود۔ ضخامت ۵۰ صفحات قیمت چھ آنے۔

(۲) فلاحی ریاست کی جانب۔ ضخامت ۱۲ صفحات قیمت درج نہیں۔

(۳) دوسرا پنج سالہ پلان (خلاصہ) ۲۲۶ صفحات قیمت ایک روپیہ۔

(۴) صنعتی ترقی ضخامت ۴۴ صفحات قیمت دو آنے۔

(۵) خوراک اور زراعت۔ ضخامت ۴۴ صفحات قیمت دو آنے۔

(۶) رسل ورسائل۔ ضخامت ۴۴ صفحات قیمت دو آنے۔

(۷) نئے سماجی نظام کی جانب۔ ضخامت ۳۰ صفحات قیمت دو آنے۔

(۸) آب پاشی اور بجلی۔ ضخامت ۳۰ صفحات قیمت دو آنے۔

(۹) ہمارے پلان اور سوشلزم۔ ضخامت ۴۲ صفحات قیمت دو آنے۔

ناشر اور ملنے کا پتہ: پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن براڈکاسٹنگ گورنمنٹ آف انڈیا۔ اولڈ سکریٹریٹ۔ دہلی۔

مذکورہ بالا تمام کتابیں اور کتابچے حکومت ہند کے شعبہ اطلاعات ونشریات کی جانب سے شائع کئے گئے ہیں اور جیسا کہ ان کے ناموں سے ظاہر ہے۔ ان کا مقصد عوام کو حکومت کی ان تعمیری کوششوں سے واقفیت بہم پہنچانا ہے جو وہ پنج سالہ پلانوں کے نام سے ملک کی ترقی کے لئے کر رہی ہے۔ اس اعتبار سے یہ تمام مطبوعات نہ صرف کامیاب ہیں بلکہ ان کے مطالعہ سے قومی تعمیر کے مختلف گوشوں کے متعلق جو ٹھوس معلومات حاصل ہوئی ہیں ان کی بدولت یہ بہت زیادہ کارآمد بھی ہیں۔ یہ تمام مطبوعات، انگریزی سے ترجمہ کی گئی ہیں اس لئے یہ بات

خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے کہ ترجمہ بہت اچھا، سلیس اور عام فہم ہے اور اردو کی معمولی سی استعداد رکھنے والے بھی ان سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ طباعت عموماً روشن اور کاغذ اچھا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کتابت پر کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی۔ بحیثیت مجموعی ان کتابوں کا مطالعہ مفید ہے۔

مکمّل لغات القرآن

مع فہرست الفاظ

مؤلّف مولانا محمد عبدالرشید صاحب نعمانی

ہماری زبان میں لغت قرآن پر متعدد کتابیں موجود ہیں لیکن ضرورت اس کی تھی کہ اس موضوع پر ایک جامع، مکمل اور مستند کتاب تحقیق کی روشنی میں مرتب کی جائے جو قرآن مجید کے معانی اور مطالب کے سمجھنے اور حل کرنے میں ہر حیثیت سے مدد دے سکے۔ یعنی جس میں الفاظ قرآن کی مکمل تشریح بھی ہو اور متعلقہ مباحث کی ضروری تفصیل بھی۔ ظاہر ہے کہ اس مرتبہ کی علمی اور تحقیقی تصنیف اب تک وجود میں نہیں آئی تھی۔

پیشِ نظر کتاب اسی مقصد کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے اور اس کو پورا کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ تکمیل فائدہ کے لئے "لغات قرآن" کے ساتھ "الفاظِ قرآن" کی مکمل فہرست بھی دی گئی ہے۔ ابھی تک یہ کتاب نامکمل تھی صرف پانچ جلدیں طبع ہوئی ہیں اب کتاب کی آخری جلد ششم بھی طباعت کے آخری مرحلے میں ہے اواخر اگست تک طبع ہو جائے گی۔

جلد اوّل۔ صفحات ۳۲۴۔ بڑی تقطیع، قیمت للعہ مجلد ۸ؔ،

جلد دوم ب سے خ تک، صفحات ۳۲۶۔ بڑی تقطیع۔ قیمت للعہ مجلد ۵ؔ،

جلد سوم د سے ش تک، صفحات ۳۳۲۔ قیمت للعہ مجلد ۵ؔ،

جلد چہارم۔ یہ جلد برسوں کے انتظار کے بعد زیور طبع سے آراستہ ہو کر آئی ہے۔ صفحات ۲۸۶ بڑی تقطیع ص سے ع تک۔
قیمت ۵ؔ مجلد ۶ؔ،

جلد پنجم غ سے م تک، صفحات ۵۰۰ بڑی تقطیع۔ قیمت ۸ؔ، مجلد ۹ؔ،۔

جلد ششم ن سے ی تک، صفحات ۳۲۵۔ قیمت للعہ مجلد ۹ؔ،

بُرہان

جلد ۳۹ شمارہ ۲

اگست ۱۹۵۷ء مطابق محرم الحرام ۱۳۷۷ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

دنیا میں بڑے بڑے کارخانے ہیں - فیکٹریاں ہیں - جہاں پُرزے ڈھلتے ہیں اور مشینیں بنتی ہیں - عظیم الشان یونیورسٹیاں ہیں جہاں علوم و فنون کی تعلیم دی جاتی ہے - جہاں سے انجنیئر - ڈاکٹر - وکیل اور بیرسٹر اور حکومت کے اعلیٰ افسر اور جلیل القدر عہدہ دار پیدا ہوتے ہیں - ان لوگوں کی زندگیاں عیش و عشرت کے سامانوں سے بھرپور ہوتی ہیں - رہائش کے لئے عالی شان بنگلے اور کوٹھیاں - سواری کے لئے بیش قیمت موٹر کاریں - خدمت کے لئے نوکر چاکر - مکان کی آرائش کے لئے اعلیٰ قسم کا فرنیچر - بنک میں ہزاروں لاکھوں روپیہ ان کے نام - تمدنِ جدید کی تمام آسائشیں ان کو حاصل ، لیکن صوبہ اتر پردیش کے ضلع سہارنپور کے ایک معمولی سے قصبہ میں جس کا نام دیوبند ہے کچھ کم ایک صدی سے ایک کارخانہ قائم ہے جس کا نام دارالعلوم ہے - اس کارخانہ میں کل پرزے نہیں انسانی قلب و دماغ تعلیماتِ محمدی کے سانچہ میں ڈھالے جاتے ہیں - مشینیں نہیں - یہاں انسان بنائے جاتے ہیں - جسم کی راحت و آسائش اور مادی زندگی کی رنگا رنگی نہیں بلکہ روح کی آسودگی باطن کی صفائی اور تزکیۂ نفس کی دولت حاصل کرنے کے گُر یہاں پڑھائے اور سکھائے جاتے ہیں جو لوگ یہاں سے بن بنا کر نکلتے ہیں ان کا مقصدِ حیات حطامِ دنیا کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنا نہیں ہوتا بلکہ ان کا نصب العین زندگی رحمۃ للعالمین کے نقشِ قدم پر چل کر انسانیت عامہ کے لئے رحمت بننا - بندگانِ خدا کی بے لوث خدمت کرنا - ایک چراغ سے ہزاروں چراغ روشن کرنا - روحانیت اور اخلاقِ حسنہ کی دنیا کو اجاگر کرنا اور رب العلمین سے اس کے بندوں کا رشتہ مضبوط کر کے ان کے لئے روحانی سکون و اطمینان کا سامان فراہم کرنا ہوتا ہے - خدا پرستی دنیا کی سب سے بڑی شرافت اور نیکی ہے - اس کارخانہ کا اساسی مقصد یہی ہے کہ سچے خدا

پرست پیدا کرنا ہے اس بنا پر جو لوگ یہاں سے پیدا ہوتے ہیں وہ دمشقی جلیسھم کا مصداق ہوتے ہیں وہ ہر ایک کے لئے خواہ اپنے ہوں یا بیگانے۔ ملکی ہوں یا غیر ملکی رحمت ہوتے ہیں۔ فقر و درویشی ان کا شعار ہے سادہ زندگی اور قناعت ان کا شیوہ ہے اور یہ سب کچھ اس لئے ہوتا ہے کہ ان کا مقصد ہی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی جو انسانی سعادت و شرف کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ ترویج و اشاعت اور اس کا استحکام و ترقی ہے۔

گذشتہ ماہ جولائی کی ۱۳ تاریخ کو صدر جمہوریۂ ہند دار العلوم دیوبند تشریف لے گئے تھے۔ یہاں موصوف نے مدرسہ کی عمارتیں دیکھیں۔ کتب خانہ کے نوادر ملاحظہ فرمائے۔ سپاسنامہ قبول فرمایا۔ آزادیٔ وطن کی راہ میں علمائے دیوبند کی قربانیوں کی داستان سنی۔ اساتذہ اور طلبار کا سادہ طرزِ معاشرت بچشم خود دیکھا۔ عصرانہ میں شرکت کی اور پھر اپنی تقریر دل پذیر میں مدرسہ کی نسبت اپنے جذبات و احساسات بیان فرمائے، یہ سب کچھ تو ہوا۔ لیکن معلوم نہیں صدر جمہوریہ نے دار العلوم کے کسی ایک مردِ مومن کا سینہ کھول کر ایمان و یقین کی اس حرارت و گرمی کو بھی محسوس کیا جس کا براہِ راست تعلق مدینہ کی جلوہ گاہِ قدس سے ہو۔ کہ دراصل دار العلوم میں موصوف نے جو کچھ ملاحظہ فرمایا وہ صرف اس کا قالب اور ظاہر ہے روح در حقیقت یہی ہے۔ صدر جمہوریہ خود بڑے پکے مذہبی انسان ہیں اگر وہ دار العلوم کی اس روح کو دیکھ سکتے تو بے شبہ جتنے وہ متاثر ہوئے اُس سے زیادہ ہوتے اور دار العلوم کو اپنے ملک کے لئے قدرت کا سب سے بہتر عطیہ تصور کرتے۔

افسوس ہے پچھلے دنوں مولانا آزاد سبحانی کا ۷۵ برس کی عمر میں گورکھپور میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم کا اصل نام عبد القادر اور وطن سکندر پور ضلع بلیا تھا۔ ادھر ایک مدت سے

گمنامی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ورنہ تحریکِ خلافت کے زمانہ میں پورے ہندوستان میں ان کی شہرت کا طوطی بولتا تھا۔ فلسفہ و آلہیات کے فاضل تھے۔ خطابت و تقریر میں بعض حیثیتوں سے اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ شاعر بھی تھے۔ مرحوم کی ایک غزل بچپن میں کبھی پڑھی تھی جواب تک یاد ہے

پیام آیا ہے پیمانِ جفا کا	نتیجہ کھل گیا جوشِ وفا کا
نکل آؤ ذرا پردہ سے باہر	عقیدہ مٹ رہا ہے اب خدا کا
مزاجِ لا اُبالی اور جوانی	خدا حافظ ہے ناموسِ حیا کا
خدا پر چھوڑ دو انجامِ کشتی	قدم کیوں درمیاں ہو ناخدا کا
حدیثِ ضبطِ پروانہ ہے بےوقت	زمانہ ہے فغانِ برملا کا
ترا آزاد پھر پابندِ غم ہے	وہ پھر محتاج ہے لطف و عطا کا

لیکن افسوس ہے اپنی صلاحیتوں اور کمالات سے اسلام اور مسلمانوں کو جو فائدہ پہنچا سکتے تھے اپنی طبیعت کے عدم استقلال اور تلون کی وجہ سے نہ پہنچا سکے۔ بحیثیت مجموعی بڑی خوبیوں کے انسان تھے۔ اللّٰہم اغفرلہ وارحمہ۔

مولانا سید بدرالدین صاحب علوی نے جو عربی زبان وادب کے نامور فاضل اور محقق ہیں۔ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے چہل سالہ تعلق سے سبکدوش ہونے کے بعد ایک اعلان میں وعدہ فرمایا ہے کہ عربی زبان وادب کے کسی ایک موضوع سے متعلق جو صاحب تحقیقاتی کام کرنا چاہیں۔ مولانا بڑی خوشی سے بغیر معاوضہ کے اُس کام کی نگرانی اور اُس میں راہنمائی کرنے کے لئے آمادہ ہیں اس سلسلہ میں ریسرچ کے موضوع کا انتخاب خود مولانا کریں گے اور تکمیل کے بعد اپنے حلقۂ اثر میں اُس کی طباعت اور اشاعت کا بھی بندوبست فرمائیں گے ارباب ذوق کے لئے مولانا کا یہ اعلان بڑا حوصلہ افزا اور مایۂ مسرت ہے۔ خط وکتابت کے لئے مولانا کا پتہ یہ ہے :۔

بجہہ ہاؤس ۔ کیلانگر ۔ علی گڈھ

حضرت ابوبکرؓ کے سرکاری خطوط

از

(جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب فارق - استاذ ادبیاتِ عربی - دہلی یونیورسٹی)

(۴)

عکرمہ بن ابی جہل کے نام

۱۳/۱۶

مذکورہ بالا خط پڑھ کر اشعث نے ایلچی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ہم نے ابو قحافہ کے لڑکے کو خلیفہ ماننے میں ذرا دیر کی تو ہمیں کافر سمجھ لیا اور زیاد بن لبید کو حکم دیا کہ میرے چچازاد بھائیوں (یعنی دوسرے کندی رئیسوں کو) جو مسلمان ہیں کفر کی تہمت میں گردن ماردے۔ ایلچی نے جس کا نام ناسخ التواریخ میں مسلم بن عبداللہ بتایا گیا ہے، اشعث کی تردید کرتے ہوئے کہا: جب مہاجر وانصار نے باتفاق رائے ابوبکرؓ کو خلیفہ مان لیا اور پھر بھی تمھارے چچازاد بھائیوں نے اُن کو خلیفہ نہیں مانا، تو بلاشبہ وہ کافر ہو گئے" ابھی مسلم نے بات ختم بھی نہ کی تھی کہ بنو مُرّہ (کندی قبیلہ) کے ایک جوان نے جو اشعث کا چچازاد بھائی تھا طیش میں آکر ایلچی کے ایسی تلوار ماری کہ اس کا کام تمام ہو گیا۔ اشعث نے اس شخص کو شاباشی دی اور کہا تم نے بہت اچھا جواب دیا۔ یہ فعل بہت سے دوسرے کندی لیڈروں کو سخت ناگوار ہوا۔ ابوبکرؓ کے خط نے صلح کا دروازہ کھول دیا تھا جس کے وہ دل سے خواہاں تھے، ایلچی کے قتل نے اس کو پھر بند کر دیا۔ کئی لیڈروں نے کھڑے ہو کر اشعث کے طرزِ عمل اور ایلچی کے قتل کی سخت مذمت کی۔ اور اپنے اپنے ماتحت قبیلوں کے ساتھ اشعث سے الگ ہو گئے۔ اشعث کے پاس صرف دو ہزار جوان رہ گئے جو ان کے خاندانی لوگ تھے۔ اپنے حریف کو کمزور پا کر مہاجر تریم کے قلعہ سے باہر

نکلے اور رزفان[1] نامی دریا کے کنارے اشعث سے رزم آرا ہوئے۔ اشعث نے بڑی سوجھ بوجھ سے جنگ کی، ان کے ہاتھ سے مہاجر بن امیہ کے سر میں ایک کاری زخم لگا جس کے زیر اثر وہ میدان چھوڑ کر بھاگ گئے، مسلمان فوجیں پیچھے ہٹ گئیں، بڑی سخت لڑائی ہوئی، کشتوں کے پشتے لگ گئے، مقابلہ کی تاب نہ لاکر اسلامی فوجیں بھاگ پڑیں، اشعث نے اُن کا تعاقب کیا، بہت سے مسلمان فرار کی حالت میں مارے گئے، جو بچے وہ قلعہ میں گھس گئے، زیاد بن لبید نے اپنی شکست اور دوبارہ تریم میں محصور ہونے کا حال خلیفہ کو لکھا تو انھوں نے عکرمہ کو یہ مراسلہ بھیجا:

" واضح ہو کہ قبیلہ کندہ نے بغاوت کا جھنڈا بلند کیا ہے، اور زیاد بن لبید اور مہاجر بن اُمیّہ کا سخت محاصرہ کرلیا ہے۔ اِس خط کو پڑھتے ہی تریم کا رُخ کرو اور سرکشوں کی مناسب سرکوبی کرو۔ جو مکی باشندے تمھارے ساتھ جانا پسند کریں اور راستہ میں جن جن قبیلوں سے تمھارا گذر ہو ان کو ساتھ لیتے جاؤ۔" فتوح اعثم صہ ۱۲، ناسخ التواریخ ۲/ قسم دوم / ۱۲۳۔

اعثم نے یہ نہیں بتایا کہ جب یہ خط عکرمہ کو ملا تو وہ کہاں تھے۔ طبری کے راویوں یعنی سیف بن عمر اور ان کے شیوخ کی رو سے عکرمہ ان گیارہ سالاروں میں سے ایک تھے جن کو ابوبکر نے مرتدوں کی گوشمالی کے لئے جزیرہ نمائے عرب کے مختلف حصوں میں بھیجا تھا۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ عکرمہ کو مسیلمہ سے لڑنے یمامہ بھیجا گیا تھا، ان کو حکم تھا کہ یمامہ کی سرحد پر پہنچ کر رک جائیں اور جب مزید فوج شرحبیل بن حسنہ کی قیادت میں ان سے آملے تب مسیلمہ سے جنگ کریں۔ لیکن انھوں نے شرحبیل کے آنے سے پہلے مسیلمہ پر حملہ کردیا اور شکست کھائی، عکرمہ کی جلد بازی اور شکست نے خلیفہ کو مشتعل کردیا اور انھوں

[1] ہمارے جغرافیہ نویس حضرموت میں اس نام کا کوئی دریا نہیں بتاتے، شاید رزفان کسی اور لفظ کی مسخ کی ہوئی شکل ہے۔

نے وہ پُرعتاب خط لکھا جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے اور جس میں عکرمہ کو ہدایت کی تھی کہ مدینہ نہ لوٹیں، عمان کا رُخ کریں اور عمان کے خلاف بھیجے ہوئے دو جنرلوں حذیفہ بن محصن اور عرفجہ بارقی کی پشت پناہی کریں، اور اُن کی مدد سے فارغ ہو کر عمان سے ملے ہوئے علاقہ کے مُرتد قبیلوں کو جو مہرہ کے نام سے مشہور تھے، مسلمان بنائیں، پھر حضرموت کو جہاں اُس وقت خیریت تھی چھوڑ کر یمن میں داخل ہوں اور وہاں کے باغی شہروں اور دیہاتوں کو راہِ راست پر لائیں۔ طبری کے راوی عکرمہ کی نقل و حرکت خلیفہ کے اس مراسلہ کے مطابق بیان کرتے ہیں، یعنی وہ یمامہ سے پہلے عمان پہنچتے ہیں عمان کی مہم سے فارغ ہو کر قبائلِ مہرہ میں ارتداد کا خاتمہ کرتے ہیں، پھر حضرموت سے بچتے ہوئے عدن میں داخل ہوتے ہیں، عدن سے وہ جنوبی یمن کے شہروں میں اسلام کا بول بالا کرتے روانہ ہوتے ہیں کہ ان کو خلیفہ کا ارجنٹ فرمان ملتا ہے کہ حضرموت میں بغاوت ہو گئی ہے وہاں زیاد کی مدد کو جاؤ، اب وہ مشرقی یمن کے شہر مارب کا رُخ کرتے ہیں اور وہاں مہاجر بن اُمیّہ سے جو صنعاء سے زیاد کی مدد کو چلے آرہے ہیں مل جاتے ہیں۔ مہاجر اس قدر فوج لے کر جس کے کھانے چارہ کا پہلی فرصت میں بندوبست ہو جاتا ہے آگے بڑھ جاتے ہیں اور باقی فوج پر عکرمہ کو جانشین بنا دیتے ہیں اور ہدایت کرتے ہیں۔ کہ جوں ہی باقی فوج کی غذا اور چارہ کا انتظام ہو جائے، اُن سے آملیں۔ مہاجر کے آنے سے زیاد کی قوت بڑھ جاتی ہے اور اشعث خود کو کمزور پا کر نُجیر کے قلعہ میں محصور ہو جاتے ہیں، اس محکم کوہی قلعہ میں تین سڑکیں تین سمتوں سے داخل ہوتی ہیں، ایک سڑک کی ناکہ بندی زیاد کر لیتے ہیں، دوسری کی مہاجر، تیسری کھلی رہتی ہے، جس سے ہو کر اشعث کے پاس کھانے پینے کا سامان اور رسد آتی رہتی ہے۔ جب عکرمہ کی فوجیں چارہ غلہ کا انتظام کر لیتی ہیں تو وہ بھی مہاجر کی ہدایت کے بموجب نُجیر کا رُخ کرتی ہیں اور وہاں پہنچ قلعے میں داخل ہونے والے تیسرے راستہ کی ناکہ بندی کر لیتی ہیں اشعث کی رسد بند

ہو جاتی ہے اور قلعہ میں غذا کا قحط پڑنے لگتا ہے، مجبور ہو کر اشعث ہتیار ڈالنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ عکرمہ کی فوجی حرکت کا ذکر طبری نے ان خطوط پر کیا ہے اور یہ کافی مربوط ہے۔ لیکن اعثم یا فتوح البلدان بلاذری میں ایسا خاکہ نہیں پیش کیا گیا، جس کی وجہ سے واقعات کے ربط اور عکرمہ کی سرگرمیوں کے تسلسل کا سمجھنا دشوار ہو گیا ہے۔ اکتفاء کے راوی عکرمہ کے سلسلہ میں بالکل نئے اکتشاف کرتے ہیں جن کا اگلے خط کے مقدمہ میں ذکر ہوگا۔

۱۷۔ عکرمہ بن ابی جہل کے نام

یہ خط بھی اعثم کوفی کی فتوح سے ماخوذ ہے اور متاخرین میں اس کو ناسخ التواریخ کے مؤلف نے نقل کیا ہے، ناسخ کا مرجع بھی اعثم معلوم ہوتا ہے۔ اعثم نے خط کا سیاق سباق اس طرح بیان کیا ہے کہ جب عکرمہ کو حضرت ابو بکر کا مذکورہ بالا خط ملا، تو وہ دو ہزار سوار لے کر زیاد بن لبید کی مدد کے لئے حضرموت روانہ ہوئے، راستہ کے مسلمان دیہاتوں سے جوان بھرتی کرتے گئے، سرحد یمن میں داخل ہو کر صنعاء پہنچے جہاں اسود عنسی کی چند ماہی حکومت کے بعد پھر اسلام کا جھنڈا لہرا رہا تھا جہاں ایک اچھی جمعیت ان کی فوج میں داخل ہو گئی صنعاء سے رخصت ہو کر یمن کے قدیم شہر مارب پہنچے، وہاں دم لے رہے تھے، اور بھرتی کا کام بھی جاری تھا کہ عمان کے پایۂ تخت دبا کے رئیسوں کو معلوم ہوا کہ عکرمہ بنو کندہ کی خبر لینے اور زیاد کی مدد کرنے جا رہے ہیں، ان کو یہ بات ناگوار ہوئی، اعثم نے ناگواری کی کوئی وجہ نہیں بتائی، ممکن ہے ان رئیسوں کا بنو کندہ کے سرداروں سے کوئی معاہدہ ہوا ہو، انھوں نے کہا: ہم عکرمہ کی وہ تواضع کرتے ہیں کہ بنو کندہ کو بھول جائیں گے۔" وہ باغی ہو گئے دبا میں اُس وقت خلافت کی طرف سے حُذیفہ بن عمرو (حُذیفہ بن محصن۔ طبری ۳/ ۲۶۳، حذیفہ بن یمان ازدی۔ اکتفار ص ۲۶۷) مُحصّل صدقات تھے، گو اعثم نے تصریح نہیں کی پر دوسرے ذرائع سے معلوم ہوتا ہے کہ حُذیفہ ان عربوں کے ساتھ

جو اسلام پر قایم رہے، عُمان میں کسی محفوظ جگہ روپوش ہو گئے، انھوں نے مرکز کو دَبا کی بغاوت سے مطلع کیا، ابو بکرؓ نے ذیل کا فرمان عکرمہ کو بھیجا:-

"واضح ہو کہ اہلِ دَبا نے بغاوت کردی ہے، زیاد کے پاس جانے سے پہلے تم اُن کی اچھی طرح خبر لو، ان کی گوشمالی کرنے میں ذرا کوتاہی نہ کرنا، جب تم کو فتح نصیب ہو تو ان کے (یعنی ان کے مردوں کے) بیڑیاں ڈال کر میرے پاس بھیجنا، اور خود زیاد بن لبید کی مدد کو چلے جانا، جو کل فوج کے لیڈر رہیں گے، اُن کے صلاح مشورہ سے سرکشوں کو سزا دینا، اور اس کام میں پوری کوشش اور ہمت سے کام لینا، امید ہے خدا تعالیٰ تم کو حضر موت پر فتح عطا کرے گا، اور بغاوت کی آگ ٹھنڈی ہو جائے گی" اعثم ص ۱۴

الکتفار کے راویوں نے جن کا نام نہیں لیا گیا تصریح کی ہے کہ جس وقت عُمان میں بغاوت کی آندھی چلی اور دَبا کے عامل حُذیفہ نے مرکز کو اس کی اطلاع دی تو عکرمہ تبالہ میں مقیم تھے، یہ بستی مکہ سے ایک سو ساٹھ ۱۶۰ میل جنوب میں اس سڑک پر واقع تھی جو یمن کے متعدد شہروں کو ملاتی ہوئی عدن جاتی تھی، مکہ سے تبالہ پہنچنے میں آٹھ دن لگتے تھے طائف سے چھ دن اور یمن کے شہر بیشہ سے ایک دن (معجم یاقوت ۲/ ۳۵۷، اصطخری ص ۱۴) رسول اللہ نے ان کو بنو عامر بن صعصعہ کے زیریں قبیلوں کا محصّل زکاۃ مقرر کیا تھا، رسول اللہ کی وفات پر جب وہاں کی فضا خراب ہوئی تو عکرمہ اسلام پر ثابت قدم عربوں کو ساتھ لے کر تبالہ آگئے، وہاں خلیفہ کی ہدایات کے منتظر تھے کہ ان کو اہلِ دَبا یعنی عُمان کی بغاوت فرو کرنے پر مامور کیا گیا اور وہ ڈیڑھ ہزار فوج لے کر اس مہم پر روانہ ہوئے، الکتفار کے راویوں نے ایک اور اہم تصریح کی ہے اور وہ یہ کہ حضرت ابو بکر کی اہل ردہ کے خلاف یہ پہلی مہم تھی جو عکرمہ کی سرکردگی میں روانہ ہوئی تھی۔ (الکتفار ص ۲۶۶)

اعثم کے مذکورہ بالا خط اور اس کے پس منظر سے قاری کے دل میں کئی اُلجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ مثلاً خط کے مقدمہ میں کہا گیا ہے کہ دبا کے رئیسوں نے کہا تھا کہ ہم عکرمہ کی ایسی خبر لیں گے کہ وہ بنو کندہ اور ان سے جنگ کا خیال تک بھول جائیں گے، اس دھمکی کے بموجب ان کو عکرمہ کے خلاف کارروائی کرنی چاہیئے تھی، لیکن انھوں نے عکرمہ کے خلاف کارروائی نہیں کی بلکہ اسلامی حکومت سے باغی ہو گئے۔"

۱۸- مہاجر بن اُمیّہ کے نام

اشعث اور ان کے قبائل کی بغاوت کا حال آپ اعثم کے راویوں کی زبانی خط رقم ۱۲ کے مقدمہ میں پڑھ چکے ہیں۔ سیف نے طبری میں اس بغاوت کا جو ذکر کیا ہے وہ تفصیلات میں اعثم کے ذکر سے بہت کافی مختلف ہے۔ مراسلۂ ذیل سیف نے نقل کیا ہے، اس کا تعلق بھی بنو کندہ کی بغاوت سے ہے، خط کا سیاق و سباق سمجھنے کے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سیف کے پیش کردہ حالاتِ بغاوت کا مُلخّص یہاں بیان کر دیا جائے:-

جیسا کہ پہلے بیان ہوا بنو کندہ کی بہت سی چھوٹی بڑی شاخیں حضر موت کے مغربی اور وسطی وادیوں اور کوہستانوں میں پھیلی ہوئی تھیں، ان کا سب سے بڑا اور مقتدر قبیلہ "بنو معاویہ بن کندہ" کہلاتا تھا۔ اس کی آٹھ نو شاخوں کے نام ہمدانی نے صفۃ جزیرہ العرب میں دیئے ہیں (ص۸۵) ان میں بنو حارث بن معاویہ پر اشعث کا براہِ راست تسلط تھا۔ اس وقت ان شاخوں پر سات کندی رئیس حکمراں تھے جن کو شاہانِ کندہ کی نسل سے ہونے کے سبب اُس وقت بھی "ملوک" کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ بنو عمرو بن معاویہ یعنی کندی رئیسوں کے قبیلوں سے زیاد بن لبید کے تعلقات زکاۃ کے معاملہ میں رسول اللہ کے عہد ہی سے کشیدہ ہو گئے تھے، (کشیدگی کے اسباب کے لئے دیکھئے طبری ۲۷۱/۳) ان لوگوں نے ابو بکر کی بیعت بھی بادلِ ناخواستہ کی تھی۔ ایک دن جب کہ

زیاد ان سے زکاۃ کے اونٹ وصول کر رہے تھے، ان کو ایک جوان اونٹ پسند آیا اور انھوں نے اس پر مہر لگوا کر سرکاری گلہ میں داخل کرا دیا، یہ اونٹ اس شخص کا نہ تھا جس سے زکاۃ لی گئی تھی، بلکہ اس کے بھائی کا تھا جس پر زکاۃ واجب نہ تھی، اس شخص نے کہا میں اپنی طرف سے دوسرا اونٹ دیتا ہوں، میرے بھائی کا واپس کر دو، زیاد سمجھے یہ بہانہ کر رہا ہے، انھوں نے کہا اونٹ پر سرکاری مہر لگ چکی، اب یہ واپس نہیں ہوگا، اس شخص نے چلا چلا کر اپنے قبیلہ کو مدد کے لئے بلایا، قبیلہ کا ایک شیخ آیا، اس نے زیاد سے اونٹ واپس کرنے کی سفارش کی پر زیاد نے سفارش نہ مانی۔ وہ شیخ مشتعل ہو گیا اور اپنے چند ساتھیوں کو لے کر گلہ میں گھسا اور اونٹ نکال کر صاحب اونٹ کو دے دیا۔ زیاد نے پرسنل گارڈ کی مدد سے اس شیخ اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا اور اونٹ بھی چھین لیا۔ بستی میں ایک ہلچل مچ گئی، بنو معاویہ نے شیخ کا پارٹ لیا، حمیر اور سکون کے قبیلوں نے زیاد کا۔ بدامنی کی فضا پیدا ہو گئی۔ دونوں فریق جنگ کی تیاری کرنے لگے، زیاد نے اعلان کیا کہ اگر بنو معاویہ ارادۂ جنگ ترک کر کے پُرامن ہو جائیں گے تو وہ شیخ اور اس کے ساتھیوں کو چھوڑ دیں گے۔ بنو معاویہ نے کہا جب تک شیخ اور اس کے ساتھیوں کو چھوڑا نہ جائے گا وہ پُرامن نہ ہوں گے۔ ایک رات زیاد نے ان پر حملہ کر دیا، ان کے کچھ جوان مارے گئے اور باقی تتر بتر ہو گئے۔ اب زیاد نے شیخ اور اس کے ساتھیوں کو رہا کر دیا۔ چھوٹنے کے بعد ان لوگوں نے زیاد کے خلاف سخت مہم شروع کی اور کہا جب تک زیاد ہیں ملک میں عافیت نہیں ہو سکتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بنو معاویہ بڑے پیمانہ پر جنگ کے لئے مستعد ہو گئے۔ اور کھلم کھلا زکاۃ دینے سے انکار کر دیا۔ اس وقت پوزیشن یہ تھی کہ اکثر حمیری اور بعض کندی قبیلے جیسے (سکارک وسکون) اسلام کے وفادار تھے، بعض جن میں اشعث کا قبیلہ شامل تھا غیر جانب دار یا متذبذب تھے، لیکن بنو معاویہ بن کندہ کی اکثر شاخیں مخالفت پر کمر بستہ ہو گئیں۔ بنو معاویہ کے چار رئیس برملا باغی ہو کر اپنے اپنے

قبیلوں کے ساتھ کوہستانی وادیوں میں چلے گئے۔ اشعث بھی خود کو خطرہ میں گھرا پا کر مع قبیلہ کے اپنی وادی میں محفوظ ہو گئے۔ ایک رات جب کہ بنو معاویہ کے چاروں رئیس اور ان کے ہم قوم حالاتِ حاضرہ پر غور کرتے جمع تھے، زیاد نے شبخون کر کے انھیں اور بہت سے دوسرے لوگوں کو مار ڈالا، جو بچے بھاگ گئے۔ زیاد ان کے بال بچوں کو قید کر کے لوٹ رہے تھے کہ ان کا گذر اشعث کی وادی سے ہوا، عورتوں نے رو رو کر اشعث سے داد فریاد کی، اشعث کی عصبیت جوش میں آگئی۔ ادھر کندی رئیسوں کے قتل سے سارے کندی اور کچھ حمیری قبیلوں میں غصہ اور انتقام کی آگ بھڑک گئی، جو کندی قبیلے متذبذب تھے وہ بھی اشعث کے ساتھ ہو گئے، اشعث کی قوت بہت بڑھ گئی زیاد نے یہ دیکھ کر مہاجر بن اُمیہ کو مدد کے لئے ارجنٹ خط بھیجا مہاجر یمن میں ارتداد کا قلع قمع کر کے حضرموت کے قریب پہنچ چکے تھے۔ جب وہ آگئے تو اشعث سے جنگ چھڑی، اشعث ہار گئے۔ وہ اور ان کے ساتھی بھاگ کر نجیر کے کوہستانی قلعہ میں پناہ گیر ہوئے۔ جب اشعث اور ان کی فوجیں قلعہ بند ہو گئیں تو زیاد اور مہاجر نے بنو کندہ کے باغی قبیلوں کی سرکوبی کے لئے رسالے بھیجے، بہت سے کندی مارے گئے اور ان کے گاؤں لوٹ لئے گئے۔ اشعث اور دوسرے محصور کندی رئیسوں کو جب ان حوادث کا علم ہوا تو انھوں نے سر پیٹ لیا، انھوں نے اپنے گیسو کٹوا دئے اور قلعہ سے نکل کر مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے، لیکن پھر شکست کھائی، اور دوبارہ قلعہ میں محصور ہو گئے۔ اشعث کی امیدیں ٹوٹ چکی تھیں، غذائی حالت نازک ہو چکی تھی، انھوں نے صلح کی پیشکش کی جس کو زیاد نے رد کر دیا، اب انھوں نے امان کی درخواست کی، کہ انھیں اور ان کے نو خاندانی عمائد کو مع اہل و عیال خلیفہ کے پاس بھیج دیا جائے اور وہ اپنی صوابدید سے جو سزا چاہے دیں، یہ درخواست مان لی گئی۔ قلعہ کے سب جوانوں کو قتل کر دیا گیا۔ اس وقت خلیفہ کا یہ خط لے کر مغیرہ بن شعبہ وارد ہوئے:-

"میرا خط پڑھ کر دھیان سے میری ہدایات پر عمل کرنا: اگر بنو کندہ پر تم کو فتح حاصل ہو تو ان کے جوانوں کو قتل کر دینا اور بال بچوں کو غلام بنا لینا، یہ اُس صورت میں جب کہ فتح بزور شمشیر حاصل ہوئی ہو یا وہ اس شرط پر ہتیار ڈالیں کہ ان کی قسمت کا فیصلہ میری صوابدید سے ہو۔ لیکن اگر تمھاری ان سے صلح ہو تو اس صورت میں قبول کی جا سکتی ہے کہ ان کو جلا وطن کر دو، میں نہیں چاہتا کہ ان لوگوں کو اسلام سے بغاوت کے بعد (چین سے) ان کے گھر اور وطن میں رہنے دوں، میں چاہتا ہوں کہ ان کو اپنی بدکرداری کا احساس ہو اور اپنے کئے کا تھوڑا مزہ چکھیں" (سیف طبری ۲۰۰۰ - ۱ھ ۲۷، تاریخ یعقوبی لیدن صہ ۱۴۹)

الکتفاء میں بنو کندہ کی بغاوت کا جو قصہ بیان ہوا ہے اس کے خد و خال سیف کے بیان کردہ خط سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں، تاہم دونوں میں چند بنیادی اختلاف ہیں جن کی طرف اشارہ ضروری ہے۔ سیف کا نقل کیا ہوا خط جو خلیفہ نے مغیرہ بن شعبہ کے ہاتھ مہاجر بن اُمیہ کو بھیجا تھا، آپ نے ابھی پڑھا۔ سیف بتاتے ہیں کہ مغیرہ راستہ بھول گئے تھے اس لئے دیر میں پہنچے، جب کہ اشعث کو امان دی جا چکی تھی اور قلعہ کے جوانوں کو قتل کیا جا چکا تھا، الکتفاء کے راوی کہتے ہیں کہ مغیرہ صلح نجیر کے موقع پر خط نہیں لائے بلکہ اُس موقع پر لائے تھے۔ جب بنو معاویہ بن کندہ اور ان کے چار رئیس زیاد سے باغی ہو کر کوہستانی وادیوں میں چلے گئے تھے، اس خط میں ابو بکر نے تاکید کی تھی کہ ان رئیسوں کو قتل نہ کیا جائے، بدقسمتی سے مغیرہ راہ بھٹک گئے اور اتنی دیر میں پہنچے کہ زیاد شبخون کر کے چاروں رئیسوں کو ان کے کوہستانی وادیوں میں مار چکے تھے۔

الکتفاء کے راویوں نے ایک اور حیرتناک انکشاف کیا ہے جو سیف کے نقل کردہ خط رقم ۱۵، کی مکمل تردید ہے، اور وہ یہ کہ حضرت ابو بکر نے نجیر کے محاصرہ کے دوران مُہنیک

بن اوس بن خزمہ کی معرفت زیاد بن لبید کو ایک فرمان بھیجا تھا جس میں تاکید کی تھی کہ محصورین کو قتل نہ کیا جائے بلکہ گرفتار کر کے دربارِ خلافت بھیج دیا جائے، محصورین کا ستارہ گردش میں تھا، اس لئے نہیک کے پہنچنے سے صرف چند گھنٹے پہلے قلعہ کے سات سو جوانوں کی گردن ماری جا چکی تھی۔

سیف بن عمر نے عکرمہ بن ابی جہل کی عسکری حرکت ان خطوط پر دکھائی ہے: یمامہ میں شکست کھا کر وہ (غالباً ہجر اور بحرین کی راہ سے) عمان پہنچتے ہیں، وہاں اسلام کا تسلط دوبارہ قائم کر کے، قبائلِ مہرہ کے علاقہ میں ارتداد کا قلع قمع کرتے ہیں، وہاں سے فارغ ہو کر حضر موت کے مشرقی ساحل والی سڑک سے ہوتے ہوئے عدن کے مشہور بندرگاہ اور یمن کی آخری حد تک پہنچ جاتے ہیں، وہاں سے شمال کی طرف رُخ کرتے ہیں تاکہ صنعا اور عدن کے درمیان ارتداد کے جو گوشے ہوں ان کو صاف کرتے چلیں اور پھر خلیفہ کی ہدایت کے مطابق مہاجر سے یمن میں وہ جس جگہ ہوں جا کر مل جائیں، عدن سے ابھی نو دس میل چل کر ابین کی منزل پر پہنچے تھے کہ فرمانِ خلافت ملا کہ سیدھے زیاد کی مدد کو حضر موت چلے جاؤ، وہ روانہ ہو گئے، دوسری طرف مہاجر خلیفہ کا حکم پا کر صنعاء سے روانہ ہو چکے تھے، مارب کی قدیم بستی میں دونوں کی راہیں ملیں، مہاجر فوج کا ایک حصہ لے کر پہلے چلے گئے، کچھ دن بعد عکرمہ باقی فوج کے ساتھ نجیر میں ان سے جا ملے۔" (سیف - طبری ۴/۲۷۱ - ۲۷۵)

اکتفاء میں عکرمہ کی مسیلمہ سے شکست کھانے کا مطلق ذکر نہیں ہے، اکتفاء کے راوی ردّہ کے وقت ان کو تبالہ میں دکھاتے ہیں، تبالہ تہامۂ یمن کا اہم شہر تھا، رسول اللہ نے ان کو سفلی بنی عامر بن صعصعہ پر محصلِ زکاۃ مقرر کیا تھا، جب ردّہ کی وبا پھیلی اور وہاں کے حالات خراب ہوئے تو عکرمہ اپنی فوجی کمزوری کے سبب مسلمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ تبالہ آ کر ٹھہر گئے، اور خلیفہ کے حکم کا انتظار کرنے لگے۔ تبالہ مکہ سے عدن جانے

والی اس تجارتی شاہراہ پر واقع تھا جو طائف، نجران اور صنعاء سے ہوکر گذرتی تھی، اس کا فاصلہ مکہ سے ایک سو ساٹھ میل بتایا گیا ہے۔" (معجم یاقوت ۲/۳۵۷، صبح الاعشیٰ مصر ۱/۲۲۷) یہاں ان کو حکم ملا کہ عمان کے پایۂ تخت دبا جا کر اس بغاوت کو فرو کریں جو عمان کے بڑے رئیس لقیط ازدی نے کی تھی، عکرمہ جب بغاوت فرو کر چکے تو ابو بکر نے ان کو عمان کا گورنر مقرر کیا اور وہ دبا (پایۂ تخت) میں مقیم ہو گئے۔ زیاد بن لبید کی اشعث سے جب لڑائی شروع ہوئی اور حضرموت کے اکثر قبیلے مسلمانوں کے خلاف ہو گئے تو زیاد نے خلیفہ سے مدد مانگی۔ انھوں نے ایک طرف مہاجر کو جو صنعاء میں تھے اور دوسری طرف عکرمہ کو جو دبا میں تھے زیاد کی مدد کے لئے بھیجا۔ دبار کا فاصلہ چونکہ حضرموت سے بہت زیادہ تھا اور راستہ دشوار گذار، عکرمہ دیر سے پہنچے، نجیر چار دن پہلے فتح ہو چکا تھا (الکتفاء صفحہ ۲۶۹-۲۷۰)

۱۹- مہاجرین اُمیّہ کے نام

نعمان بن جون ایک کندی رئیس تھے، ان کی ایک حسین لڑکی تھی جس کا نام اسمار تھا، یہ بھی کہا گیا ہے کہ اسماء لڑکی نہیں بہن تھی۔ وہ رسول اللہ سے رشتہ کرنا چاہتے تھے۔ وہ رسول اللہ سے ملے اور کہا کہ میں ایک حسین ترین بیوہ سے آپ کی شادی کرنا چاہتا ہوں، اسماء کے شوہر کا انتقال ہو چکا تھا۔ عربوں میں ایک سے زیادہ شادی کرنے کا رواج عام تھا۔ قبائلی نظام میں "تعداد" کو خاص اہمیت حاصل تھی، جو خاندان جتنا بڑا ہوتا، اور جو قبیلہ جتنا شلخ در شاخ اور گھنا ہوتا، قبائلی نظام میں اس کی طاقت، رسوخ اور خوش حالی اتنی ہی زیادہ ہوتی، چھوٹے خاندان نہ تو اپنے قبیلہ میں معزز سمجھے جاتے، لڑائی یا بیرونی حملہ کے وقت (جن کا خطرہ ہر وقت سر پر منڈلاتا رہتا) اپنی دفاع کر سکتے۔ تعداد بڑھانے کے لئے تعددِ ازواج ضروری تھا، اس کے علاوہ جس شخص کی

ایک سے زیادہ بیویاں ہوتیں، اس کو ایک اجتماعی امتیاز حاصل ہوتا، وہ مالدار سمجھا جاتا، اس کی بات سُنی اور مانی جاتی، قبائلی رئیسوں کی اجتماعی حیثیت تعددِ ازداج سے پائی جاتی تھی، تعددِ ازواج کے معنی تھے کہ اپنے ماتحت قبیلہ کے علاوہ اس کی بیویوں کے سارے خاندان اس کے پیچھے ہیں اور بیرونی حملہ یا لڑائی کے وقت اس کی مدد کریں گے۔ رسول اللہ کے تعددِ ازدواج کا غالب مقصد بھی یہی تھا یعنی اپنی اجتماعی حیثیت بڑھانا، اور اسلام کی پشت پناہی اور اشاعت کے لئے عزیز و اقارب کا حلقہ وسیع سے وسیع تر کرنا۔

ربیع الاول ۹ھ میں رسول اللہ کی اسمار سے شادی ہوگئی (زُرقانی بحوالہ ابن سعد) پہلی ملاقات میں رسول اللہ نے اسمار کے جسم پر برص کے داغ دیکھ کر طلاق دے دی، ایک روایت یہ ہے کہ جب اسمار بیاہ کر رسول اللہ کے گھر آئیں تو انھوں نے رسول اللہ سے کہا: "میں تم سے خدا کی پناہ مانگتی ہوں،، اس قول کا ایک دلچسپ پس منظر بیان کیا گیا ہے، اسمار حسین تھیں۔ اس لئے رسول اللہ کی دوسری بیگموں کو حسد ہوا اور انھوں نے چاہا کہ وہ رسول اللہ کی بیوی نہ بنیں، جب اسماء بیاہ کر آئیں تو ایک بیوی نے کہا: اگر تم رسول اللہ کی چہیتی بننا چاہتی ہو تو جب تمھاری پہلی ملاقات ہو تو کہنا: "میں تم سے خدا کی پناہ مانگتی ہوں"۔ رسول اللہ یہ سُن کر حیران ہوئے اور صبح کو نعمان سے اس کی شکایت کی۔ نعمان نے اُس کی کوئی معقول یا غیر معقول تردید یا توجیہ کردی اور لگے اسماء کی خوبیاں بیان کرنے، اسماء کی ایک بڑی خوبی انھوں نے یہ بیان کی کہ وہ کبھی بیمار نہیں ہوئیں۔ رسول اللہ کو یہ بات کھٹکی اور انھوں نے کہا: اگر خدا کی میزان میں اس کا درجہ بلند ہوتا تو کبھی نہ کبھی ضرور بیمار ہوتی"۔ رسول اللہ نے اسماء کو طلاق دے دی۔ واللہ اعلم بکنہ الامر وصدق ھذہ المرویات .... اصابہ، مصر، ۳۰/ ۵۶۰، سیرۃ الحلبیۃ علی بن برہان الدین حلبی مصر ۳/ ۴۲۱ - ۴۲۲، طبری ۳/ ۱۷۹ شرح مواہب اللدنیۃ، زُرقانی مصر، ۳/ ۳۱۳، تاریخ ابن اثیر مصر ۲/ ۱۲۹۔

اس کے بعد ہم نعمان اور اسمار کے حالات سے یکسر بے خبر رہتے ہیں حتیٰ کہ اچانک اسمار ۱۲ھ میں عدن کے افق پر ابھرتی ہیں اور عکرمہ بن ابی جہل اسلامی فوج کے کمانڈر عمان اور مہرہ میں ارتداد کی جڑیں کاٹتے ہوئے جب عدن پہنچتے ہیں تو اسمار سے نکاح کر لیتے ہیں۔ نکاح کے بعد عکرمہ زیاد کی مدد کرنے عدن سے یلغار کرتے ہیں اور جب یمن کے مشہور شہر جَنَد پہنچتے ہیں تو ان کی اسمار سے پہلی ملاقات ہوتی ہے، ذرا دم لے کر عکرمہ پھر چل پڑتے ہیں اور جیسا کہ پہلے ذکر ہوا، سبا کے قدیم پایۂ تخت مآرب میں مہاجر بن اُمیّہ سے ان کی ملاقات ہوتی ہے جو زیاد کی مدد کرنے صنعار سے حضرموت چلے جا رہے ہیں، مآرب میں عکرمہ کی فوج کے بعض لوگ غالباً صحابی، جن کو اسمار کی رسول اللہ سے شادی اور طلاق کا علم ہوتا ہے عکرمہ کو رائے دیتے ہیں کہ اسمار سے قطع تعلق کر لیں اور فوج کا ایک دوسرا فریق رشتہ کو باقی رکھنے کی تائید کرتا ہے۔ یہ معاملہ اس وقت تک معلق رہتا ہے جب تک نُجَیر کی صُلح نہیں ہو جاتی، اس سے فارغ ہو کر مہاجر بن اُمیّہ خلیفہ سے اسمار کے بارے میں رُجوع کرتے ہیں اور دریافت کرتے ہیں کہ آیا اسمار سے عکرمہ کا رشتہ برقرار رکھا جائے یا توڑ دیا جائے یہ ہے ذیل کے خط کا سیاق و سباق یا یوں سمجھئے کہ یہ ہے وہ سیاق و سباق جو میری سمجھ میں آیا ہے، ہمارے راویوں نے اس موقع پر سخت ابہام و ایجاز سے کام لیا ہے، قاری پیاسا رہ جاتا ہے اور کئی اہم سوالوں کے اس کو جواب نہیں ملتے۔

"اس کے (اسمار کے) والد نُعمان بن جَون رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور اس کی اتنی تعریف کی کہ رسول اللہ نے (مجبور ہو کر) اسمار کو لانے کا حکم دیا، (یعنی میکہ سے جو مدینہ سے باہر تھا) جب نُعمان اسمار کو لے کر (مدینہ) آئے تو انھوں نے کہا: اسمار کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ وہ کبھی بیمار نہیں ہوئی"، رسول اللہ نے فرمایا: اگر خدا کی میزان میں

وہ اچھی ہوتی تو کبھی نہ کبھی ضرور بیمار ہوتی" رسول اللہ نے اس سے منہ موڑ لیا تم بھی موڑ لو"۔۔۔ طبری - ۳/۲۷۶ -

اِس خط سے یہ تو بالکل ثابت نہیں ہوتا کہ رسول اللہ نے اسمار سے شادی کر لی تھی، صرف اتنا واضح ہوتا ہے کہ رسول اللہ شادی کے لئے تیار ہو گئے تھے اور شاید یہ بھی نعمان اور اُن کے قبائل کی تالیفِ قلب کے لئے لیکن نعمان کی زبان سے آخری تعریفی جملہ سن کر انھوں نے شادی کا ارادہ ترک کر دیا۔

۲۰- مہاجر بن اُمیہ کے نام

سیف بن عمر نے اس خط کا سیاق وسباق بیان نہیں کیا، قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ قلعۂ نجیر کے سقوط کے بعد لکھا گیا۔ مسلمانوں نے بنو کندہ کو بری طرح پامال کیا تھا، ان کے بہت سے خاندان تباہ ہو گئے تھے، اور جو لوگ زندہ رہ گئے تھے ان کے دل سخت زخمی اور جذبات انتہائی مشتعل تھے، تلوار اُٹھانے کی توان میں ہمت نہ تھی، زبان چلا کر دل کا غبار نکال سکتے تھے۔ مہاجر کے سامنے مختلف اوقات میں دو ڈومنیاں لائی گئیں، ایک نے رسول اللہ کی برائی میں شعر گائے تھے، دوسری نے مسلمانوں کی مذمت میں، مہاجر نے پہلی کا ہاتھ کٹوا دیا اور سامنے کے دانت اکھڑوا دیے، حضرت ابو بکر کو اس کی خبر ہوئی تو انھوں نے یہ مراسلہ بھیجا:

"مجھے اُس سزا کا علم ہوا جو تم نے رسول اللہ کی برائی میں شعر گانے والی عورت کو دی ہے، اگر تم یہ سزا نہ دے چکے ہوتے، تو میں یقیناً تمھیں اس کے قتل کا حکم دیتا، انبیار کے خلاف جرم کی سزا عام لوگوں کے خلاف جرم کی سزا کے برابر نہیں ہے، اگر کوئی مسلمان نبی کی توہین و تنقیص کرے گا تو اس کو مرتد کی سزا دی جائے گی، اور یہ جرم اگر کسی معاہد سے سرزد ہوگا، تو گویا

اس نے معاہدہ توڑ دیا اور اس سے جنگ کی جائے گی۔" سیف۔طبری ۳/۲۷۷۔

۲۱۔ دوسرا خط :۔

جس ڈومنی نے مسلمانوں کی مذمت میں شعر گائے تھے، مہاجر نے اس کو بھی وہی سزا دی جو رسول اللہ کی ہجو میں شعر گانے والی کو دی تھی، حضرت ابو بکر کو یہ معلوم ہوا تو وہ مہاجر پر سخت برہم ہوئے، رسول اللہ کی بے حرمتی کی نہ سخت سے سخت سزا دینے کو تیار تھے، پر مسلمان کی بے حرمتی کرنے والے کو سخت جسمانی سزا دینا یا اس کا مُثلہ کرنا ان کی نظر میں ظلم عظیم اور انسانیت سے گرا فعل تھا، چنانچہ انھوں نے مہاجر کو یہ مراسلہ بھیجا جس میں نصیحت اور عتاب دونوں کی آمیزش ہے :۔

" مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم نے اُس عورت کا ہاتھ کٹوا دیا اور اس کے اگلے دانت اکھڑوا دئے جس نے مسلمانوں کی ہجو میں شعر گائے تھے، (اس سلسلہ میں صحیح طریق کار یہ تھا کہ) اگر ہجو کرنے والی مسلمان ہوتی تو اس کو ڈانٹ پھٹکار دیا جاتا اور مُثلہ سے کم سزا دی جاتی، اور اگر ذمیہ ہوتی تو میری جان کی قسم تم جب اس کے شرک جیسے جرم عظیم پر چشم پوشی کر چکے، تو ہجو تو اس کے مقابلہ میں معمولی بات تھی، اگر میں ہجو کی سزا کے بارے میں تم کو پہلے ہدایت کر چکا ہوتا (اور پھر بھی تم وہ سزا دیتے جو تم نے دی) تو تمھیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا، (یعنی معزول کر دئے جاتے، یا مالی تاوان دینا پڑتا) طیش میں آکر کوئی کام نہ کرو، مُثلہ کی سزا نہ دو، مثلہ سنگین گناہ ہے، اور اسلام سے منحرف کرنے والا تشدد، صرف "قصاص" کے لئے مُثلہ کی سزا دی جا سکتی ہے۔"

... سیف طبری ۳/۲۷۷۔

۲۲- دوسرا نسخہ :-

اس سے ملتا جلتا خط مشہور مورخ مدائنی کی زبانی، انساب الاشراف (مُصوّر) میں بلاذری نے بھی نقل کیا ہے۔ مدائنی کہتے ہیں کہ فتح نُجیر کے بعد مہاجر بن اُمیہ کے پاس ایک ڈومنی لائی گئی جس نے رسول اللہ یا مسلمانوں کی نہیں۔ بلکہ حضرت ابوبکر کی ہجو میں شعر گائے تھے، مہاجر نے اس کا ہاتھ کٹوا دیا (دانت اکھڑوانے کی مدائنی خبر نہیں دیتے) اس واقعہ کی خبر ابوبکر کو ہوئی تو بہت آزردہ ہوئے اور مہاجر کو یہ خط بھیجا :-

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم نے ایک عورت کو پکڑا جس نے مجھے گالیاں دی تھیں، اور اس کا ہاتھ کاٹ دیا، خدا نے تو شرک جیسے جرمِ عظیم کا انتقام نہیں لیا، مُثلہ کی سزا تو کھلے کفر میں نہیں دی جاتی، خیر تم نے جو کیا ٹھیک کیا؟ (ففعلت حقاً وعملت مجسن؟) میرے اس خط کے بعد آئندہ ایسے موقعہ پر طیش سے کام نہ لینا۔ کسی کا مُثلہ نہ کرنا، کیوں کہ یہ سنگین گناہ ہے خدا اہل اسلام (اسلام واھل؟) کے طیش اور فرطِ غضب سے پاک ہونے کا اعلان کر چکا ہے، رسول اللہ کے ہاتھ ایسے لوگ آئے جنہوں نے انھیں ستایا تھا، ان کو گالیاں دی تھیں، وطن سے نکالا تھا اور جنگ کی تھی، لیکن آپ نے کبھی ان کا مُثلہ نہیں کیا" انساب الاشراف مُصوّر جامعہ الدول العربیۃ قاہرہ، ۹/۹۱ھ۔

۲۳- سالارانِ رِدّۃ کے نام

عُمان، یمن، حضرموت وغیرہ میں جب ردہ کی وبا دور ہوئی اور اسلام کا اقتدار دوبارہ قائم ہو گیا تو ان علاقوں میں سرکاری عہدوں اور انتظام کے لئے عملہ کی ضرورت پڑی اور یہ سوال پیدا ہوا کہ کس کو قبائلی نمایندگی اور سرکاری خدمت سونپی جاتے اور کس کو نہیں،

تو اس سلسلہ میں خلیفہ نے ایک عام پالسی وضع کی اور ذیل کا مراسلہ سارے سالارانِ ردہ کو بھیجا :"

"سرکاری خدمت کے لئے میں ان لوگوں کو سب سے زیادہ مناسب سمجھتا ہوں جو نہ تو خود مرتد ہوئے ہوں اور نہ اُن کا تعلق ایسے لوگوں سے ہو جو اسلام سے منحرف ہوئے ہوں : آپ سب اسی اصول پر عمل کیجیے اور بس ان ہی لوگوں کو مقرب بنائیے اور عہدے دیجیے۔ فوج کے جو مسلمان وطن لوٹنا چاہیں ان کو اس کی اجازت دیجیے اور جو عرب مرتد رہ چکے ہوں ان سے دشمن کی لڑائی میں مدد نہ لیجیے :"

.... طبری ۳/ ۲۷۶۔

ماہنامہ اذان
کا
ادب نمبر

ستمبر ۵۶ء کے مہینے میں انشاء اللہ پوری آب و تاب کے ساتھ دفتر اذان سرنگر سے شائع ہوگا اس نمبر میں آپ اعلےٰ درجہ کے پُر مغز مقالے - پُر سوز غزلیں ، حقیقت افروز افسانے ، اور بناء بر واقعات تمثیلیں ملاحظہ فرمائیں گے - اذان کا ادب نمبر تعمیر پسند ادب کا بیش قیمت ذخیرہ ہوگا۔

ضخامت ۱۴۶ صفحات - قیمت صرف بارہ آنے - مستقل خریداروں کو سالانہ چندہ میں -

آج ہی اذان کا سالانہ چندہ صرف تین روپے ارسال فرما کر یہ خاص نمبر بھی حاصل کریں اور ایک سال تک اذان کا مطالعہ فرمائیں - المعلن منیجر ماہنامہ اذان برزلہ سرنگر

شعر عربی کی مختصر تاریخ

از

جناب پروفیسر ڈاکٹر سید رغیب حسین ایم، اے، پی ایچ ڈی، صدر شعبۂ فارسی بریلی کالج۔ بریلی

(۳)

(۱۰) عبید علقمہ

ادبار کا اختلاف ہے کہ عبید بن الابرص اور علقمہ میں سے کس کو دسواں صاحب معلقہ مانیں۔ بعض نے اول کو مانا ہے بعض نے ثانی کو ہم دونوں کے حالات درج کئے دیتے ہیں کہ اگر ان میں سے کوئی صاحب معلقہ نہ بھی ہو تو کم سے کم مشہور جاہلی شاعر تو ضرور ہے

تذکرہ اس کا نام عُبید تھا اور اس کے باپ کا نام ابرص تھا قبیلہ بنو اسد کا رہنے والا تھا۔ یہ امرؤ القیس کا ہمعصر تھا اور شعر گوئی میں دونوں میں نوک جھونک چلا کرتی تھی۔ مشہور ہے کہ یہ شخص اوائلِ شباب میں شعر نہیں کہتا تھا۔ ایک بار یہ اور اس کی بہن دونوں ساتھ ساتھ کہیں جا رہے تھے۔ کہیں سے کچھ لوٹ کا مال ملا۔ دونوں نے وہ مال گھر لانا چاہا۔ خاندان والوں میں سے کسی نے دیکھا اس نے دونوں کو منع کر دیا۔ اسے بہت صدمہ ہوا۔ دل شکستہ ہو کر خدا سے گریہ وزاری کرتا دعا مانگتا مانگتا سو گیا، خواب میں چند اشعار اس کے ذہن میں آئے۔ جاگا تو وہ تمام اشعار اس کے حافظہ میں محفوظ تھے۔ بس اُسی دن سے شعر کہنے لگا اور تھوڑے ہی عرصہ میں باکمال شاعر ہو گیا کہ امرؤ القیس سے ٹکر لینے لگا۔ اس نے بہت طویل عمر پائی۔ اس کی موت کا قصہ بہت دردناک ہے۔ منذر بن ماء السماء بادشاہ نے ایک بار نشہ کی حالت میں اپنے دو مصاحبوں کو بے قصور قتل کرا دیا اور دفنا دیا۔ جب صبح ہوئی اور اس کو سارا واقعہ بتایا گیا تو بہت پچھتایا۔ اُس دن سے اُس نے عہد کیا کہ سال بھر میں دو دن ان کی قبروں کی مجاوری میں گزارے گا۔ اس طرح کہ پہلے دن جو شخص سب سے پہلے اس کے سامنے سے گزرے گا خواہ وہ کوئی بھی ہو منذر اُسے سو اونٹ انعام دے گا اور دوسرے دن جو شخص سب سے پہلے اس کے سامنے سے

گزرے گا منذر اسے قتل کردے گا چاہے وہ کوئی ہو۔ اتفاق ایسا ہوا کہ عبید ایک سفر میں صبح کو ادھر ہی سے گزر رہا تھا اور وہ منذر کے قیام کا دوسرا دن تھا۔ بس منذر نے اپنی منت کے مطابق عبید کو بے قصور قتل کر ڈالا یہ واقعہ ۵۵۵ء کا ہے۔

تبصرہ ۱۔ بہادری اور فخر کے مضامین میں اس کا کلام عنترہ بن شداد عبسی کے کلام سے بہت ملتا جلتا ہے۔

۲۔ امرؤ القیس جیسے قادر الکلام شاعر سے چوں کہ اس کو مقابلہ کرنا پڑتا تھا اس لئے بڑی کاوش و محنت سے شعر کہتا پھر اس پر بار بار نظر ڈال کر ان کو زیادہ سے زیادہ جلا دیتا۔ اس وجہ سے اس کا کلام بہت مقبول ہوتا تھا۔

۳۔ بعض ناقدین ادب کا خیال ہے کہ یہ بھی صفِ اول کے شعرا میں ہے اور اس کا وہ قصیدہ ——— جس کا مطلع یہ ہے :-

اقفر من اهله ملحوب   فالقطبيات   فالذنوب

دیگر قصائد معلقات کا ہم پلّہ ہے۔ اس لئے "معلقات عشر" کے شعرا کی فہرست میں اس کا نام بھی لیتے ہیں۔

۴۔ اس کی طویل عمری اور پختہ کاری کے آثار اس کے کلام میں پائے جاتے ہیں یعنی حکمت و نصیحت سے اس کے اشعار پُر ہیں۔

(۱۱) علقمہ

تذکرہ اس کا نام علقمہ اور اس کے باپ کا نام عبدہ تھا یہ بنو تمیم کا رہنے والا تھا یہ بھی امرؤ القیس کا ہم عصر اور ہمسر تھا امرؤ القیس کی اس سے بھی چشمک رہا کرتی تھی۔ ایک دن دونوں اپنی شاعری کو حریف کی شاعری پر ترجیح دے رہے تھے علقمہ نے کہا اچھا آؤ آج ہمارا تمہارا مقابلہ بدیہہ۔ شعر گوئی میں ہو۔ امرؤ القیس بولا اچھا میں تیار ہوں لیکن افضلیت کا فیصلہ کون کرے گا۔ علقمہ نے کہا میں تمھاری ام جندب ہی کو حکم اور پنچ مانے لیتا ہوں وہ جو فیصلہ

کرے دونوں کو ماننا پڑے گا۔ امرؤالقیس راضی ہو گیا۔ ام جندب نے کہا اچھا تم دونوں اپنے اپنے گھوڑے کی تعریف میں ایک ہی ردیف قافیہ میں شعر کہو۔ امرؤالقیس نے جو اشعار کہے ان کا مطلع یہ تھا:۔

خلیلیَّ! مُرّا بی علی ام جندب لنقضی لبانات الفواد المعذّب

اس میں اس نے گھوڑے کے متعلق یہ شعر کہا:۔

فللسّوط الھوبٌ وللسّاق درّۃٌ وللزجر منہ وقع اھوج منعب

اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ گھوڑا کوڑے سے بھڑک اٹھتا ہے ایڑ سے بھی اُسے چوٹ سی لگتی ہے اور ڈانٹ کا اثر بھی بہت بُرا ہوتا ہے۔

علقمہ نے جو اشعار کہے ان کا مطلع یہ تھا:۔

ذھبت من الھجران فی کل مذھب ولم یک حقاً کلُّ ھذا التجنّب

اس میں گھوڑے کے متعلق اس نے یہ شعر کہا:۔

فَاَدْرَکَھُنَّ ثانیاً مِنْ عنانہٖ یمرُّ کمرّ الرائح المتحلّب

یعنی پھر میں اُن شکاروں کو جا پکڑتا ہوں محض اس کی باگ کو اک ذرا موڑ دینے سے پھر تو وہ ہوا سے باتیں کرنے لگتا ہے۔

جب وہ دونوں اپنا اپنا قصیدہ پورا سنا چکے تو ام جندب نے امرؤالقیس سے کہا کہ علقمہ کا قصیدہ تیرے قصیدہ سے بڑھ گیا تو نے اپنے گھوڑے کو کوڑے اور مہمیز کا محتاج بتایا کہ ان کے پڑنے سے وہ بہت تیز چلتا ہے اور علقمہ کہتا ہے کہ محض لگام کے اشارہ سے وہ ہوا سے باتیں کرنے لگتا ہے یہ فیصلہ اپنی بیوی کی زبان سے سُن کر امرؤالقیس کچھ شرمایا اور کچھ برہم ہوا اور اس نے غصہ میں اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ علقمہ نے دیکھا کہ ام جندب پر محض میری وجہ سے یہ مصیبت آگئی تو اُس نے اُسی وقت ام جندب سے خود نکاح کر لیا۔ کیوں کہ جاہلیت میں یہ سب جائز تھا جنگ حلیمہ میں حارث غسانی نے بنو تمیم کے ستر آدمیوں کو قید کر لیا۔

انھیں میں اس کا بھائی بھی گرفتار ہوگیا۔ علقمہ نے چاہا کہ کسی طرح اپنے بھائی کو چھڑائے تو حارث غسانی کی مدح میں ایک زوردار قصیدہ کہا۔ اس کا یہ قصیدہ بہت مشہور ہے۔ مطلع یہ ہے:۔

طحا بك قلبٌ فی الحسان طروبٌ بعید الشباب حیث حان مشیبٗ

بادشاہ نے یہ قصیدہ بہت پسند کیا اور نہ صرف اس کے بھائی کو بلکہ سارے قیدیوں کو رہا کر دیا۔ علقمہ نے ۵۶۱ء میں امرؤ القیس کی موت کے ایک سال بعد انتقال کیا۔

تبصرہ | ۱۔ اس کے کلام میں روانی اور زور امرؤ القیس کی طرح ہے۔ چوں کہ امرؤ القیس کا کلام زیادہ محفوظ رہا اور بعد کے لوگوں کو دستیاب ہوا پھر امرؤ القیس کے کلام میں رنگینیاں اور رنگ رلیاں علقمہ سے زیادہ ہیں اس لئے اس کی شہرت اور مقبولیت زیادہ ہے۔

۲۔ علقمہ کے کلام میں حکمت و دانائی کے مضامین زیادہ ہیں۔

۳۔ منظر نگاری میں علقمہ کو کمال حاصل تھا۔

اس کے کلام کا نمونہ یہ ہے:۔

فان تسئلونی فی النساء فاننی بصیر با دواء النساء طبیبٗ

اذا شاب راس المرء او قل مالہ فلیس لہ فی ودھن نصیبٗ

یردن ثراء المال حیث علمنہ وشرخ الشباب عندھن عجیبٗ

جاہلیت کے صفِ دوم کے شعرا

(۱) مُہلہِل

تذکرہ | اس کا نام عدی اور مُہلہِل لقب تھا۔ اس کی کنیت ابو لیلیٰ تھی اس کے باپ کا نام ربیعہ تھا۔ نجد کے اتر پورب کے حصہ میں جہاں بنو تغلب کی بستیاں تھیں تقریباً ۴۶۱ء میں پیدا ہوا۔ عدی بڑا جری۔ نہایت فصیح اور بہت خوبصورت آدمی تھا بنو تغلب کا

کرے دونوں کو ماننا پڑے گا۔ امرؤالقیس راضی ہو گیا۔ ام جندب نے کہا اچھا تم دونوں اپنے اپنے گھوڑے کی تعریف میں ایک ہی ردیف قافیہ میں شعر کہو۔ امرؤالقیس نے جو اشعار کہے ان کا مطلع یہ تھا :-

خلیلیّ! مرّا بی علی ام جندب لنقضی لبانات الفواد المعذّب

اس میں اس نے گھوڑے کے متعلق یہ شعر کہا :-

فللسّوط الهوبٌ وللسّاق درّةٌ وللزجر منه وقع اهوج منعب

اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ گھوڑا کوڑے سے کھر تک اٹھتا ہے ایڑ سے بھی اسے چوٹ سی لگتی ہے اور ڈانٹ کا اثر بھی بہت برا ہوتا ہے۔

علقمہ نے جو اشعار کہے ان کا مطلع یہ تھا :-

ذهبت من الهجران فی کل مذهب ولم یک حقّاً کلّ هذا التجنّب

اس میں گھوڑے کے متعلق اس نے یہ شعر کہا :-

فادرکهنّ ثانیاً من عنانه یمرّ کمرّ الرائح المتحلّب

یعنی پھر میں ان شکاروں کو جا پکڑتا ہوں محض اس کی باگ کو اک ذرا موڑ دینے سے پھر تو وہ ہوا سے باتیں کرنے لگتا ہے۔

جب وہ دونوں اپنا اپنا قصیدہ پورا سنا چکے تو ام جندب نے امرؤالقیس سے کہا کہ علقمہ کا قصیدہ تیرے قصیدہ سے بڑھ گیا تو نے اپنے گھوڑے کو کوڑے اور مہمیز کا محتاج بتایا کہ ان کے پڑنے سے وہ بہت تیز چلتا ہے اور علقمہ کہتا ہے کہ محض لگام کے اشارہ سے وہ ہوا سے باتیں کرنے لگتا ہے یہ فیصلہ اپنی بیوی کی زبان سے سن کر امرؤالقیس کچھ شرمایا اور کچھ برہم ہوا اور اس نے غصہ میں اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ علقمہ نے دیکھا کہ ام جندب پر محض میری وجہ سے یہ مصیبت آ گئی تو اس نے اسی وقت ام جندب سے خود نکاح کر لیا۔ کیوں کہ جاہلیت میں یہ سب جائز تھا جنگ حلیمہ میں حارث غسانی نے بنو تمیم کے ستر آدمیوں کو قید کر لیا۔

انھیں میں اس کا بھائی بھی گرفتار ہو گیا۔ علقمہ نے چاہا کہ کسی طرح اپنے بھائی کو چھڑائے تو حارث غسانی کی مدح میں ایک زوردار قصیدہ کہا۔ اس کا یہ قصیدہ بہت مشہور ہے۔ مطلع یہ ہے:۔

طحابک قلبٌ فی الحسان طروبٌ　　بعید الشباب حیث حان مشیبٌ

بادشاہ نے یہ قصیدہ بہت پسند کیا اور نہ صرف اس کے بھائی کو بلکہ سارے قیدیوں کو رہا کر دیا۔ علقمہ نے ۵۶۱ء میں امرؤالقیس کی موت کے ایک سال بعد انتقال کیا۔

تبصرہ | ۱۔ اس کے کلام میں روانی اور زور امرؤالقیس کی طرح ہے۔ چوں کہ امرؤالقیس کا کلام زیادہ محفوظ رہا اور بعد کے لوگوں کو دستیاب ہوا پھر امرؤالقیس کے کلام میں رنگینیاں اور رنگ بیاں علقمہ سے زیادہ ہیں اس لئے اس کی شہرت اور مقبولیت زیادہ ہے۔

۲۔ علقمہ کے کلام میں حکمت و دانائی کے مضامین زیادہ ہیں۔

۳۔ منظر نگاری میں علقمہ کو کمال حاصل تھا۔

اس کے کلام کا نمونہ یہ ہے:۔

فان تسئلونی فی النساء فاننی　　بصیر با دواء النساء طبیبٌ

اذا شاب رأس المرء او قل مالہ　　فلیس لہ فی ودھن نصیبٌ

یردن ثراء المال حیث علمنہ　　وشرخ الشباب عندھن عجیبٌ

جاہلیت کے صفِ دوم کے شعرا

(۱) مُہلہِل

تذکرہ | اس کا نام عدی اور مُہلہل لقب تھا۔ اس کی کنیت ابو لیلیٰ تھی اس کے باپ کا نام ربیعہ تھا۔ نجد کے اتر پورب کے حصہ میں جہاں بنو تغلب کی بستیاں تھیں تقریباً ۴۶۰ء میں پیدا ہوا۔ عدی بڑا جری۔ نہایت فصیح اور بہت خوبصورت آدمی تھا بنو تغلب کا

سردار تھا۔ نو عمری ہی میں کھیل تماشے۔ عیش و عشرت، شراب اور جوئے کی عادت پڑ
گئی تھی۔ اس کا یہ حال دیکھ کر اُس کے بڑے بھائی کُلَیب نے "زیرُ النساء" (گھر گھسنا اور
عورتوں کا دیوانہ) رکھ دیا تھا۔ یہ اپنے بڑے بھائی کُلَیب کو قبیلہ کی نگرانی اور ساری ذمہ
داریاں پوری کرتے دیکھ کر خود مطمئن تھا۔ جنگ اور دوسرے ذمہ داریوں کے کاموں سے
الگ اپنی رنگ رلیوں میں مشغول رہتا۔ مگر جب کوئی مشکل کا وقت آپڑتا تو اس
کی خاندانی اور فطری شجاعت اس کے اندر جاگ اُٹھتی چنانچہ سنہ ۴۸۱ء میں یمن کے بنو قحطان
اور معد کے بنو عدنان سے حجاز کے جنوب میں مقام سلّان پر ایک سخت جنگ ہوئی اس
میں عدی بھی اپنے بھائی کُلَیب کے دوش بدوش لڑا اور اس جنگ میں بنو عدنان کی فتح ہوئی۔

مُہلہل کا ایک چچیرا بھائی ہمّام تھا وہ بھی رئیس زادہ اور بد اطوار تھا۔ اُسی کی
صحبت میں مہلہل زیادہ رہتا تھا اور شراب کباب وغیرہ میں زندگی گزارتا۔ ایک دن
دونوں نشے میں چور تھے کہ ایک لونڈی نے آکر ہمام سے کہا کہ کُلَیب کو اس کے سالے
جسّاس نے "بسوس" کے کہنے سے قتل کر دیا ہے اور قتل کے بعد جسّاس ایک تیز گھوڑے
پر سوار ہو کر اپنے قبیلہ بنو بکر میں اپنے باپ مُرّہ کے پاس چلا گیا۔ مہلہل شراب کے نشہ میں تھا اس نے
پوچھا کہ کہو ہمام! کیا خبریں ہیں! ہمام نے کلیب کے قتل کا قصہ سنایا تو مہلہل نے نشہ کے
ترنگ میں کہا "اجی جسّاس کا ہاتھ کلیب تک نہیں پہنچ سکتا۔ یہ کہہ کر پھر شرابنوشی میں مشغول
ہو گیا اور کہنے لگا "آج پیو شراب کل کرنا حساب" جب وہاں سے اُٹھ کر اپنے محلہ میں آیا
تو دیکھا کہ قبیلہ والے کُلَیب کا ماتم کر رہے ہیں اور بعض لوگ شدّتِ غم میں یہ سوچ کر کہ ایسے
زبردست سردار کے مرنے کے بعد نہ اب زندگی کا مزہ ہے اور نہ اب کوئی ایسا ہے جو اس
کا انتقام لے سکے اپنے نیزے توڑنے اور گھوڑوں کو ذبح کرنے پر آمادہ ہیں۔ بس اس حادثہ
اور اس کے ان نتائج نے یکایک اس کے خیالات کا رخ بدل دیا کہ یا تو تغزل اور عورتوں
کے ذکر کے سوا اسے کوئی اور کام نہ تھا نہ اس نے اب تک کسی کا مرثیہ کہا تھا نہ اور کسی مضمون

کو نظم کیا تھا۔ یا اب مرثیہ۔ طلب انتقام۔ کلیب کے مفاخر و فضائل کے سوا اور کسی مضمون کا شعر اس نے کہنا بالکل بند ہی کر دیا۔ یا تو گھر گھسنا تھا یا اب عورتوں کی طرف اسے مطلقاً میلان نہ تھا۔ یا تو اب تک شراب نوشی میں مشغول رہا کرتا یا اب سے جنگ کی تیاری میں مشغول ہو گیا۔ اب پورے قبیلہ کی حفاظت اور خاندانی مفاخر کی امانت سنبھالنے کی ذمہ داری اس کے سر پر تھی اس لئے قوم کے جنگجو افراد کو جمع کیا اور بنو بکر کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ جس کا سلسلہ چالیس برس رہا۔ یہ جنگ "جنگ بسوس" کے نام سے مشہور ہے۔ آخر منذر سوم شاہ حیرہ نے صلح کرادی۔ اس میں مہلہل ہمیشہ فتح پاتا رہا۔ آخر کار ۵۳۱ء میں مہلہل کا انتقال ہو گیا۔ اس کی موت کے متعلق اختلاف ہے کہ کس طرح ہوئی اور کہاں ہوئی۔

۱۔ بعضے کہتے ہیں کہ مہلہل جنگ کی طوالت سے گھبرا گیا تھا اور وہ بڑھاپے میں بنو تغلب کی بستیوں سے نکل کر اپنی ننہال بنو یشکر کی بستی میں چلا گیا اور وہیں مر گیا۔

۲۔ کلبی کا خیال ہے کہ یہ بوڑھا اور جھکی اور چڑچڑا ہو گیا تھا اس کے دو غلام اس کی خدمت کرتے کرتے عاجز آ گئے تھے انھوں نے تنگ آ کر ایک دن اسے قتل کر دیا۔

۳۔ صاحب اغانی لکھتے ہیں:۔ کہ مہلہل عرصہ تک بحرین میں عمرو بن مالک کے یہاں قید تھا۔ وہاں یہ شخص شراب پیتا اور گھر بار کو یاد کر کر کے رویا کرتا تھا۔ تو عمرو بن مالک نے اسے شراب دینا بند کر دیا۔ اس نے بھی غصہ میں دودھ پانی وغیرہ پینا چھوڑ دیا یہاں تک کہ پیاس سے مر گیا۔

تبصرہ ۱۔ یہ سب سے پہلا عرب شاعر ہے جس کا دیوان مدون ہوا اور مختلف قصائد و مراثی۔ دیگر ابیات مرتب کئے گئے۔

۲۔ یہ پہلا شخص ہے جس نے عورتوں کے ذکر کو شعر میں لکھا اور اس طرح لکھا کہ بعض وقت رکاکت اور ابتذال کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔

۳۔ اس کا خاندان اس کے بعد سے برابر ہی شعر گوئی میں مشہور رہا۔ یہ خود زبردست

شاعر تھا پھر اس کا بھانجہ امرؤ القیس اشعر العرب تھا کہ سبعہ معلقہ میں اس کا قصیدہ پہلا ہے پھر اس کا نواسہ عمرو بن کلثوم بھی زبردست شاعر تھا جس کا قصیدہ سبعہ معلقہ میں پانچواں ہے۔

یہ۔ چوں کہ اس نے شعر میں عشق و محبت کے رقیق اور نرم جذبات سب سے پہلے ادا کئے۔ یا یہ کہ اس نے خود ہی ایک جگہ "ہلہلت شعرا" کا لفظ کہا جس کے معنی یہ ہیں کہ میں نے شعر میں نرمی اور رقت کے مضامین ادا کئے۔ اس وجہ سے لوگ اسے مُہلہل کہنے لگے۔

(۲) تأبّط شرّا

تذکرہ اس کا نام ثابت اور باپ کا نام جابر تھا۔ تأبّط شرّا اُسے اس لئے کہا جانے لگا کہ ایک دن یہ شخص قبیلہ والوں کی ایک مشورہ کی کمیٹی میں اس طرح شریک ہوا کہ بغل میں چھُری چھپائے ہوئے تھا کہ نہ معلوم کیا وقت پڑ جائے۔ کسی نے دیکھ لیا تو اس نے شور مچایا کہ "قد تأبّط شرّاً" ارے یہ تو شر اور لڑائی بغل میں چھپائے بیٹھا ہے یہ بڑا ہوشیار اور بڑا بہادر تھا۔ اور یہ شخص بہت تیز دوڑتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ہرن کو دوڑ کر پکڑ لیتا تھا۔ اس کی ساری زندگی لوٹ مار۔ بھاگ دوڑ ہی میں گزری یہ دشمنوں کی پہاڑیوں میں جا کر شہد جمع کیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ دشمنوں کو پتہ لگ گیا وہ اکٹھے ہو کر اسے مارنے اور پکڑنے آئے یہ اس وقت ایک پہاڑی پر شہد جمع کر کے اپنے مشکیزہ میں بھر رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ جس غار میں یہ شہد جمع کر رہا تھا اس کے دہانہ پہ دشمن جمع ہیں اور باہر نکلنے کا راستہ بند ہے مگر یہ مطلق نہ گھبرایا غار میں اور آگے بڑھ کر ایک اور درّہ تھا مگر وہ ایک خطرناک سپاٹ ڈھلوان چٹان تھی جو زمین تک چلی گئی تھی اس راستہ سے جانا موت کو دعوت دینا تھا۔ دشمنوں نے پکار کر کہا کہ "بہت دنوں تک چوری کرتے اور بچ بچ کر نکل جاتے رہے اب پھنس گئے ہو بس اب یا تو قید ہونا پسند کرو یا پھر لڑو۔ آج ہم تمہیں جیتا نہ چھوڑیں گے"۔ اس نے بڑے اطمینان سے کہا نہیں یہ دونوں نہ ہوسکیں گی۔ یہ کہہ کر اس نے ہمت سے کام لیا شہد کو تو اس ڈھلوان چٹان پر بہا دیا پھر اپنی مشک اس پر بچھا دی پھر اطمینان سے

اس پر سینہ کے بل لیٹ کر جو پھسلنا شروع کیا ہے تو دم کے دم میں نہایت اطمینان سے نیچے زمین پر جا پہنچا وہاں پہنچ کر اس نے اپنی راہ لی اور دشمن دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔

(۳) شَنفَریٰ

تذکرہ اس کا نام اَوس اور اس کے باپ کا نام حجر تھا۔ قبیلہ اَزد کا باشندہ تھا اور شنفریٰ اس کا لقب تھا۔ عرب میں ایک عجیب گروہ "صعالیک" کا ہوتا تھا۔ یہ لوگ دراصل تو لوٹ مار۔ چوری۔ بدمعاشی کا پیشہ کرتے تھے مگر لیسا اوقات بھک منگے بن کر کسی کے در پر جا پڑتے۔ اس کا دیا کھاتے۔ اس کے کچھ کام کر دیا کرتے مگر آس پاس کے حالات کی ٹوہ لگاتے رہتے اور کسی شخص یا کسی قبیلہ کو تاک کر اس پر حملہ کرنے اور لوٹنے کے لئے جا کر اپنی جماعت کے اور لوگوں کو بلا لاتے اور لوٹ مار کرتے۔ یہ بہادر مگر مفت خورے اور کام چور ہوتے تھے۔

شنفریٰ بھی انھیں صعالیک میں سے تھا۔ یہ شخص بہت بہادر تھا اور تأبط شرا کی طرح بہت تیز دوڑتا تھا۔ اسے قبیلہ بنو سلامان سے کسی بات پر ضد اور دشمنی پیدا ہو گئی تھی۔ اور اس نے قسم کھائی تھی کہ میں ان کے سَو آدمی قتل کئے بغیر نہ مانوں گا۔ بنو سلامان کو اس کی اس قسم کی اطلاع ہو گئی۔ وہ اپنی حفاظت کے لئے چوکنا رہتے اور یہ اپنی قسم پوری کرنے کی فکر میں رہتا۔ یہ بڑا ہوشیار اور عیار بھی تھا۔ آخر ایک مدت میں جا کر مختلف تدابیر سے اس نے دشمنوں کے ۹۹ آدمیوں کو قتل کر دیا۔ مگر ایک دن اتفاق سے اس کے دشمن اس پر قابو پا گئے اور انھوں نے اسے پکڑ کر کہا اب تیری قسم پوری نہ ہو سکے گی۔ آج ہم تجھے قتل ہی کئے دیتے ہیں۔ اس نے کہا میں نے دل سے سچی قسم کھائی ہے اور خدا کے سامنے عہد کیا ہے اور مجھے پورا یقین ہے کہ میری قسم ضرور پوری ہو گی۔ دشمنوں نے اسے قتل کر دیا۔ اس کی کھوپڑی لڑھکتی ہوئی الگ جا پڑی۔

تھوڑی دیر بعد اتفاق سے اس کے دشمنوں میں سے ایک اس کی کھوپڑی سے ٹھوکر کھا کر کچھ اس بُری طرح گرا کہ مرگیا۔ اس پر دشمن بھی تعجب سے بول اُٹھے کہ واقعی دیکھو اس کی قسم پوری ہوہی گئی کہ مر کر بھی ایک کو لے مرا۔

شنفری کی زندگی اگرچہ لوٹ مار میں گزری مگر یہ بھی عرب کے مشہور بہادر لوگوں میں سے تھا اور یہ مشہور شاعر بھی تھا چنانچہ اس کا لامیہ جو "لامیۃ العرب" کے نام سے مشہور ہے عربی شاعری کا بہترین نمونہ ہے۔

تبصرہ | ۱۔ اسے منظر نگاری میں بڑا کمال حاصل تھا۔

۲۔ فخر اور بہادری کے مضامین اس کی شاعری میں کثرت سے ہیں اور اس میدان میں وہ کسی سے کم نظر نہیں آیا۔

(۴) مُنَخَّل

تذکرہ | اس کا نام منخل اور اس کے باپ کا نام عبید تھا۔ یہ بنو بکر کے مشہور خاندان لیشکر کا باشندہ تھا۔ منخل اور نابغہ دونوں نعمان بادشاہ کے مقرب درباری تھے ان دونوں میں باہم حریفانہ چشمک رہا کرتی تھی۔ نعمان کی ایک بیوی متجردہ بہت حسین تھی۔ منخل اس پر عاشق ہوگیا اور متجردہ بھی منخل کی بہادری اور شاعری کے حالات سن کر اس پر عاشق تھی۔ دونوں باہم خفیہ ملاقاتیں کرتے ایک بار نعمان نے نابغہ سے فرمائش کی کہ میری بیوی متجردہ کی بھی مدح و تعریف کرو۔ نابغہ نے مدح کہی اور ایسی بے مثل کہی کہ نعمان کو شبہ ہونے لگا کہ شاید یہ اس کا عاشق ہے اور شاید اس نے ملکہ کو قریب سے دیکھا ہے۔ بقول غالب ؎

ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا　　بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

منخل کو حریفانہ وار کرنے کا موقع مل گیا اور اس نے بھی نعمان سے نابغہ کی شکایت کردی کہ اس کی نگاہ ملکہ پر کچھ بد معلوم ہوتی ہے۔ نعمان نے اسے قتل کردینا چاہا۔ کسی طرح نابغہ کو اس کی خبر لگ گئی اور وہ جان بچا کر بھاگ گیا جیسا ہم نابغہ کے حالات میں لکھ آئے ہیں۔ اس طرح منخل

نے دربار میں تو اپنا راستہ صاف کر لیا لیکن ایک دن اتفاق سے منخل اور ملکہ متجردہ دونوں خفیہ ایک جگہ بیٹھے راز و نیاز کی باتیں کر رہے تھے کہ نعمان نے دیکھ لیا۔ اُس نے فوراً منخل کو قید کر دیا اور پھر غالباً نہایت خفیہ طور پر اُسے قتل کرا دیا کہ پھر کسی کو اس کی خبر نہ مل سکی کہ منخل کیا ہوا۔ اسی قصہ سے عربی کی ایک مثل بن گئی کہ "لا افعلہ حتی یئوب المنخل" یعنی جب تک منخل نہ لوٹے گا میں یہ کام نہ کروں گا۔ گویا لوگ اس کی واپسی کے منتظر تھے۔

(۵) مرقش

اس کا نام عمرو اور اس کے باپ کا نام سعد تھا اس کا لقب مرقش اکبر تھا۔ یہ بھی بنو بکر کا ایک مشہور شاعر تھا چونکہ اس کے اشعار بہت دلکش ہوتے تھے اس لئے لوگ اسے مرقش کہنے لگے۔ یہ اپنی چچیری بہن اسمار پر عاشق تھا۔ چچا سے شادی کی درخواست کی۔ اس نے منظور کر لی۔ یہ وعدہ لے کر وہ تلاشِ معاش میں پردیس چلا گیا۔ چچا نے کچھ دنوں انتظار دیکھنے کے بعد لڑکی کی شادی ایک دوسرے شخص سے کر دی۔ کچھ دنوں کے بعد جب عمرو واپس آیا تو اسمار کی شادی کا حال سن کر اُسے صدمہ ہوا۔ آخر وہ ایک دوست کو اور اس کی بیوی کو ساتھ لے کر رقیب کی تلاش میں نکلا کہ اُسے قتل کر دے مگر اُسے صدمہ اتنا سخت تھا کہ وہ راستہ ہی میں بیمار پڑ گیا۔ رفیقِ سفر نے اُسے ایک پہاڑ کی غار میں ٹھہرایا اور خود مع اپنی بیوی کے اس کی خدمت کرنے لگا۔ جب اس کی بیماری زیادہ بڑھی تو رفیق نے اپنی بیوی سے مشورہ کیا کہ اب کب تک ہم لوگ اس کی تیمارداری اس تنہائی اور وحشتناک جگہ میں کرتے رہیں صلاح یہ ہوئی کہ اس کو یہیں چھوڑ کر ہم لوگ اپنے گھر واپس چلے جائیں۔ اتفاق سے ان کا یہ فیصلہ عمرو نے سُن لیا اس نے جس طرح گرتے پڑتے اُٹھ کر چپکے سے رفیق کی کاٹھی کی لکڑی پر کوئلہ سے چند اشعار لکھ دئے۔ انھیں اس کی خبر نہیں تھی۔ وہ دونوں ایک دن موقع پا کر سفر کر گئے اور اُسے اُسی جگہ تنہا چھوڑ گئے۔ گھر پہونچ کر ان دونوں نے یہ مشہور کر دیا کہ عمرو مر گیا۔ اتفاق سے عمرو کے بھائی کی نظر ان اشعار پر پڑ گئی اُسے کچھ شک ہوا وہ

تھوڑی دیر بعد اتفاق سے اس کے دشمنوں میں سے ایک اس کی کھوپڑی سے ٹھوکر کھا کر کچھ اس بُری طرح گرا کہ مرگیا۔ اس پر دشمن بھی تعجب سے بول اُٹھے کہ واقعی دیکھو اس کی قسم پوری ہو ہی گئی کہ مرکر بھی ایک کو لے مرا۔

شنفری کی زندگی اگرچہ لوٹ مار میں گزری مگر یہ بھی عرب کے مشہور بہادر لوگوں میں سے تھا اور یہ مشہور شاعر بھی تھا چنانچہ اس کا لامیہ جو "لامیۃ العرب" کے نام سے مشہور ہے عربی شاعری کا بہترین نمونہ ہے۔

تبصرہ | ۱۔ اسے منظر نگاری میں بڑا کمال حاصل تھا۔

۲۔ فخر اور بہادری کے مضامین اس کی شاعری میں کثرت سے ہیں اور اس میدان میں وہ کسی سے کم نظر نہیں آیا۔

(۴) مُنَخَّل

تذکرہ | اس کا نام منخّل اور اس کے باپ کا نام عبید تھا۔ یہ بنو بکر کے مشہور خاندان لیشکر کا باشندہ تھا۔ منخل اور نابغہ دونوں نعمان بادشاہ کے مقرب درباری تھے ان دونوں میں باہم حریفانہ چشمک رہا کرتی تھی۔ نعمان کی ایک بیوی متجردہ بہت حسین تھی۔ منخّل اس پر عاشق ہو گیا اور متجردہ بھی منخّل کی بہادری اور شاعری کے حالات سن کر اس پر عاشق تھی۔ دونوں باہم خفیہ ملاقاتیں کرتے ایک بار نعمان نے نابغہ سے فرمائش کی کہ میری بیوی متجردہ کی بھی مدح و تعریف کرو۔ نابغہ نے مدح کہی اور ایسی بے مثل کہی کہ نعمان کو شبہ ہونے لگا کہ شاید یہ اس کا عاشق ہے اور شاید اس نے ملکہ کو قریب سے دیکھا ہے۔ بقول غالبؔ ؎

ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا　　بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

منخّل کو حریفانہ وار کرنے کا موقع مل گیا اور اس نے بھی نعمان سے نابغہ کی شکایت کردی کہ اس کی نگاہ ملکہ پر کچھ بد معلوم ہوتی ہے۔ نعمان نے اسے قتل کر دینا چاہا۔ کسی طرح نابغہ کو اس کی خبر لگ گئی اور وہ جان بچا کر بھاگ گیا جیسا ہم نابغہ کے حالات میں لکھ آئے ہیں۔ اس طرح منخّل

نے دربار میں تو اپنا راستہ صاف کرلیا لیکن ایک دن اتفاق سے منخل اور ملکہ متجردہ دونوں خفیہ ایک جگہ بیٹھے راز و نیاز کی باتیں کر رہے تھے کہ نعمان نے دیکھ لیا۔ اُس نے فوراً منخل کو قید کر دیا اور پھر غالباً نہایت خفیہ طور پر اُسے قتل کرا دیا کہ پھر کسی کو اس کی خبر نہ مل سکی کہ منخل کیا ہوا۔ اسی قصہ سے عربی کی ایک مثل بن گئی کہ "لا افعلہ حتی یئوب المنخل" یعنی جب تک منخل نہ لوٹے گا میں یہ کام نہ کروں گا۔ گویا لوگ اس کی واپسی کے منتظر تھے۔

(۵) مرقش

اس کا نام عمرو اور اس کے باپ کا نام سعد تھا اس کا لقب مرقش اکبر تھا۔ یہ بھی بنو بکر کا ایک مشہور شاعر تھا چونکہ اس کے اشعار بہت دلکش ہوتے تھے اس لئے لوگ اسے مرقش کہنے لگے۔ یہ اپنی چچیری بہن اسمار پر عاشق تھا۔ چچا سے شادی کی درخواست کی۔ اس نے منظور کرلی۔ یہ وعدہ لے کر وہ تلاشِ معاش میں پردیس چلا گیا۔ چچا نے کچھ دنوں انتظار دیکھنے کے بعد لڑکی کی شادی ایک دوسرے شخص سے کر دی۔ کچھ دنوں کے بعد جب عمرو واپس آیا تو اسمار کی شادی کا حال سن کر اُسے صدمہ ہوا۔ آخر وہ ایک دوست کو اور اس کی بیوی کو ساتھ لے کر رقیب کی تلاش میں نکلا کہ اُسے قتل کر دے مگر اُسے صدمہ اتنا سخت تھا کہ وہ راستہ ہی میں بیمار پڑ گیا۔ رفیقِ سفر نے اُسے ایک پہاڑ کی غار میں ٹھہرایا اور خود مع اپنی بیوی کے اس کی خدمت کرنے لگا۔ جب اس کی بیماری زیادہ بڑھی تو رفیق نے اپنی بیوی سے مشورہ کیا کہ اب کب تک ہم لوگ اس کی تیمارداری اس تنہائی اور وحشتناک جگہ میں کرتے رہیں صلاح یہ ہوئی کہ اس کو یہیں چھوڑ کر ہم لوگ اپنے گھر واپس چلے جائیں۔ اتفاق سے ان کا یہ فیصلہ عمرو نے سُن لیا اس نے جس طرح گرتے پڑتے اُٹھ کر چپکے سے رفیق کی کاٹھی کی لکڑی پر کوئلہ سے چند اشعار لکھ دیئے۔ انھیں اس کی خبر نہیں تھی۔ وہ دونوں ایک دن موقع پاکر سفر کر گئے اور اُسے اُسی جگہ تنہا چھوڑ گئے۔ گھر پہونچ کر ان دونوں نے یہ مشہور کر دیا کہ عمرو مر گیا۔ اتفاق سے عمرو کے بھائی کی نظر اُن اشعار پر پڑ گئی اُسے کچھ شک ہوا وہ

اُن سے پتہ پوچھ کر کچھ لوگوں کو ساتھ لے کر اُسی غار پر پہنچا وہاں عمرو کو زندہ پایا۔ اُسے ساتھ لے کر وطن واپس آیا۔ دوسرے دن وہ اپنے بھائی عمرو مرقش کو اسماء سے ملاقات کرانے اسماء کے گھر لے گیا۔ مگر جیسے جیسے عمرو دیار محبوب سے قریب ہوتا جاتا تھا ویسے ویسے مریض عشق کی حالت ابتر ہوتی جاتی تھی یہاں تک کہ اس کے گھر تک پہنچتے پہنچتے عمرو نے دم توڑ دیا۔ سچ کہا ہے ؎

جان ہی دے دی جگر نے آج پائے یار پر　　عمر بھر کی بیقراری کو قرار آ ہی گیا

(۶) جریر

اس کا نام جریر تھا متلمس اس کا لقب تھا۔ باپ کا نام عبد المسیح تھا۔ قبیلہ بنو بکر کا رہنے والا تھا۔ حیرہ کے بادشاہ عمرو بن ہند کے درباری ہمنشینوں میں سے تھا۔ عرب کا جوانا مرگ شاعر طرفہ اس کا بھانجہ تھا۔ طرفہ اور جریر دونوں بادشاہ حیرہ کے یہاں گئے، بادشاہ نے دونوں کو الگ الگ سربمہر فرمان دیا کہ اسے لے کر تم لوگ بحرین کے گورنر کے پاس جاؤ وہ تم دونوں کو انعام دے گا۔ اس کا قصہ جیسا طرفہ کے حالات میں لکھا جا چکا یہ ہوا کہ جریر نے اپنے پاس کا فرمان کھول کر پڑھوایا تو قتل کا حکم سنا اس لئے اس نے طرفہ کو منع کیا کہ تو بھی اب بحرین کے گورنر کے پاس نہ جا اور میں بھی نہ جاؤں گا۔ مگر طرفہ نہ مانا۔ آخر جریر خود وہاں سے بھاگ کر غسان کے بادشاہوں کے پاس چلا گیا۔ جب جریر کو معلوم ہوا کہ بحرین کے گورنر نے طرفہ کے ہاتھ پاؤں کٹوا کر اسے زندہ دفن کرا دیا ہے تو اس نے حیرہ کے بادشاہ کی مذمت اور ہجو میں ایک زوردار قصیدہ لکھا جو اُس کے بہترین قصائد میں سے ہے۔

(۷) ابو کبیر ھذلی

یہ بنو ہذیل کا مشہور شاعر تھا۔ تابط شرا جو ڈاکو شاعر تھا اور جس کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں۔ اس کے بچپن میں اس کے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ تابط شرا کی ماں نے اسی ابو کبیر

سے نکاح کرلیا تھا۔ ابو کبیر اسی تابط شرا کے گھر میں اس کی ماں کے پاس آیا جایا کرتا تھا۔
جب لڑکا بڑا ہوا تو اسے ابو کبیر کا اس کی ماں کے پاس آنا جانا بُرا معلوم ہوا۔ ابو کبیر بھی بھانپ
گیا۔ اس نے بیوی سے مشورہ لیا اس نے کہا کہ ہو سکے تو اس لڑکے کو جنگل میں لے جا کر کسی
طرح مار ڈالو۔ اس مشورہ کے بعد اس نے ایک دن لڑکے سے پوچھا " میاں! کسی لڑائی
میں شریک ہونا بھی چاہتے ہو یا نہیں؟ اس نے کہا کیوں نہ شریک ہوں گا۔ اور میرا کام
کیا ہے؟ تو ابو کبیر اسے ایک ایسے قبیلہ کی طرف لے گیا جس سے اس کی قدیم دشمنی تھی۔ جب
وہ بستی قریب آئی تو ابو کبیر نے کہا مجھے بڑی بھوک لگی ہے۔ کہیں سے کوئی چیز کھانے کو لادو۔
مطلب یہ تھا کہ یہ لڑکا بستی والوں میں جائے گا۔ میرا نام لے کر اپنا نام اور پتہ بتائے گا تو وہ
لوگ اسے مار ڈالیں گے۔ میرا نام سننے کے بعد وہ اسے قتل کئے بغیر نہ چھوڑیں گے۔ اس طرح
بغیر میری شرکت کے لڑکا قتل ہو جائے گا اور قصہ پاک ہو جائے گا۔ غرض لڑکا چلا۔ بستی سے
باہر اس نے دو آدمیوں کو روٹیاں پکاتے دیکھا۔ سوچنے لگا کہ کس تدبیر سے ان کا کھانا چھینوں
آخر کچھ سوچ کر پہلے تو بے دھڑک اس کے پاس تک چلا گیا وہ دونوں اسے دیکھ کر مارنے
لپکے۔ یہ بھاگا۔ تو ایک تو واپس آکر روٹیاں پکانے لگا اور دوسرا کچھ دور تک اس کے پیچھے دوڑتا
رہا تابط شرا تھا تو لڑکا مگر بہت تیز دوڑتا تھا آخر وہ تھک کر ایک جگہ بیٹھ گیا تاکہ زرا دم لے
کر اپنے ساتھی کے پاس واپس آجائے۔ تابط شرا کچھ دور جا کر پلٹا اور چھپتے چھپتے قریب آکر
ایک تیر اس زور سے اسے مارا کہ وہیں تڑپ کر مر گیا۔ اس کے بعد چھپا چھپا دوسرے آدمی
کے قریب پہنچا اور اسے بھی تیر مار کر ختم کر دیا۔ تابط شرا نے روٹیاں لیں اور لاکر سوتیلے باپ کے
سامنے رکھ دیں۔ اور ان کے حاصل کرنے کا سارا قصہ سنا دیا وہ اس کی بیباکی، بہادری
اور چالاکی پر تعجب کرنے لگا۔ اس کے بعد اُٹھ کر ایک دوسری طرف چلا اور معلوم نہیں کس طرح
کچھ اونٹ کہیں چر رہے تھے اور اس کے مالک کچھ غافل تھے بس یہ نہایت اطمینان سے انھیں
ہنکا لایا اور باپ کے قبضہ میں دئے۔ اب دونوں اونٹ پر سوار ہو کر ایک طرف چلے ابو کبیر اسے

قتل کرنے کا موقع تلاش کرتا رہا۔ آخر ایک جگہ دونوں رات بسر کرنے کے لئے ٹھہرے۔ ابو کبیر نے سوچا کہ آج رات کو میں جاگتا رہوں اور یہ لڑکا جب سو جائے تو میں اسے قتل کر کے اونٹ لے کر اپنی بیوی کے پاس چلوں۔ یہ سوچ کر اس نے لڑکے سے کہا آدھی رات تک تم سو رہو میں جاگتا ہوں۔ پھر میں تم کو نصف شب کے بعد جگا کر خود سو جاؤں گا اس طرح باری باری جاگ کر ہم اونٹوں کی حفاظت کر سکیں گے۔ چنانچہ ابو کبیر جاگتا رہا اور لڑکا سو گیا جب ابو کبیر نے سمجھا کہ اب وہ غافل سو گیا ہے تو اس نے امتحان کے لئے پہلے ایک کنکری لڑکے پر پھینکی۔ تأبط شرا ایسی چوکنا نیند سوتا تھا کہ کنکری پڑتے ہی فوراً اُٹھ بیٹھا اور پوچھنے لگا کیا بات ہے مجھے کیوں جگایا۔ ابو کبیر نے یہ کہہ کر بات بنائی کہ مجھے کچھ چوروں کا کھٹکا اُس طرف سے ہو رہا ہے۔ لڑکا بہت نڈر تھا۔ باپ سے یہ سُن کر اُسی طرف چوروں کی تلاش میں چلا اور اکیلے جا کر چاروں طرف دیکھ آیا وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ آ کر پھر سو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ابو کبیر نے سمجھا کہ اب یہ خوب غافل سو چکا ہے اب نہ جاگے گا یہ سوچ کر امتحاناً پھر کنکری پھینکی یہ پھر جھٹ پٹ اُٹھ بیٹھا اور پوچھا کیا ہے۔ اُس نے کہا وہ دیکھو اُدھر سے کوئی درندہ شاید آ رہا ہے لڑکا پھر اکیلا جا کر اِدھر اُدھر ہر طرف دیکھ آیا کچھ بھی نہ تھا۔ لڑکا پھر سونے کے لئے لیٹا تو باپ سے کہنے لگا کہ اب اگر تم نے مجھ کو بلا وجہ جگایا تو خدا کی قسم میں تم کو قتل کئے بغیر نہ چھوڑوں گا۔ یہ کہہ لڑکا سو گیا اس کے بعد ابو کبیر بھی سو گیا۔ صبح دونوں باپ بیٹے اونٹ ہمراہ لئے گھر واپس آئے ابو کبیر نے بیوی سے سارا قصہ کہہ سنایا اور اپنی جان کے خوف سے اُس نے اس بیوی سے نکاح کا تعلق ختم کر دیا یعنی طلاق دے دی۔ مگر وہ برابر تأبط شرا کی چالاکی۔ بیباکی۔ بہادری اور غیرت وغیرہ کی تعریفیں کرتا رہا۔ چنانچہ اس کی نظم تأبط شرا کی تعریف میں حماسہ میں بھی موجود ہے جس کا مطلع یہ ہے:۔

ولقد سریتُ علی الظلام بمغشم

(۸) امیّہ

اس کا نام اُمیّہ اور اس کے باپ کا نام صَلت تھا۔ یہ طائف میں محلہ بنو ثقیف کا ایک

سنجیدہ اور باوقار آدمی تھا۔ یہود و نصاریٰ کی صحبت میں رہ کر کتبِ آسمانی کے وقائع اور احکام سے اس نے خوب واقفیت حاصل کرلی تھی۔ اس لئے شراب خواری۔ بُت پرستی اور قمار بازی سے اسے بہت نفرت تھی۔ اس نے انھیں سے سُن سُن کر اپنے پڑوسی قبائل کو خبر دے رکھی تھی کہ عرب میں عنقریب ایک نبی پیدا ہونے والے ہیں کیونکہ یہود اور نصاریٰ کی کتابوں میں ان کی آنے کی اطلاع اور علامات لکھی ہیں لیکن دل میں سمجھتا تھا کہ وہ نبی میں ہی ہوں۔ اس نے اکثر قصائد میں خدا کی حمد و توحید۔ فرشتوں کا ذکر۔ انبیاء سابقین علیہم السلام کے بعض واقعات۔ جنت اور دوزخ کا بیان کیا ہے۔ لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بنوت کا اعلان فرمایا تو یہ شخص حسد کے مارے بیتاب ہوگیا۔ اور لوگوں کو آپ کے خلاف ورغلانے لگا۔ جنگ بدر کے مشرک مقتولین کا مرثیہ کہہ کر لوگوں کو اسلام کے خلاف بہت اُبھارا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اس کے اشعار سنے تو فرمایا اس کی زبان مومن ہے مگر دل کافر ہے۔ یہ زاہدانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ ۶۲۴ء میں مرا۔

(۹) بَرّاق

اس کا نام بَرّاق اور اس کے باپ کا نام روحان تھا۔ یہ بنو تمیم کی بستی کا باشندہ تھا۔ بچپن میں اپنے گھرانہ کے اونٹ چرانے ایک طرف نکل جاتا تھا راستہ میں ایک عیسائی راہب کا مکان پڑتا تھا۔ یہ اس کی عبادت کے طریقوں کو دیر دیر تک دیکھتا رہتا تھا یہ دیکھ کر راہب نے اُسے عیسائی مذہب کی تعلیم دینی شروع کردی۔ آخر یہ بھی عیسائی ہوگیا۔ شہسواری اور شاعری میں یہ بڑا ماہر اور مشّاق تھا۔ بنو ربیعہ کا طرفدار بن کر بنو طے سے جنگ کی آخر بوڑھا ہو کر ۵۲۵ء میں مرا۔

(۱۰) حاتم طائی

اس کا نام حاتم اور باپ کا نام عبداللہ تھا۔ بنو طے کا رہنے والا تھا۔ یہ بچہ ہی تھا کہ اس کا باپ عبداللہ مرگیا۔ ماں کے پاس کافی مال تھا اور وہ اسے نہایت دریا دلی سے

حاجت مندوں اور غیر حاجت مندوں میں تقسیم کرتی تھی یہ دیکھ کر بھائیوں نے منع کیا۔ مگر یہ سخاوت سے باز نہ آتی تھی۔ آخر انھوں نے اس کی سخاوت کو فضول خرچی سمجھ کر اسے یہ سزا دی کہ اس کا سارا مال تو اپنے قبضہ میں کیا اور اسے قید کر دیا اور ایک ایک چیز کو اسے بہت ترساتے رہے تاکہ اس قید کے بعد جب پھر اسے اس کا مال واپس ملے گا تو یہ اس کی قدر کرے گی۔ کچھ دنوں کے بعد اسے قید سے رہا کیا اور امتحان کے لئے پہلے اسے تھوڑا سا مال دیا۔ اتفاق سے تھوڑی ہی دیر بعد اس کے پاس ایک مصیبت زدہ عورت بھیک مانگتی آئی۔ حاتم کی ماں نے وہ سارا مال اٹھا کر اس عورت کو دے دیا اور کہا کہ چوں کہ میں خود ناداری کی سخت تکلیف بھگت چکی ہوں اس لئے اب میں نے عہد کیا ہے کہ کسی کی حاجت پوری کرنے میں دیر نہ لگاؤں گی۔ اسی ماں کی تربیت کا یہ اثر تھا کہ حاتم سخاوت میں ضرب المثل بن گیا یہاں تک کہ اس کی سخاوت کے متعلق بہت سے قصے فرضی گھڑ لئے گئے، اس کی سخاوت کا ایک قصہ یہ ہے کہ باپ کے مرنے کے بعد یہ دادا کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کا حال یہ تھا کہ جب اسے کھانا دیا جاتا تو وہ جب تک کسی کو ساتھ کھانے کے لئے نہ پاتا۔ کھانا نہ کھاتا۔ بلکہ پھینک دیتا۔ دادا کو اس کی یہ بات ناگوار تھی آخر اس نے حاتم کو اپنے اونٹوں کا گلہ چرانے پر لگا دیا۔ ایک دن عبید بن الابرص۔ بشر بن ابی حازم۔ اور نابغہ ذبیانی تینوں آدمی اک ساتھ نعمان بادشاہ کے دربار کو جا رہے تھے اور راستہ میں حاتم کے پاس سے گزرے اور انھوں نے اس سے کچھ کھانے کو مانگا۔ یہ انھیں پہچانتا بھی نہیں تھا پھر بھی اس نے ہر ایک کے لئے ایک ایک ایک اونٹ ذبح کر دیا اور ان کو دو ایک دن روکا۔ جب وہ چلنے لگے تو اس نے اپنے دادا کے سارے اونٹ جو تین سو کے قریب تھے ان تینوں کو بانٹ دئے۔ دادا کو جب اس کی خبر معلوم ہوئی تو اس نے اس کو اپنے گھر سے نکال دیا۔ مگر حاتم نے کچھ پروا نہ کی۔

یہ بھی عرب کے دوسرے رئیسوں کی طرح شاعر تھا۔ اس کے یہاں سخاوت۔ مروت۔ ضیافت کے مضامین زیادہ ہیں۔ اس کی شاعری بھی اس کی زندگی کا گویا عکس ہے۔

(۱۱) ابو زبید

یہ شخص بھی بنو طے کا رہنے والا تھا۔ اور شاعر تھا۔ حضرت سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا بڑا مقرب دوست تھا۔ اس کا انتقال ۶۴۵ء میں ہوا۔

(۱۲) سموءل

اس کا نام سموءل یا صموئیل تھا اس کے باپ کا نام عادیا تھا۔ یہ ایک یہودی رئیس تھا، اس کا قلعہ ابلق بہت محفوظ اور مشہور قلعہ تھا یہودیوں کا وطن دراصل ملک شام تھا اور ان کی زبان سُریانی تھی۔ تقریباً ۷۰ء میں رزمی بت پرستوں نے ان پر حملہ کر کے ان کو تباہ کیا تو یہ بھاگ کر عرب کی وادیوں میں پناہ گزیں ہوئے اور انھوں نے بھی عربوں کی زبان اختیار کر لی تھی انھیں میں ایک رئیس زادہ سموءل بھی تھا جو امرؤ القیس کا ہم عصر اور شاعری میں اس کا ہم پلّہ تھا۔ جب امرؤ القیس بنو اسد سے اپنے باپ کا انتقام لے رہا تھا تو شاہانِ حیرہ نے مختلف قبائلِ عرب کو امرؤ القیس کے خلاف اُبھار دیا اس وقت امرؤ القیس نے بھی قیصر رُوم سے مدد لینی چاہی اور قیصر رُوم کے پاس سفارش کا خط لینے کے لئے وہ سموءل کے پاس گیا۔ وہاں سے وہ سفارشی خط لے کر جب قیصر روم کے پاس جانے لگا تو اُس نے اپنے چند ہتھیار اور زرہیں سموءل کے پاس امانۃً رکھ دیں اور اس سے وعدہ لے لیا کہ وہ ان کو کسی دوسرے کو نہ دے دے گا۔ حیرہ کے بادشاہ منذر کو پتہ لگا کہ امرؤ القیس اپنے ہتھیار سموءل کے پاس امانۃً رکھ آیا ہے اس نے سموءل کے پاس اپنا قاصد بھیجا کہ وہ زرہیں دراصل میری ہیں لہٰذا زرہیں تم مجھے دے دو۔ سموءل نے کہا میں امانت میں کسی حالت میں بھی خیانت نہ کروں گا۔ منذر نے ایک جرنیل کو فوج دے کر بھیجا کہ بہ جبر سموءل سے زرہیں لے آئے۔ اس جرنیل نے ہر چند سموءل کو سمجھایا مگر اس نے خیانت کرنے سے انکار کر دیا اور وہ قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا۔ اتفاق سے سموءل کا بیٹا جنگل سے شکار کھیل کر قلعہ واپس آ رہا تھا کہ منذر کی فوج نے اسے پکڑ لیا۔ اب جرنیل نے سموءل کے پاس کہلایا کہ وہ زرہیں میرے سپرد کر دو تو تمھارے لڑکے کو چھوڑ دوں گا ورنہ اس کی جان

کی خیریت نہیں۔ سموئل نے کہا کہ لڑکا تو مرنے کے لیئے پیدا ہی ہوا ہے تم چاہے کچھ کرڈالو میں وعدہ پورا کروں گا اور امرؤالقیس کی امانت اس کے سوا اور کسی کو نہ دوں گا۔ چنانچہ اُس جرنیل نے سموئل کے سامنے لڑکے کو قتل کیا۔ سموئل دیکھتا اور برداشت کرتا رہا مگر وہ اپنے عہد پر قائم رہا اور وعدہ خلافی اور امانت میں خیانت گوارا نہ کی۔ اس کا ایک قصیدہ جس کا مطلع یہ ہے:۔

اذا المرء لم یدنس من اللوم عرضہ   فکلّ رداءٍ یرتدیہ جمیل

عربی کے بہترین قصائد میں سے ہے جس میں فخر۔ وفا ر عہد۔ حسنِ اخلاق کا مضمون نہایت عمدگی سے ادا کیا ہے۔

(۱۳) عدی

اس کا نام عدی اور اس کے باپ کا نام زید تھا۔ یہ نہایت فاضل۔ ذی اثر اور پرتجربہ شخص تھا۔ کہتے ہیں کہ نعمان اسی کی بدولت تختِ سلطنت تک پہونچا۔ جب نعمان بادشاہ ہوگیا تو اس نے اس کی قدر دانی میں اسے اپنی بیٹی بیاہ دی۔ مگر ایک بار یہی نعمان کسی بات پر اس سے ناخوش ہوگیا تو اس نے اسے قید کردیا۔ اگرچہ ایران کے بادشاہ کسریٰ نے بھی نعمان کو اس کی سفارش لکھی تھی کہ اُسے رہا کردے لیکن نعمان اسے قتل کرچکا تھا۔ یہ واقعہ ۵۸۲ء کا ہے اس کا کلام نہایت پُرتاثیر ہوتا ہے۔ اس کے یہاں رندی اور پرہیزگاری دونوں قسم کے مضامین پائے جاتے ہیں۔

(۱۴) ربیع

اس کا نام ربیع اور اس کے باپ کا نام ابی الحقیق تھا۔ یہ بھی یہودی تھا اور مدینہ کے قریب ہی ایک بستی میں رہتا تھا۔ یہ شخص جیسا عمدہ شاعر تھا ویسا ہی عمدہ سوار اور ویسا ہی بہادر بھی تھا۔ یہ نابغہ کا ہم عصر تھا۔ اور شاعری میں اس کا حریف۔ جنگ بعاث میں یہ شخص بہت دلیری سے لڑا تھا۔

شواعر یعنی شاعر عورتیں

عرب کی سرزمین اگرچہ بظاہر نہایت پتھریلی۔ ریتیلی۔ بنجر۔ اوسر۔ چٹیل اور جنگل تھی مگر

ایک طرف تو اللہ تعالیٰ نے اس کے شکم میں بے شمار معادن اور بیش قیمت ذخائر امانت رکھ دیئے تھے جو آج سونا۔ پٹرول۔ پلے ٹنگیم و دیگر اشیاء کی شکل میں برآمد ہو رہے اور اقوام عالم کے لئے موجب حیرت بن رہے ہیں اور دوسری طرف مرد تو مرد عورتوں تک کو ذہانت۔ قوتِ حافظہ۔ سلامتِ فہم۔ زبان آوری اور شاعری کے فضائل عطا ہوئے۔ چنانچہ عرب کی بعض شاعر عورتوں کا حال یہاں لکھا جاتا ہے:۔

۱۔ ام ثابت:۔ یہ تابط شرا کی ماں تھی۔ یہ بھی مشہور شاعرہ تھی۔ اتفاق سے تابط شرا اسی کے سامنے مرگیا تو اس نے اپنے بیٹے کے ماتم میں جو مرثیے کہے ہیں وہ بڑے زور کے ہیں۔ خاص کر وہ قصیدہ جس کا مطلع یہ ہے:۔ لیس شعری ضلّۃً۔ اَیّ شئٍ قتلك

۲۔ عمرۃ الخثعمیۃ: اس کے دو بیٹوں کا اچانک انتقال ہو گیا اس جانکاہ حادثہ پر اس نے بڑے دل دوز مرثیے کہے ہیں۔

۳۔ عاتکہ:۔ یہ خواجہ عبد المطلب کی بیٹی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی تھیں یہ بھی شعر کہتی تھیں۔ جنگ فجار کے متعلق ان کے اشعار نہایت پُر تاثیر ہیں۔

۴۔ بنت بہدل:۔ یہ بنو طے کی ایک شاعرہ تھی۔ اس نے اپنے باپ کا مرثیہ بہت زور کا کہا ہے۔

۵۔ زینب:۔ بنت طریہ۔ اس نے اپنے بھائی یزید کا مرثیہ بہت پُر تاثیر کہا ہے۔

۶۔ ام الصریح:۔ یہ بنو کندہ کی رہنے والی تھی۔ اور کہا جاتا ہے کہ مرثیہ گوئی میں یہ اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی۔

۷۔ سلمیٰ:۔ یہ زہیر اور خنساء کی بہن تھیں۔ اہلِ خاندان کی صحبت اور اثر سے انھوں نے بھی شعر کہنے شروع کر دئے تھے۔

۸۔ خنساء:۔ شاعر عورتوں میں یہ درجہ اول کی شاعرہ تھیں کہ نہ جاہلیت میں کوئی شاعرہ ان کی ہمسر تھی نہ اسلام میں۔ ان کا اصلی نام تماضر تھا۔ ان کے باپ ابو سلمیٰ تھے، یہ دولت مند گھرانے کی لڑکی تھیں۔ حسین تھیں۔ شاعرہ تھیں اس لئے دوسرے قبائل کے

بڑے بڑے رؤسا نے ان کو نکاح کا پیغام دیا مگر انھوں نے قبیلہ سے باہر نکاح کرنے سے انکار کر دیا اور اپنی قوم میں نکاح کیا۔ یہ دولت اسلام سے بھی مشرف ہوئی تھیں۔ زہیر اور کعب ان کے دو بھائی تھے اور دونوں بڑے شاعر تھے۔ کعب بھی اسلام لائے تھے۔ ایک بار خنسا نے اپنے شعر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنائے تھے تو حضور نے بہت پسند فرمائے اور فرمایا کہ "اے خناسی! اور سناؤ"۔ ان کے ایک بھائی صخر تھے وہ قضا کر گئے تو انھیں بہت صدمہ ہوا۔ ان پر کئی مرثیے کہے اور بہت دردناک مرثیے کہے جو عموماً مشہور ہیں۔ خیال تھا کہ یہ اسلام لا چکنے کے بعد یہ صخر پر رنج و ماتم ختم کر دیں گی مگر چونکہ یہ ان کو بہت چاہتی تھیں یہ اسلام کے بعد بھی برابر ان پر روتی رنج کرتی اور مرثیہ کہتی رہیں۔ یہاں تک کہ ان کی آنکھیں جاتی رہیں۔ کہتی تھیں کہ اسلام سے قبل تو میں صخر پر اس لئے روتی تھی کہ قوم کے لوگ اس کا خون بے کار نہ جانے دیں بلکہ اس کا انتقام ضرور لیں لیکن اسلام کے بعد اب اس پر روتی ہوں کہ وہ جہنم میں گئے۔

مگر یہی روتی رہنے اور بے صبری ظاہر کرنے والی بی بی ـــــ جب خود ان کے ایک چھوڑ چار چار جوان بیٹے جنگ قادسیہ میں شہید ہو گئے تو صبر کئے خاموش بیٹھی رہیں اور کہا بھی تو یہ کہا کہ اللہ کا شکر ہے جس نے ان کے شہید ہونے کے باعث مجھے بھی ایک شرف بخشا۔ اب امید ہے کہ اللہ کے دارِ رحمت (جنت) میں ہم سب اکٹھا اور یکجا ہوں گے۔ ۲۴ھ میں بعہد سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ آپ کا انتقال ہوا۔

ان کے اشعار نہایت عمدہ ہوتے۔ الفاظ نہایت نرم۔ مضامین نہایت معقول اور شیریں۔ بندش نہایت پختہ ہوتی۔ ان کے کلام میں فخر اور مرثیہ کے مضامین زیادہ ہیں ان کے علاوہ ربطہ بنت عاصم۔ جلیلہ بنت مرّہ اور اسلامی عہد میں حضرت سیدہ خاتون جنت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا۔ لیلیٰ العفیفہ۔ خرنق بنت بدر۔ لیلیٰ اخیلیہ۔ وغیرہ بہت سی قابل ذکر شاعر خواتین تھیں۔ لیکن اس وقت اسی قدر کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

ابن خلدون اور اس کا مقدمہ

(از جناب ڈاکٹر محمد احمد صاحب صدیقی پروفیسر یونیورسٹی الہ آباد)

(۲)

سلسلہ کے لئے ملاحظہ فرمائیے برہان بابت ماہ مئی ۱۹۵۷ء

۷- ابن خلدون جان دار مفکر ہے، وہ بے کار احکام نہیں صادر کرتا اور اپنے میلانِ طبع یا خواہشِ نفس سے کسی طرف نہیں جھکتا۔ بلکہ وہ اپنے کل نتائج کو ان چیزوں پر مبنی کرتا ہے جو اجتماعِ انسانی میں مشاہدہ میں آتی ہیں یا جنکی اسے خبر پہنچی ہے یا جن کو اس نے پوری طرح سمجھ لیا ہے یا جو دلائل سے ثابت ہیں۔ ابن خلدون بے جا غرور سے دور ہے حالاں کہ سمجھتا ہے کہ وہ ایک فن کا موجد ہے اگرچہ درحقیقت وہ ایک کا نہیں دو فنوں کا موجد ہے اور اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اہلِ علم ایسے ہی ہوتے ہیں، ابن خلدون میں یہ رنگ غالب ہے کہ وہ سلف کے طریقہ سے الگ ہونا پسند نہیں کرتا اور امورِ دینیہ خواہ عقائد سے تعلق رکھتے ہوں یا عبادات سے۔ ان کے ظاہر کو اختیار کرتا ہے اور اعتقاد رکھتا ہے کہ انسانی عقل اس عالم کے حقائق خواہ وہ طبیعیہ ہوں یا الٰہیہ، کے ادراک سے عاجز ہے۔ ضروری ہے کہ اس میں شرع پر اعتماد کیا جائے۔ قرآن مجید نے جو کچھ بتایا ہے یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ مروی ہے یا اللہ تعالیٰ کی رحمت اور عطا سے وہبی طریقہ پر جو ظاہر ہو۔ وہ اس بارے میں ابن حزم ظاہری (ت ۶ ۵ ۴ھ ۶۴-۱۰ء) کے مشابہ ہے۔ تاہم جب وہ عمرانیات پر بحث کرتا ہے اور حالتِ طبیعیہ اور حالتِ اجتماعیہ کو اور ان چیزوں کو جو ان دونوں سے تعلق رکھتی ہیں خواہ وہ مادی ہوں یا معنوی اور ان چیزوں کو جو ان دونوں میں عارض ہوتی ہیں۔ ان کو چھیڑتا ہے تو اس کا پورا اعتماد عقل کے منطقی قیاسات، طبائع کائنات اور نظر و بصیرت کو حکم بنانے پر ہوتا ہے۔ پس ابن خلدون کا ظاہری مسلک اور سلفی مذہب ان امور میں ہے جو الٰہیات سے متعلق ہیں۔ مثلاً روح اور بعث اور حقیقتِ وجودِ جن کے متعلق فلسفیوں کا فیصلہ ہے کہ ان کا ادراک اختیارِ انسانی کے احاطہ سے باہر ہے اور ایجابی طریقہ پر وہ ان براہین و قیاسات کے ماتحت نہیں ہیں جو اس عالم پر صادق آتے ہیں جو جسم کو محیط ہے۔ امورِ مذکورہ بالا کے علاوہ دوسرے امور میں وہ فیلسوف عقلی طبیعی واقعی ہے

جس کا یہ اعتقاد ہے کہ ہمارے عالم مادی و اجتماعی اور نفسانی میں جو امور جاری و ساری ہیں وہ معین قوانین کے ماتحت ہیں اور ایک نظام مخصوص پر چل رہے ہیں۔ پھر وہ امور مکرر پائے جاتے ہیں جب کہ وہ اسباب جن کے اثر سے وہ پہلے ظاہر ہوئے تھے موجود ہو جائیں۔ ابن خلدون کا یہ بھی اعتقاد ہے کہ یہ حوادث اس کے خلاف جاری نہیں ہو سکتے کیوں کہ یہ جزو ہے اس نظام شامل کا جو عمرانِ بشری اور اجتماعِ انسانی پر غالب ہے۔

ابن خلدون کا اسلوب اپنے بیان میں نہایت صاف اور محکم ہے اور باستثنائے دیباچہ جس میں طرح طرح کی معنوی اور لفظی صناعتیں جمع ہیں اور جو پے در پے سجعوں پر مبنی ہے۔ یہ اسلوب طبعی اور آمد کے طور پر جاری ہے اور وہ اس اسلوب میں معانی اور آرار کو ان کی حقیقی صورتوں میں ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ ابن خلدون کبھی کبھی لغوی سانچے بھی بناتا ہے، روحِ معنی کو بچا لینے کے لئے اور مباحث کی تقدیر اور نتائج وغایات کی وضاحت کے لئے ابن خلدون کو یہ چیز بہت مرغوب ہے کہ مقدمہ کی فصلوں میں سے ہر فصل کو قرآن کریم کی ایک آیت یا چند آیتوں یا آیات قرآن کے اقتباس پر ختم کرے، اس طرح پر کہ وہ آیت اس بحث کے مناسب ہو جو اس فصل میں مذکور ہے اور بسا اوقات ایک فصل کو آیتوں سے مزین کرتا ہے ان میں سے ایک آیت کا ختمِ فصل پر لانا ضروری خیال کرتا ہے اور باقی آیات کا کسی مستقل نظریہ کے ختم میں جو اس فصل میں بیان کیا گیا ہے۔ ابن خلدون کا اسلوب صاف ہونے کے علاوہ سیدھا بھی ہے جس سے ذوقِ لغوی اور ذوقِ ادبی اور موضوعاتِ عقلیہ اور مباحثِ اجتماعیہ وادبیہ کے بیان پر قادر ہونے کا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ اور اس جہت سے اس کا اسلوب ابن المقفع کے اسلوب سے زیادہ عمیق اور جاحظ کے اسلوب سے زیادہ اشمل ہے۔ ابن خلدون کے کچھ خاص لغوی استعمالات ہیں جنہیں ہم یہاں مستقل موضوع نہیں بنا سکتے لیکن ان میں سے بعض پر مطلع کر دینا ضروری ہے کیونکہ ان کا فلسفہ ابن خلدون کے سمجھنے سے گہرا تعلق ہے۔ منجملہ ان کے یہ ہے کہ وہ "عرب" کا لفظ بدو اور اعراب (بادیہ یعنی صحرا میں رہنے والے) کے معنی میں استعمال کرتا ہے۔ اور کبھی کبھی لفظ "بدو" کو وسیع معنی میں بھی استعمال کرتا ہے کہ دیہات کے رہنے والے کاشتکاروں کو بھی شامل ہو جاتا ہے۔ اس اعتبار سے کہ بدو حضر کے مقابلہ میں بادیہ کے معنی میں ہے اور یہ صحیح لفظ ہے کہ قرآن مجید میں آیا ہے۔ اسی طرح لفظ

"توحش" کو شہر سے دور مقام پر سکونت پذیر ہونے کے معنی میں استعمال کرتا ہے۔ وہ معنی نہیں لیتا جس کی طرف عام طور پر ذہن جاتا ہے یعنی طبیعت میں وحشت۔ نیز لفظ "عمران" کو اس پر اطلاق کرتا ہے جسے ہم لوگ آج تک "اجتماع" کہتے ہیں پس علم العمران ابن خلدون کے یہاں وہی علم ہے جو ہم لوگوں کے نزدیک علم الاجتماع ہے۔

(اس کی جو رائیں مقدمہ میں ہیں ان کی تحلیل)

ابن خلدون کا مقدمہ طبیعی، اجتماعی، نفسی، لغوی، اور ادبی رایوں سے مالا مال ہے لیکن ان رایوں کی دو واضح قسمیں نکلتی ہیں (۱) آرار مستعرضہ یعنی علما اور فلاسفہ کی وہ رائیں جنھیں ابن خلدون نے ضمناً بیان کیا ہے اور پھر ان پر نقد و تبصرہ کیا ہے یہ وہ رائیں ہیں جو بالعموم علوم طبیعیہ یا فلسفۂ عقلیہ سے متعلق ہیں (۲) آرائے اصلیہ۔ یہ وہ رائے ہیں جن کے لئے ابن خلدون نے مقدمہ لکھا ہے اور یہ وسیع تر معنی میں آرائے اجتماعیہ ہی ہیں۔ اور گو کہ مقدمہ ابن خلدون کے درس سے مقصود آرائے اجتماعیہ اصلیہ ہیں لیکن مناسب ہے کہ ہم کسی قدر آرائے مستعرضہ کا بھی ذکر کر دیں کیوں کہ ان سے بھی کسی درجہ میں ابن خلدون کا فلسفیانہ رجحان ظاہر ہوتا ہے۔

۱- آرائے مستعرضہ ابن خلدون نے اول مقدمہ میں (ص ۴۴-۸۵) جغرافیہ وصقعبہ کو بیان کیا ہے جیسا کہ ان حکما کی کتابوں میں بیان ہوا ہے جو احوالِ عالم میں غور کرنے والے ہیں، ان رایوں کے مثل ہم عرب کے جغرافیہ نویسوں یا اخوان الصفا کے یہاں یا حی بن یقظان کے قصہ میں پاتے ہیں۔ پھر اس نے خلافت اور خلافت کے شروط میں امت کے اختلاف کو (ص ۱۹۰-۲۰۲-۲۱۰) اور حکومت کے دینی و سیاسی و اداری مناصب مثلاً قضا و وزارۃ و دیوان الرسائل و دیوان الجبایۃ والسکۃ (العملہ) ... (ص ۲۱۸-۲۷۹) کو اور مہدی کو اور ان کے بارے میں لوگوں کے مذہب اور حکومتوں کی ابتدا اور خوں ریزیوں اور جفر کو (ص ۳۱۱-۳۴۲) بیان کیا ہے۔ اور فصل سادس (ص ۴۲۹ اور اس کے بعد) میں علم و تعلیم کو ذکر کیا ہے اس میں علوم اسلامیہ شرعیہ کے اقسام مثلاً تفسیر قرآن و حدیث و فقہ و علم کلام و تصوف اور علومِ عقلیہ و طبیعیہ مثلاً حساب و ہندسہ و فلکیات و منطق و طبیعیات و الٰہیات و کیمیا و خاص فلسفہ اور طب و کاشتکاری و سحر و تنجیم کو (ص ۴۲۷-۵۳۱)

اس کے باوجود یہ فصلیں بھی قوی شخصی نظریات سے یا نقدِ صحیح سے یا ایسی رایوں سے جو پورے طور پر اصیلہ ہیں خالی نہیں ہیں لیکن ہم یہاں ان کے متعلق کلام نہ کریں گے کیوں کہ "آرائے اصیلہ" کے تحلیل کے بیان میں ان کا ذکر ضروری ہے۔

ب۔ آرائے اصیلہ۔ ابن خلدون کے دماغ میں جب تاریخ میں کتاب تالیف کرنے کی فکر جم گئی اور اس نے تالیف کا کام شروع کر دیا تو اسے پتہ چلا کہ تاریخ کو سمجھنے والے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے علل و اسباب کو جانے اور احوالِ بشر سے واقف اور علومِ مختلفہ کا ماہر ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظریہ بھی اپنی جمیع تفاصیل کے ساتھ اس کے دماغ میں جما ہوا تھا اس لئے اس نے مقدمہ لکھا اور اس کو "وضع و تالیف کے ساتھ تنقیح و تہذیب سے قبل" پانچ ماہ کی مدت میں پورا کیا، اس میں اپنی رایوں کو منظم کیا اور اپنے نظر و فکر کی نقاب کشائی کی۔ اس مشقت کے نتائج علم اجتماع اور حضارۂ اسلامیہ کی تاریخ کائنات اور علم تاریخ کا اس کی صحیح بنیادوں پر قائم ہونا ہے۔

ا۔ تاریخ علومِ فلسفہ میں سے ایک علم ہے اس کا موضوع اجتماع انسانی ہے

ابن خلدون کہتا ہے، کہ تاریخ بظاہر اس سے زیادہ کوئی چیز نہیں ہے کہ اس میں جنگوں اور حکومتوں کے حالات مذکور ہوں اور اس میں اقوال و امثال بیان کئے جائیں مجلسوں میں جب اجتماع کثیر ہو تو اس سے دلچسپی پیدا ہو۔ لیکن درحقیقت وہ نظرِ دقیق اور تحقیق و تعلیل ہے کائنات اور اس کے مبادی کے لئے۔ اور علمِ عمیق ہے واقعات کی کیفیات اور ان کے اسباب کے لئے۔ لہٰذا وہ حکمت میں اصل کے اعتبار سے داخل ہے اور بجا طور پر اس کا مستحق ہے کہ اس کو حکمت کے علوم میں شمار کیا جائے (ص ۳-۴) ابن خلدون اکثر مورخین کی تنقید کرتا ہے کیوں کہ وہ اپنے پیش روؤں کی تقلید کرتے ہیں اور یا وہ اپنی کتابوں کو بادشاہوں کے ناموں اور ان کے احوال و کردار کے ذکر پر محدود کر دیتے ہیں۔ اور ایسی بے بنیاد خبریں بیان کرتے ہیں جنھیں عقل صحیح نہیں سمجھتی بلکہ ان کے غلط ہونے پر دلیلِ قطعی موجود ہوتی ہے پس ابن خلدون نے اس کتاب کی تالیف کی ضرورت محسوس کی اور اس کا وصف اس طرح بیان کیا کہ "میں نے تاریخ میں ایک

کتاب لکھی ..... اس میں آبادیوں اور حکومتوں کے شروع ہونے کے علل و اسباب ظاہر کئے ..... اور اس کی ترتیب و تبویب میں نادر طریق اختیار کیا اور انوکھا اسلوب ایجاد کیا، اس میں میں نے عمران و تمدن کے حالات اور اجتماعِ انسانی میں پیش آنے والے اُن عوارضِ ذاتیہ کو جس سے تم موجودات کے علل و اسباب معلوم کر سکتے ہو بیان کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ تاریخ کو مآخذِ متعددہ کی اور طرح طرح کے علوم کی اور "اچھے غور و فکر اور ثابت قدمی کی جو اپنے موصوف کو صحیح امر کی طرف پہنچائیں اور لغزشیں اور غلطیوں سے بچائیں حاجت ہے۔ اس لئے کہ خبروں میں جب خالی نقل پر اعتماد ہو اور عادت کے اصول اور سیاسی قواعد، آبادی کی طبیعت اور اجتماعِ انسانی کے احوال پر نظر نہ کی جائے اور غائب کو حاضر پر اور موجود کو ماضی پر قیاس نہ کیا جائے تو بسا اوقات ڈگمگا جانے اور لغزشِ قدم سے اور سچائی کے راستے سے ہٹ جانے سے بچاؤ نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ گذشتہ اور آئندہ میں اس سے زیادہ یکسانیت ہے جو ایک پانی کو دوسرے پانی سے ہے۔

ایک مورخ کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ احوال، جماعتوں اور خاندانوں کی اس تبدیلی سے غافل نہ ہو جو ان میں زمانہ کی تبدیلی سے آجاتی ہے کیوں کہ یہ تبدیلی زمانہ دراز کے بعد ہوا کرتی ہے اور یہ اس لئے ہے کہ دنیا کے حالات، عادات اور طور طریق ہمیشہ ایک ڈھنگ پر نہیں رہتے۔ یہ اختلاف زمانہ گزرنے اور ایک حال سے دوسرے حال کی طرف منتقل ہونے پر ہوتا ہے۔ پھر یہ اختلاف جس طرح اشخاص، اوقات اور شہروں میں ہوتا ہے۔ اسی طرح اطرافِ عالم اور ممالک میں اور زمانوں اور حکومتوں میں بھی ہوتا ہے اور یہ تبدیلی بتدریج واقع ہوتی ہے اس لئے کہ یہ تبدیلی انسان کے دوسرے کے مشابہ بننے اور موجودہ حکومت والوں کی خواہش سابق حکومت والوں کی مخالفت کا نتیجہ ہوتی ہے (ص ۵، ۶، ۹، ۱۰، ۲۸، ۲۹) اور اسی وجہ سے تاریخ کی حقیقت یہ ہے کہ وہ خبر ہے اجتماعِ انسانی کی جو عالم کی آبادی ہے اور خبر ہے ان احوال کی جو اس اجتماع کو طبعاً عارض ہوتے ہیں مثلاً توحش اور باہمی اُنس اور نافرمانی اور بعض انسانوں کا بزور دوسرے انسانوں پر غالب آنا اور اس سے جو سلطنت و حکومت اور اس کے مراتب حاصل ہوتے ہیں اور کسب و معاش اور علوم اور صنعتیں جن کو آدمی اپنی کوششوں

اختیار کرتا ہے اور وہ چیزیں جو اس اجتماع سے طبعاً حادث ہوتی ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ خبر میں بالطبع جھوٹ کی گنجائش ہے اور کچھ ایسے اسباب ہیں جو اس کے مقتضی ہیں مثلاً رایوں اور مذہبوں کی گروہ بندی، ناقلین پر اعتماد۔ اور مقاصد سے بے خبری۔ کیوں کہ بہتیرے ناقلین اس چیز کے مقصود کو نہیں جانتے جس کو انھوں نے لکھا ہوا دیکھا ہے یا کسی سے سنا ہے اور وہ خبر کو اپنے ظن و تخمین کے بنا پر نقل کر دیتے ہیں اس بنا پر وہ کذب میں پڑ جاتے ہیں یا مثلاً احوال کو واقعات پر تطبیق دینے سے ناواقفیت، یا مثلاً لوگوں کا بڑے درجہ والوں کا قرب حاصل کرنے کے لئے ان کی مدح و ثنا کرنا اور ان کے حالات کو خوشنما صورت میں ظاہر کرنا (ص ۳۵، ۳۶-۴۱)

۲۔ عمران، انسان کا کسی مقام میں سکونت پذیر ہونا ہے ابن خلدون کے نزدیک اجتماعِ انسانی ہی عمران ہے لیکن مقدمہ کو بنظر غور مطالعہ کرنے سے ان دونوں کے درمیان کھلا ہوا فرق ظاہر ہوتا ہے کیوں کہ عمران، اکثر استعمال میں راجع ہے انسان کے اس تعلق کی طرف جو اس کو ارضِ معمورہ (بیئۃ طبعیہ) کے ساتھ ہے اور اجتماع، طبعاً راجع ہے اس تعلق کی جانب جو ایک جگہ یا متفرق جگوں میں رہنے والوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ہوتا ہے (البیئۃ الاجتماعیہ) یا راجع ہے ان صنائع اور قوانین و معاملات کی طرف جن کے وہ رہنے والے حاجت مند ہوتے ہیں اور جو ان کو پہلے تو بیئۃ طبیعیہ کی سختیوں پر غالب آنے کی قدرت بخشتے ہیں پھر راحت طلبی اور آسائش کی زیادتی پر قادر بناتے ہیں۔ زمین کے بعض اقلیم رہنے والوں کے لئے دوسرے بعض اقلیم سے زیادہ موافق ہیں۔ اور معتدل بستیاں اُن بستیوں سے زیادہ آباد ہیں جو زیادہ گرم اور زیادہ سرد ہیں۔ اور اقلیم رابع (معتدل) کے لوگ جسم، رنگ اور اخلاق اور دین میں نہایت معتدل حالت میں ہیں جن بستیوں میں گرمی کی شدت ہے وہاں کے رہنے والوں کا رنگ کالا ہوتا ہے اور ان پر کم عقلی، غصہ اور بے قراری کا غلبہ ہوتا ہے اسی وجہ سے وہ رقص و سرور کے دلدادہ ہوتے ہیں اور حماقت کی صفت سے موصوف ہوتے ہیں۔ سرد بستیوں کے باشندوں میں خاموشی کا غلبہ غمگینی کے درجہ تک پایا جاتا ہے اور وہ نتائج کے لئے متفکر رہا کرتے ہیں یہاں تک کہ بعض لوگ متواتر دو سال کے لئے کھانے پینے کا سامان غلہ وغیرہ سینت کر رکھتے

ہیں۔ جب کوئی ایک اقلیم سے دوسرے اقلیم کی طرف منتقل ہوجاتا ہے تو اس کی اولاد کا رنگ روپ، بدن اور اخلاق ایک زمانے کے بعد میں اقلیم جدید کے مناسب بدل جاتے ہیں۔ پھر اقالیم کے مختلف ہونے سے غذائیں بھی مختلف ہوتی ہیں اور ان کا اثر بھی لوگوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ بے شک ارزانی، آرام اور ثقیل غذاؤں سے جسم میں قوت و ہمت کی کمی۔ بیوقوفی اور غفلت اور رنگ کا پھیکا پڑنا اور شکل کا بڑھ جانا پیدا ہوتا ہے جس طرح بھوک کی زیادتی سے جسم اور عقل میں کمی آجاتی ہے لیکن غلہ پیدا ہونے والے مقامات کے لوگ مشقتوں اور فاقوں کی برداشت کی قدرت زیادہ رکھتے ہیں۔

۳۔ اجتماع دو قسم پر ہے (۱) بدوی (۲) حضری۔ اوّل بہ ضرورت ثانی سے سابق اور اس کے لئے مادہ ہے۔ اور وہ دونوں ضروری ہیں۔ جماعتوں کا حالات میں مختلف ہونا ان کے طریقِ معاش میں اختلاف کی وجہ سے ہے اس لئے کہ ان کا اجتماع تحصیلِ معاش میں تعاون کے لئے ہوتا ہے۔ پس کوئی کاشتکاری اختیار کرتا ہے اور کوئی مویشیوں کی داشت و پرداخت میں مشغول ہوتا ہے۔۔۔ یہ لوگ۔۔۔ صحرا میں وارد ہوتے ہیں کیوں کہ وہاں کھیتیوں اور مویشیوں کے لئے چراگاہوں کی ایسی وسعت ہوتی ہے جو شہروں میں نہیں ہوتی۔ اور اس جماعت کا وجود تمام انسانوں کے لئے ضروری ہے بالخصوص عرب کے لئے۔ اور یہی جماعت کل آبادی کی بنیاد ہے۔

اور اہلِ بدو طبعاً بھلائی کے زیادہ نزدیک ہیں کیوں کہ وہ لوگ فطرت سے قریب ہیں اور طرح طرح کی لذتوں اور آسائشوں کے سامان اور دنیا میں دل لگانے اور خواہشاتِ نفسانیہ میں منہمک ہونے سے بہت دور ہیں۔ اور وہ زیادہ بہادر بھی ہیں کیوں کہ انھیں زیادہ بیداری اور قوت اور ہتھیار لگانے کی حاجت ہوتی ہے درندوں اور غارت گروں سے اپنی اور اپنے مویشیوں کی حفاظت کے لئے اس میں ان کو صرف اپنے نفس پر اعتماد ہوتا ہے حالاں کہ شہر کے باشندے شہر پناہوں کے بیچ میں سوتے ہیں جو انھیں محفوظ رکھتے ہیں اور چوکیدار ان کی حفاظت کرتے ہیں اور وہ حاکم یا سردار کے پاس جا کر التجا کرتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے بادیہ میں رہنا صرف غیرت مند قبائل کا کام ہے۔

قبائل اہل العصبیۃ

عصبیۃ وہی غیرت اور جوشِ طبیعت ہے عزیزوں اور رشتہ داروں کی حمایت میں اس سے کہ ان کو کوئی سختی یا ہلاکت پہنچے۔ عصبیۃ مشہور خاندان والوں میں ہوتی ہے یا ان لوگوں میں جو ان کے یہاں سسرالی تعلق

پیدا کرلیں یا ان میں جو ان لوگوں کی طرف ولاء، یا حلف کی وجہ سے منسوب ہوں۔ اس میں اہم بات
اس برتاؤ کا سمجھنا ہے جو ایک خاندان کے افراد کے درمیان میں ہوتا ہے کیوں کہ نسب تو ایک وہمی رشتہ
ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ نفع اسی برتاؤ اور اتفاق اور باہمی امداد میں ہے۔ انساب میں توسرالی
تعلق، ولاء، تحالف اور استرقاق سے خلط ملط ہو جایا کرتا ہے۔ اور یہ بھی ہوتا ہے کہ کوئی شخص ضعیف النسب
کسی بلند پایہ قبیلہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ علاوہ بریں خالص غیر مخلوط نسب تو صرف متوحشین (یعنی شہر سے
دور رہنے والوں) میں عرب کی صحراؤں میں پایا جاتا ہے یا ان میں جو انھیں کی طرح ہیں جیسے قوم بربر اور زنگی
بڑی عصبیت چھوٹی عصبیتوں کو ملا لیتی ہے اور جب تک ان متحدہ عصبیتوں میں ایک عصبیت بھی
ایسی ہوتی ہے جس کا شرف اور تقدم اور تشکر تسلیم کرلیا گیا ہے تب تک اس عصبیت کو باقی عصبیتوں پر
ضرور برتری حاصل رہتی ہے پھر جب وہ عصبیت جس میں برتری اور سرداری ہے کمزور ہو جاتی ہے تو باقی عصبتیں
اس سے جھگڑا کرتی ہیں یہاں تک کہ ان میں جو عصبیت سب سے قوی ہوتی ہے وہ اُبھر کر سردار بن جاتی ہے۔
اور عصبیت کا ثمرہ جاہ و حکومت و شرف ہے لیکن عموماً یہ چیزیں صرف چار پشت تک قائم رہتی ہیں کیوں کہ
اس حاصل کردہ شرف کی انتہائی مدت ایک خاندان میں چار پشت ہے یہ اس وجہ سے کہ کسی عظمت کا بنیاد
رکھنے والا اس مشقت کو جانتا ہے جو اس کی بنا کے قیام میں جھیلی گئی ہے اور وہ ان خصائل کی حفاظت کرتا ہے
جو اس عظمت کے حصول و بقا کے اسباب ہیں۔ اس کے بعد اس کا بیٹا باپ ہی کے طریقہ کو اختیار کرتا ہے
کیوں کہ اس نے اپنے باپ سے سب کچھ سنا اور سمجھا ہے لیکن اس میں وہ باپ سے گھٹا رہتا ہے کیوں کہ کسی
چیز کا سننے والا دیکھنے والے سے عموماً کم تر رہتا ہے۔ پھر جب اس کے بعد تیسرا آتا ہے تو وہ محض تقلید کرتا ہے اس
کا درجہ دوسرے سے بھی فروتر ہوتا ہے اور جب چوتھا شخص آتا ہے تو وہ پہلوں سے بہت کم ہوتا ہے اور وہ ان
خصائل کو جو بنائے عظمت کی محافظ ہیں ضائع کر دیتا ہے پس وہ حکومت میں تساہل کرتا ہے، حقیقتِ عظمت
کو کھو دیتا ہے اور کمزور ہو جاتا ہے تب اس پر وہ حملہ کرتا ہے جس کی عصبیت زیادہ قوی ہوتی ہے۔ اور جب
کسی عصبیت سے حکومت جاتی رہتی ہے تو ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ پھر اس کی طرف لوٹ آئے۔

وحشی قومیں دوسروں پر غلبہ حاصل کرنے کی زیادہ قدرت رکھتی ہیں جب کہ وہ وحشی قوم اور اس

کی مقابل جماعت تعداد میں اور قوتِ عصبیتہ میں تقریباً برابر ہوں کیوں کہ وحشی قومیں شجاع اور قوی ہوتی ہیں اور ان کا ملک عادتاً زیادہ وسیع ہوتا ہے۔ لیکن وہ سیاستِ ملکی (راج نیتی) سے ناواقف ہوتی ہیں اس وجہ سے جن ملکوں پر وہ غلبہ حاصل کر لیتی ہیں وہ جلد ویران ہو جاتے ہیں اور ان کے باشندے ہلاک ہو جاتے ہیں۔

۴۔ اجتماع حضری کی صورت پیدا ہوتی ہے اجتماع بدوی سے۔ اس میں آبادی وسیع ہوتی ہے، شہریت بارونق ہوتی ہے اور دولت کا نشوونما ہوتا ہے۔ جب کسی شخص کو سرداری ملتی ہے اور اس کی قوم برضا و رغبت اس کی اطاعت کرتی ہے گویہ ریاست بالعصبیتہ ہوتی ہے لیکن جب تابعدار بنانے کے لئے زبردستی ان پر غلبہ حاصل کیا جائے تو یہ "ملک" ہے اور عصبیت کا آخری مقصد ملک ہی ہوتا ہے کیوں کہ اصحابِ ریاست ریاست سے بالاتر چیز کی طمع کرتے ہیں، نیز بعض مطیع اور فرماں بردار سرداروں سے جھگڑے کو پسند کرتے ہیں۔ اور جب کسی عصبیت والے پر غلبہ اور حکومت حاصل کر لیتے ہیں اور مقابلہ و شکست سے بے خوف ہو جاتے ہیں تو وہ آرام طلب ہو جاتے ہیں، آسائش سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور بذاتِ خود کاموں میں جانفشانی کرنے سے اپنے آپ کو بالاتر سمجھتے ہیں اور افراد اور خاندانوں سے کام لینے پر اور ان کی فرماں برداری پر مجبور ہوتے ہیں اور اپنی پہلی عصبیت سے بے پرواہ ہو جاتے ہیں۔ جب وہ ایسا کرتے ہیں تو حکومت ضعف کے کنارے پر آجاتی ہے۔ ابن خلدون کی رائے ہے کہ کوئی غلبہ قائم نہیں ہو سکتا مگر عصبیتہ قویہ پر اور دعوتِ دینیہ بے شک حکومت کے بنیادیں قوت عصبیتہ پر مزید قوت بڑھا دیتی ہے لیکن خود دعوتِ دینیہ بغیر عصبیت کے مکمل نہیں ہوتی۔

ابن خلدون خاندانوں کی عددی قیمت کو تسلیم کرتا ہے اور اعتقاد کرتا ہے کہ حکومت کی عظمت، اس کا پھیلاؤ اور اس کی حدود کی طوالت اس میں رہنے والوں کی نسبت سے کمی اور زیادتی سے ہوتی ہے اور اس کے باوجود ہر حکومت کے لئے ملکوں اور دیشوں سے ایک حصہ ہوتا ہے کہ اس پر زیادتی نہیں ہوتی۔ اور اسی طرح وہ ممالک کہ جہاں قبائل اور عصبیات کثیر ہیں وہاں کوئی حکومت مشکل ہی سے مستحکم

ہوتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہاں رایوں اور خواہشوں کا اختلاف ہوتا ہے اور ہر رائے اور خواہش کی پشت پر ایک عصبیت ہوتی ہے جو دوسری عصبیت کا مقابلہ کرتی ہے اس لئے حکومت پر ٹوٹنے کا دور دورہ ہوتا ہے اور ہر وقت بغاوت کا خطرہ رہتا ہے۔ اتنا اور سمجھ لیجئے کہ حکومتوں کی مثل اشخاص کے طبعی عمریں ہوتی ہیں اور ان کی بھی چار پڑھی ہوتی ہیں جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے۔

ابن خلدون کی رائے ہے کہ "جب بادشاہت ملتی ہے تو اس کے پیچھے آسائش اور احوال کی وسعت لگ جاتی ہے" اور حضارت تو نام ہی ہے آسائش میں طرح طرح کے تنوع پیدا کرنے اور اقسام نکالنے کا اور ان صنائع کو مضبوط کرنے کا جو آسائش کی صورتوں اور اس کے طریقوں میں مستعمل ہیں جیسے قسم قسم کی خوراک پوشاک اور عمارتیں۔ پس معلوم ہوا کہ حضارت کا ڈھنگ بداوت کے ڈھنگ کے پیچھے آیا بہ ضرورت کیوں کہ آسائش حکومت کے پیچھے ہوتی ہے۔ اور اہلِ حکومت ہمیشہ حضارت کے ڈھنگ میں اور اس کے احوال میں پیشرو حکومت کی تقلید کرتے ہیں۔ حکومت کے شروع میں تو یہ آسائش حکومت میں قوت بڑھاتی ہے کیوں کہ اس کے اہل میں اور نسل بڑھانے میں اور اس کے آثار کی عظمت میں مثلاً شہروں کے بنانے میں اور بلند عمارتوں کی تعمیر میں اور علم کے قوی کرنے میں زیادتی ہوتی ہے لیکن بالآخر یہی چیزیں حکومت کے کندھے پر بارِ گراں ہو جاتی ہیں تب ارا کینِ سلطنت اپنی عصبیات والوں سے ڈرتے ہیں۔ مجبور ہو کر پردیسی غلاموں کے احسان کی طرف پناہ ڈھونڈتے ہیں کیوں کہ یہ مذکورین پہلے تو نہایت عاجزی اور آقاؤں کی فرماں برداری کرتے ہیں لیکن جب وہ کثیر تعداد میں ہو جاتے ہیں اور ان کی قوت بڑھ جاتی ہے تو وہ ملک پر وبال ہو جاتے ہیں اور بسا اوقات بادشاہ پر حاوی ہو جاتے ہیں اور اس کے اختیار کو سلب کر کے اپنی خواہش کے مطابق امور جاری کرتے ہیں تو حقیقت میں بادشاہت انھیں کی ہوتی ہے اور بادشاہ مجازی طور پر بادشاہ کہہ دیا جاتا ہے۔ پھر ابن خلدون ملک کی حقیقت کو واضح طور پر بیان کرتا ہے کہ ہر اجتماعِ انسانی کے لئے ایک ناظم یا حاکم کی حاجت ہوتی ہے جو عدل قائم کرے لوگوں کو ایک دوسرے پر ظلم کرنے سے روکے" اور ملک تو در حقیقت اس کے لئے ہوتا ہے جو رعایا کو غلام بنائے

اور جرمانہ میں مال وصول کرے اور فوجوں کو دشمن سے جنگ کرنے کے لئے بھیجے اور ان بری و بحری
سرحدوں کی محافظت کرے جس سے دشمن کے آجانے کا خطرہ ہو اور اس کے اوپر کوئی حاکم بالادست
نہ ہو۔ اور رعیت کی درستی بادشاہ کی ذات یا جسم میں مثلاً اس کی خوب صورتی یا چہرے کی ملاحت
یا جسم کے لمبے چوڑے ہونے میں یا اس کے علم کی وسعت میں نہیں ہے بلکہ رعیت کی درستی تو اس میں
ہے کہ ان کا بادشاہ ان پر مہربان ان کا خیر اندیش ہو کیوں کہ اگر بادشاہ سخت مزاج سزاؤں میں سخت گیر،
لوگوں کے عیوب کا متجسس ان کے جرموں کو شمار کرنے والا ہو گا تو رعیت کے قلوب میں اس کا خوف
بیٹھ جائے گا اور وہ احساسِ کمتری و ذلت میں مبتلا ہو جائیں گے۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ اس کی سختی سے بچنے کے
لئے وہ جھوٹ مکر و فریب اختیار کریں گے اور ان باتوں کے خوگر ہو جائیں گے' ان کی عقلیں خراب
ہو جائینگی اور لبسا اوقات میدانِ جنگ میں اس کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ لبسا اوقات ایسی صورت
میں رعیت بادشاہ کو قتل کر ڈالنے پر متفق الرائے ہو جاتی ہے اور حکومت کے عموماً پانچ حالات ہیں۔
(جو درحقیقت وہ چار ہیں)

(ا) سرکشی کے ذریعے سے غلبہ اور حکومت پانے میں کامیابی کا حال (ب) حال استقلال اور انفراد
کا حکومت میں اور دوسرے دعوےٰ کرنے والوں کی مدافعت کا۔ پھر (ج) حال فراغت کا اور راحت
کا حکومت کے ثمرات حاصل کرنے کے واسطے بعد اس کے کہ بادشاہ کو دشمنوں کے مقابلہ سے امن حاصل
ہو گیا اور رعیت نے فرماں برداری کا عہد کر لیا۔ پھر (د) حال قناعت کرنے کا اپنی ملک پر اور دشمنوں
اور مخالفوں سے مصالحت کا اور حکومت میں اپنے سے پہلی حکومت کی تقلید کا۔ اور یہیں سے
سلطنت کے ضعف کی ابتدا ہوتی ہے پھر (ہ) حال اسراف اور فضول خرچی کا اور خواہشاتِ نفسانیہ
کی طرف مائل ہونے کا اور بدخصلت مصاحبوں پر احسان کرنے کا اور امورِ سلطنت سے غافل
رہنے کا۔ اس کا یہ نتیجہ ہو گا کہ اس کی قوم اور اس کی رعیت کے بڑے لوگ اس کی مدد سے ہاتھ کھینچ
لیتے ہیں اور اس سے کینہ رکھتے ہیں لہٰذا اس کی فوج اور اس کی آمدنی فاسد ہو جاتی ہے اور اس کا
امر مختل اور اس کا ملک زوال پذیر ہو جاتا ہے۔ باقی آئندہ

اُستاذ کُرد علی

۱۸۷۶ ۱۹۵۳

(جناب شیخ نذیر حسین صاحب ایم اے (لاہور))

اُستاذ کُرد علی جنھوں نے ساٹھ سال تک عربی زبان و ادب کی خدمت کی تھی گذشتہ سے پیوستہ سال ۷۷ برس کی عمر میں وفات پا گئے۔

ان کا دادا ایک کُردی تاجر تھا جس نے عراق سے آ کر دمشق میں اقامت اختیار کر لی تھی۔ ان کے باپ نے حسبرین نامی گاؤں میں ایک چھوٹی سی زمینداری خرید لی تھی اور قفقاز کی رہنے والی ایک چرکی النسل خاتون سے جو ایک اعلیٰ گھرانے سے تعلق رکھتی تھی شادی کر لی تھی۔

کُرد علی ۱۸۷۶ء میں پیدا ہوئے ان کا باپ اگرچہ اَن پڑھ تھا لیکن اس نے اپنے لڑکے کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ کرد علی کو بچپن میں مطالعہ کا بے حد شوق تھا وہ تمام رات مطالعہ میں گزار دیتے تھے۔ انھوں نے ۱۸۹۲ء میں مدرسہ ثانویہ سے فراغت حاصل کی اس وقت شام کے سرکاری مدارس میں ذریعہ تعلیم ترکی زبان تھی اور فرانسیسی زبان بھی لازمی طور پر پڑھائی جاتی تھی اس کے علاوہ کرد علی نے اپنے شہر کے مشہور علماء شیخ محمد مبارک۔ سید سلیم بخاری اور شیخ طاہر الجزائری سے بھی اکتساب علم کیا تھا جس کی وجہ سے ان کا ادبی ذوق بہت ترقی کر گیا۔ کرد علی عمر بھر شیخ طاہر الجزائری کے مداح اور ثناخواں رہے۔

صحافت

۱۸۹۲ - ۱۹۱۸

کرد علی زمانۂ تعلیم ہی میں اخبارات کے لئے مضامین لکھا کرتے تھے ۱۸۹۷ء میں جب

کہ ان کی عمر صرف ۲۲ سال کی تھی انھوں نے "الشام" کی ادارت قبول کرلی۔ یہ پہلا اخبار تھا جو دمشق سے ہفتہ میں ایک بار شائع ہوتا تھا کرد علی نے تین سال تک اس اخبار میں کام کیا اس کے علاوہ وہ مصر کے اخبارات اور رسائل کے لئے بھی لکھا کرتے تھے۔ ان دنوں مصر کا مشہور ماہانہ رسالہ المقتطف نیا نیا نکلا تھا اس کے مالک نے رسالہ کے بڑھتے ہوئے کام کے پیش نظر ایک مدیر معاون کی ضرورت محسوس کی اور اس ضرورت کا اظہار امیر شکیب ارسلان سے کیا تو انھوں نے کرد علی کا نام پیش کر دیا اس رسالہ میں کرد علی نے پہلا مقالہ "اصل الوہابیہ" کے نام سے لکھا جو بعد ازاں مصر کے علمی حلقوں میں مقبول ہو کر ان کی شہرت کا ذریعہ بنا۔

فرانس کی سیر و سیاحت کا شوق مدت سے ان کے دل میں چٹکیاں لے رہا تھا انھوں نے فرانسیسی ادب کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ وہ وہاں کے علماء۔ ادباء اور فلاسفہ سے ملنا چاہتے تھے جو اس وقت کی ادبی اور ثقافتی دنیا پر حکمراں تھے ۱۹۰۱ء میں وہ شام سے سیر و سیاحت کے لئے نکل کھڑے ہوئے راستہ میں قاہرہ پڑتا تھا جہاں وہ چند دنوں کے لئے اپنے قدیم دوست سید رشید رضا صاحب المنار سے ملنے کے لئے ٹھہر گئے۔ سید رشید رضا نے اصرار کیا کہ وہ ایک مصری اخبار "الرائد المصری" کی ادارت قبول کرلیں جو ہفتہ میں دوبار نکلا کرتا تھا۔ سید رشید رضا کی وساطت سے کرد علی کی رسائی مفتی محمد عبدہ تک ہوئی جو ان دنوں جامع ازہر کے رواقِ عباسی میں کلام پاک کی تفسیر کا درس دیا کرتے تھے۔ کرد علی نے ان کی عام اور نجی صحبتوں سے بہت فائدہ اٹھایا اور وہ ان کے تعلیمی اور اصلاحی خیالات کے عمر بھر مؤید رہے اس کے علاوہ ان کے دوستانہ تعلقات قاسم امین۔ فتحی زغلول جرجی زیدان۔ مصطفیٰ کامل۔ سلیمان البستانی اور احمد تیمور سے بھی قائم ہو گئے جو ان کی وفات تک استوار رہے۔

چند ماہ بعد انھیں دمشق واپس جانا پڑا لیکن ترکی استبداد اور حاسدوں کی

ریشہ دوانیوں کی وجہ سے بہت جلد مصر آنا پڑا۔ یہاں آکر وہ المؤید کے اسٹاف میں شامل ہو گئے۔ اس وقت المؤید کی بڑی شہرت تھی اور وہ عالم اسلام کا ترجمان سمجھا جاتا تھا، اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنا مشہور علمی رسالہ المقتبس بھی جاری کیا جس میں فرانسیسی ادیبوں کے نتائجِ افکار کے تراجم اور قدیم عربی کتب شائع کی جاتی تھیں یہ رسالہ قدیم اور جدید خیالات کا حامل اور مشرقی اور مغربی تہذیبوں کا سنگم تھا۔

۱۹۰۸ء میں عثمانی انقلاب کے بعد جب قانونِ اساسی کا اعلان ہوا تو کرد علی واپس وطن چلے آئے۔ یہاں آکر انھوں نے المقتبس کے نام سے روزانہ اخبار جاری کیا جس میں رفیق المعظم۔ عبدالقادر المبارک۔ معروف الرحمانی۔ زہاوی۔ شوقی وغیرہ کے مضامین اور نظمیں بالالتزام شائع ہوا کرتے تھے، ترکی حکومت اس اخبار کی اشاعت کو زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکی۔ اخبار بند کر دیا گیا اور کرد علی نے ملک چھوڑنے میں عافیت سمجھی، ۱۹۰۹ء میں وہ لبنان ہوتے ہوئے فرانس پہنچ گئے وہاں کی تاریخی عمارتوں۔ درسگاہوں۔ علمی اداروں اور کتب خانوں کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے۔ وطن واپس آئے تو انقلابی خیالات و افکار اُن کی زبان و قلم پر تھے۔ اس سے پہلے ان کے دوست جرجی زیدان نے ان کو مشورہ دیا تھا کہ وہ سیاست سے یکسر دست بردار ہو کر علمی اور تحقیقی زندگی اختیار کر لیں، یہ نصیحت ان کے دل میں گھر کر گئی اس وقت جب کہ ان کی عمر چالیس سال کے قریب تھی ان کو خیال آیا کہ ملک شام کی سیاسی، علمی اور تمدنی تاریخ لکھی جائے جس کے لئے ضروری تھا کہ یورپ کا سفر کیا جائے اور وہاں کے کتب خانوں میں اسلامی تاریخ پر جو مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابیں موجود ہیں ان سے استفادہ کیا جائے روما میں امیر کاتیانی کا کتب خانہ عربی نوادرات کے لحاظ سے بے نظیر ہے جہاں وہ دو ماہ تک خطوط الشام کے لئے مواد جمع کرتے رہے اٹلی سے وہ سوئٹزرلینڈ گئے اس علمی سفر کے مشاہدات انھوں نے "غرائب الغرب" میں سپردِ قلم کئے ہیں، ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء

تک وہ کبھی دمشق اور کبھی قسطنطنیہ آتے جاتے رہے۔

وزارت

۱۹۱۸ء میں جب اتحادیوں نے دمشق فتح کیا تو کرد علی بھی وطن واپس آ گئے۔ قومی وزارت قائم ہوئی تو وزارت معارف کا قلم دان ان کے سپرد ہوا ۱۹۲۸ء میں دوبارہ وزیر تعلیم بنائے گئے ان کی وزارت کا کارنامہ مجمع العلمی العربی کا قیام۔ کلیۃ الالٰہیات اور مدرسۃ الاداب العلیا کا افتتاح اور کتب خانہ عادلیہ اور ظاہریہ کی تاسیس ہے۔ وزارت سے سبکدوش ہونے پر وہ تصنیف و تالیف میں مرتے دم تک مصروف رہے اور ۲۰ جون ۱۹۵۳ء کو ۷۷ برس کی عمر میں انتقال کیا۔

مجمع العلمی العربی کی صدارت
۱۹۱۸ - ۱۹۵۳

ان کی دیرینہ آرزو تھی کہ فرانس کی علمی اکاڈمی کی طرح عربی زبان کی ایک علمی مجلس قائم کی جائے جس کا مقصد عربی زبان کی نشر و اشاعت ہو ۱۹۱۹ء میں جب وہ وزیر تعلیم تھے تو انھوں نے رضا پاشا الرکابی کے سامنے عربی اکاڈیمی قائم کرنے کی تجویز پیش کی جو باضابطہ منظور کر لی گئی۔ تھوڑے سے وقفہ کو چھوڑ کر وہ عمر بھر اس علمی مجلس کے صدر رہے اس علمی مجلس نے جو مجمع العلمی العربی کے نام سے مشہور ہے عربی زبان کو بے حد ترقی دی - مجمع العلمی کا مقصد علمی اصطلاحات کا وضع کرنا۔ رائج الوقت غلط الفاظ کی تصحیح۔ علمی خطبات کا انتظام اور مخطوطات کو تہذیب اور تحشیہ کے ساتھ شائع کرنا ہے۔ مجمع العلمی العربی کے ارکان میں مختلف عربی ممالک کے مشہور علماء اور ادباء کے علاوہ ممتاز مستشرقین بھی شامل ہیں جن کے اشتراک عمل سے ۳۸ بلند پایہ علمی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ مجمع العلمی کی طرف سے ایک علمی رسالہ مجلۃ المجمع العلمی العربی کے نام سے ۱۹۲۲ء سے برابر نکل رہا ہے۔

علم و فضل

کرد علی دورِ حاضر کے ایک باکمال عالم۔ مورخ اور ادیب تھے۔ عربی زبان کے جدید

ادب میں ان کا وہی درجہ ہے جو مولانا شبلی کا اردو میں ہے، وہ فرانسیسی اور ترکی ادبیات سے یکساں شغف رکھتے تھے۔ انھوں نے فرنچ فلاسفہ اور علماء اجتماع کی کتب کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور ان کے خیالات و افکار سے بے حد متاثر تھے، وہ ایک وسیع المعلومات مورخ تھے جو تاریخ نویسی کے قدیم و جدید اصولوں سے واقف تھے ان کو جدید و قدیم مصادر پر یکساں دسترس حاصل تھی۔

عربی ادب پر ان کی نظر گہری اور ناقدانہ تھی۔ دیوان المتنبی۔ سبعہ معلقہ اور مقامات حریری انھیں زبانی یاد تھے اس کے علاوہ عمرو بن ربیعہ۔ بحتری۔ ابو تمام۔ شریف الرضی۔ ابن الرومی طغرائی اور مصری کے سینکڑوں قصائد اور ہزاروں اشعار ان کے نوکِ زبان تھے۔

اسلوبِ انشاء

کرد علی شروع شروع میں مسجع اور مقفیٰ انشاء کے دل دادہ تھے بعد ازاں جب انھوں نے متقدمین مثل عبد الحمید الکاتب۔ ابن المقفع۔ جاحظ اور ابو حیان التوحیدی کی تصانیف کا مطالعہ کیا تو انھیں عالم ہی دوسرا نظر آیا۔ پُر تکلف اور بے معنی انشاپردازی سے بہت جلد ان کی طبیعت ہٹ گئی اور انھوں نے سادہ نثر نویسی کو اختیار کر لیا ان کا اسلوب بیان صاف رواں اور متقدمین کی طرح فصیح ہے۔ عالمانہ وقار کا حامل ہے اور تیسری اور چوتھی صدی ہجری کے مصنفوں کے مشابہ ہے وہ فرنچ اسلوبِ بیان سے جس کے مقلد بعض اُن کے معاصر ادبا ہیں حتی المقدور بچتے ہیں۔

کتب تراجم

۱۹۰۷ء میں انھوں نے جارج ادانہ کے دو ناولوں کے تراجم الفضیلہ والرذیلہ المجرم البری کے نام سے شائع کئے۔ شارل سینوبوس کی تاریخ تمدن کا ترجمہ تاریخ الحضارۃ بھی اسی زمانہ کی یادگار ہے۔

تصانیف

(۱) غرائب الغرب۔ بعض یورپی ممالک کا سفرنامہ ہے۔

۲- حاضرالاندلس وغابرہا ۱۹۲۴- کرد علی نے اسپین کا سفر کیا تھا واپس آ کر اندلس مرحوم کے تاریخی آثار اور اس کے حاضر و ماضی پر دلچسپ کتاب حاضر الاندلس و غابرہا کے نام سے لکھی جو علمی اور ادبی حلقوں میں قبولیت کی نظر سے دیکھی گئی۔

۳- خطط الشام ۱۹۲۵- ملک شام کی سیاسی۔ تمدنی اور علمی تاریخ جو مصنف نے ۱۲۰۰ عربی۔ ترکی۔ فرانسیسی کتابوں کے مطالعہ کے بعد کئی سال کی محنت شاقہ کے بعد سات جلدوں میں لکھی ہے۔

۴- الاسلام والحضارۃ العربیہ ۱۹۳۴- اسلام کی سیاسی اور تمدنی تاریخ، اسلام کی مدافعت۔ عربی تہذیب کی یورپی تہذیب پر برتری اور افضلیت مستشرقین کی غلطیوں کی نشاندہی اور بیسیوں قیمتی مباحث پر مشتمل ہے جس کا مطالعہ تاریخ اسلام کے طالب علم کے لئے ازبس ضروری ہے پوری کتاب جو دو جلدوں میں ہے مصنف کی حیرت انگیز وسعتِ معلومات اور قوتِ استدلال پر دال ہے۔

۵- امراء البیان ۱۹۳۷- ادب عربی کے حضرات عشرہ مبشرہ عبد الحمید الکاتب۔ عبداللہ بن المقفع۔ سہل بن ہارون۔ عمرو بن جعدہ۔ ابراہیم العربی۔ احمد بن یوسف الکاتب۔ محمد عبد الملک الزیات۔ جاحظ اور ابو حیان التوحیدی کے حالات اور تصانیف کے بارے میں جس میں ان ادباء کے اسالیبِ انشاء پر سیر حاصل تبصرہ بھی شامل ہے۔

۶- کنوز الاجداد ۱۹۵۰- مشہور عرب مصنفوں اور انشاء پردازوں۔ امام اشعری، ابن المقفع۔ جاحظ۔ المبرد۔ طبری۔ مسعودی۔ ابو الفرج الاصفہانی۔ ماوردی۔ امام عبد القاہر ابو جانی۔ امام ابن تیمیہ وغیرہم کے دلچسپ حالاتِ زندگی ہیں۔ شروع میں انھوں نے اپنے استاد شیخ طاہر الجزائری کے حالات بڑی محبت و عقیدت سے لکھے ہیں۔ ان دونوں کتابوں میں ان کی انشاء پردازی سحر حلال تک پہنچی ہے۔

۷۔ المذکرات ۱۹۴۸ - ۱۹۵۱ء:۔ جوان کی طویل زندگی کے تجربات و مشاہدات پر مبنی ہیں۔ مختلف قسم کے افکار اور خیالات کا مجموعہ ہیں۔ کرد علی ترکی استبداد اور فرانسیسی استعمار دونوں کے جانی دشمن تھے لیکن اس کتاب میں زیادہ تر ترک ہی نشانہ ملامت بنے ہوئے ہیں ایک جگہ غازی انور پاشا مرحوم کی دینداری کو مصنوعی اور ظاہری بتلایا ہے واللہ اعلم۔ معاصر ادبا نے اس کتاب کے متعلق اچھے اور برے دونوں قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

مندرجہ ذیل کتابیں ان کی تصحیح اور تہذیب سے شائع ہو چکی ہیں۔ رسائل البلغا سیرۃ احمد بن طولون۔ المستجاد من مغلات الاجواد۔ تاریخ حکماء الاسلام۔ کتاب الاشربۃ البیزرہ۔

ان کی ترغیب۔ تشویق اور علمی رہنمائی نے کئی نوجوانوں کو پختہ قلم ادیب اور انشاء پرداز بنا دیا ہے جن میں شفیق جبری۔ سعید الافغانی۔ منیر العجلانی۔ صلاح الدین منجد۔ سامی الاہان کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں جو اس وقت شام کے علمی اور ادبی افق پر آفتاب اور ماہتاب بن کر چمک رہے ہیں۔ بوڑھوں میں خلیل مردم بک عبد القادر[1] المغربی۔ شیخ بہجت بیطار بھی اسی سلسلۃ الذہب کی زریں کڑیاں ہیں جنہوں نے علمی تحقیق و تدقیق کے لئے اپنی زندگیاں وقف کی ہوئی ہیں۔

---

[1] پچھلے دنوں ان کا بھی انتقال ہو گیا ہے۔

خلافتِ راشدہ

حصہ دوم تاریخ ملت:۔ عہد خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے واقعات قدیم و جدید عربی تاریخوں کی بنیاد پر صحت و جامعیت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ یہ جلد بھی کالجوں اور اسکولوں کے کورس میں داخل ہونے کے لائق ہے۔ جدید ایڈیشن صفحات ۲۷۶ قیمت ۳/۱۲ مجلد ہے۔

ادبیات

غزل

از

(جناب آلم مظفر نگری)

چمن ہو کہ صحن بیابان جنوں کے ہر اک سمت پھیلے ہوئے سلسلے ہیں
ادھر خار دامن سے اُلجھے ہوئے ہیں اُدھر گل سے بلبل کو شکوے گلے ہیں

زمانے کی تاریخ شاہد ہے اس کی نفاق و عداوت سے نفرت ہے ہم کو
صداقت پرستی ہے ملنا ہمارا ملے جب کسی سے تو دل سے ملے ہیں

وہ ہو جورِ صیاد یا ظلمِ گلچیں نہیں ذمہ دار انقلابِ چمن کے
جگائے ہیں فتنوں یہ فتنے انھوں نے سرِ صحنِ گلشن جو غنچے کھلے ہیں

کچھ ایسی بھی آزادیاں ہیں کہ جن کی فضاؤں میں پھیلا ہے دامِ اسیری
بڑے پُر خطر ہیں وہ گوشے چمن کے جو بالکل قفس کی حدود سے ملے ہیں

کہیں آندھیوں کے غضبناک جھونکے کہیں بجلیوں کے نشیمن پہ حملے
بحیرت میں چاروں طرف دیکھتا ہوں بہاروں کے آتے ہی کیا گل کھلے ہیں

کمالاتِ عجز و مروت کا عالم بہ مے خانۂ عشق دیکھا ہے ہم نے
چلا دور جب بادۂ مشکبو کا تو شیشے پیالوں سے جھک کر ملے ہیں

تعین کی نیرنگیاں کہہ رہے ہیں جنہیں راز دارانِ بزمِ تماشا
انھیں جلوہ گاہوں کے پردوں میں آ کر وہ ہم سے ملے اور اکثر ملے ہیں

تجھے ناز ہے اپنی چارہ گری پر تو پھر یہ لہو آ گیا ہے کہاں سے
ذرا چارہ گر دیکھ لے غور سے پھر سلے ہیں مرے زخم یا بن سلے ہیں

نہیں منزلِ عشق یہ اے مسافر بہر رنگ جلوہ فریبِ نظر ہے
بعزمِ جواں گام زن ہو ابھی تو کئی مرحلے ہیں کئی فاصلے ہیں
محبت کے آئین و دستور کیا ہیں حقیقت سے ان کی نہیں کوئی واقف
زمانہ سمجھتا ہے جن کو جفائیں وہی تو وفاؤں کے بیری صلے ہیں
زمانے میں کیوں انقلاب آگیا ہے ہوا کس لئے نظمِ کونین برہم
نہ زلفیں پریشاں ہوئی ہیں کسی کی نہ گیسو ہوا سے کسی کے ہلے ہیں
جو سہ جائیں گے آفتوں کو خوشی سے الم ہیں وہی کامیابِ دو عالم
زمانہ انھیں پیس ڈالے گا اک دن جو ہمت کے ہیٹے ہیں اور بزدلے ہیں

غزل

از

(جناب شمس نوید)

اِن کی تجلّی طوفاں طوفاں — ہائے نظر کی تنگیِ داماں!
زیست ہے اک درپردہ احساں — مشکل مشکل آساں آساں
سوزِ خلوص عزم کے قرباں — ناکامی بن جاتی ہے روماں
کیا غمِ دوراں کیا غمِ جاناں — سب سے مقدس اک غمِ انساں
کھیل نہیں للکار ہے ظالم — ساحل سے نظارۂ طوفاں
جب سے مستقبل کی طلب ہے — یاد نہ آئی عمرِ گریزاں
روح نے جب بازو پھیلائے — پھیل گیا ہے عالمِ امکاں
عشق نہیں تو زیست کا عالم — افسانہ ـــــ محرومِ عنواں
باطن کی قدریں ظاہر پر! — یہ تہذیب کا رقصِ عریاں
ممنونِ اشکِ شبنم ہے — یہ پھولوں کی پاکیِ داماں

کیفِ تپش کا نام ہے ہستی　　زیست مکمل درد نہ درماں
فرقوں کی تنظیم مبارک!
ملت کا شیرازہ پریشاں!

غزل

از

(سعید احمد اکبر آبادی)

یہ غزل ۲۰ جولائی ۵۷ء کو بھارتیہ سنسکرتیہ سنسار۔ کلکتہ کے سالانہ اردو مشاعرہ میں جو اڈیٹر برہان کی صدارت میں منعقد ہوا اور جس میں شری مہرچند کھنہ وزیرآبادکاری حکومت ہند مہمان خصوصی کی حیثیت سے تشریف رکھتے تھے۔ سنائی گئی۔

ہرچند کہ انداز ہیں اس میں بھی ستم کے　　ممنون ہیں پھر بھی نگہ لطف و کرم کے
ہے جن کو میسر ترے کوچہ کی گدائی　　خواہاں نہیں وہ حشمتِ دولتِ جم کے
ہے جن کے تصور میں ترے حسن کا گلشن　　جنت کے وہ طالب ہیں نہ گلزار ارم کے
معلوم نہیں کیا ہے تقاضائے محبت　　ہم جور سے خوش ہیں نہ طلبگار کرم کے
تم شوق سے کھولو شکنِ کاکلِ پُرخم　　نکلیں گے نہیں پیچ مرے بختِ دژم کے
تسکیں نہ ہوئی چین نہ آیا دمِ رخصت　　گو تم نے حوالے بھی دیے سر کی قسم کے
کانٹوں کی زباں بن کے رہی کشتِ تمنا　　دو چار بھی قطرے نہ گرے ابر کرم کے
آنکھوں میں بسا تھا رخ پرنور کا عالم　　دل پھر بھی نہ بدلے شبِ غم شامِ الم کے
زنارِ محبت ہیں بندھے شیخ و برہمن　　اب خیر سے جھگڑے تو مٹے دیر و حرم کے
کوئی نہ رہا ساتھ رہِ ملکِ عدم میں　　جو ساتھ تھے ساتھی تھے فقط چار قدم کے

دیکھی ہے سعید اُن کی نظر ہم نے غضب کا
خنجر کے نہ قائل ہیں نہ شمشیرِ دو دم کے

تبصرے

رسالوں کے خاص نمبر

فاران کراچی کا توحید نمبر | مرتبہ جناب ماہر القادری۔ ضخامت ۴۰۰ صفحات کتابت طباعت عمدہ قیمت ہے، تین روپیہ آٹھ آنہ پتہ :- دفتر فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی - ا

اسلام کی تمام تعلیمات کی چونکہ بنیاد ہی توحید ہے اس لئے آج مسلمانوں میں اعتقاد اور عمل کی چند در چند جو گمراہیاں پھیلی ہوئی ہیں اور جنھوں نے اُن کو صراطِ مستقیم سے بہت دور کر دیا ہے اگر ان کے اسباب و علل کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اُن کا اصل سبب توحید سے منحرف ہو جانا ہے اس بنا پر سب سے مقدم اور ضروری یہ ہے کہ مسلمانوں میں توحیدِ ذات اور توحید فی الصفات کا اعتقاد راسخ پیدا کیا جائے۔ اسی ضرورت کے پیشِ نظر پاکستان کے مشہور دینی اور اصلاحی ماہنامہ فاران نے یہ خاص نمبر شائع کیا ہے جو اس قدر جامع اور حاوی ہے کہ موضوعِ بحث کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس پر ایک آدھ مضمون نہ ہو۔ اگرچہ بعض مضامین میں لب و لہجہ کی زیادتی اور طرزِ تعبیر میں قدرے بے احتیاطی پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے نقطۂ اعتدال سے انحراف پیدا ہو گیا ہے مثلاً شفاعت کا مطلقاً انکار۔ اسلام میں تصوف کی نفی۔ ختم بخاری کا عدم جواز۔ بعض مفید چیزوں کو بھی بدعت قرار دے دینا تاہم مجموعی اعتبار سے سب مضامین لائقِ مطالعہ اور مفید ہیں اور خاص طور پر فاضل اڈیٹر کا مقالہ "نقش دل" مولانا قاری محمد طیب صاحب کا "علم غیب" مولانا ابو الحسن علی کا "توحید" اور مولانا محمد اسماعیل سلفی کا مضمون "زیارت قبور" زیادہ مبسوط و مفصل اور مفید ہیں۔ نمبر کو جامع بنانے کے لئے غیر مطبوعہ مضامین کے ساتھ بعض مطبوعہ مضامین بعض مطبوعہ کتابوں کے اقتباسات اور بعض عربی مضامین کے اُردو تراجم بھی شامل کر لیے گئے ہیں۔ بہر حال اس کا مطالعہ بہت سی گمراہیوں سے نجات کا باعث ہوگا۔

الفرقان لکھنؤ کا افادات گیلانی نمبر مدیر مسئول مولانا محمد منظور نعمانی ضخامت ۲۱۵ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت دو روپیہ پتہ:- کچہری روڈ لکھنؤ۔ یہ نمبر خاص مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی یادگار میں شائع کیا گیا ہے لیکن جدت یہ کی ہے کہ اس کو مولانا مرحوم سے متعلق دوسرے ارباب قلم کے مضامین کے بجائے خود مولانا کے جو مقالات الفرقان میں چھپتے رہے تھے ان کے انتخاب سے مرتب کیا ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا کے چار نہایت اہم مقالات "مجدد الف ثانی کا تجدیدی کارنامہ" "حج کیا ہے" "دجالی فتنہ اور سورۂ کہف" وفاشعاری کے دو نادر نمونے جو مولانا کے تبحر علمی۔ دقیقہ رسی۔ حسن استدلال اور وسعت نظر کے آئینہ دار ہیں۔ شریک اشاعت ہیں۔ مولانا کے مقالات میں چوں کہ تداخل مضامین کثرت سے پایا جاتا ہے اس لئے افادہ عام کی غرض سے لائق مرتب نے ان مضامین کی ترتیب۔ تلخیص یا کہیں حذف واضافہ میں بڑی کاوش کی ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اب ان مقالات سے وہ حضرات بھی کماحقہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو مولانا گیلانی کے طرز تحریر سے مانوس نہیں ہیں۔ ان مقالات کے علاوہ شروع میں مولوی عتیق الرحمٰن صاحب سنبھلی۔ مولانا ابوالحسن علی اور مولانا محمد منظور نعمانی کے رشحات قلم ہیں جن میں مولانا کے فضائل وکمالات پر اپنے ذاتی محسوسات یا مولانا کے خطوط کی روشنی میں گفتگو کی گئی ہے۔ ادارۂ الفرقان نے درحقیقت یہ بڑا کام کیا کہ مولانا گیلانی کے چار اہم مضامین کو حسن ترتیب کے ساتھ یکجا کتابی شکل میں شائع کرکے محفوظ کردیا۔ امید ہے کہ ارباب ذوق اس کی قدر کریں گے۔

العلم کراچی کا جنگ آزادی نمبر مرتبہ سید الطاف علی صاحب بریلوی صفحات ۱۹۲ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۳ روپیہ پتہ:- سعادت منزل۔ ناظم آباد۔ بندر روڈ کراچی۔ ۵ العلم آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کا مشہور سہ ماہی رسالہ ہے اس کا یہ خاص نمبر ۱۸۵۷ء کے مجاہدین آزادی کے تذکروں اور اس سلسلہ کے دوسرے مضامین پر مشتمل ہے ان مضامین سے اندازہ ہوگا کہ مسلمانوں نے ہندوستان پر برطانوی اثرات کو کبھی گوارا نہیں کیا اور ملک پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی گرفت کے مضبوط ہونے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی مجاہدانہ سرگرمیاں برابر بڑھتی

تبصرے

رسالوں کے خاص نمبر

فاران کراچی کا توحید نمبر مرتبہ جناب ماہر القادری۔ ضخامت ۴۰۸ صفحات کتابت طباعت عمدہ قیمت ہے، تین روپیہ آٹھ آنہ پتہ:- دفتر فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی - ۱

اسلام کی تمام تعلیمات کی چونکہ بنیاد ہی توحید ہے اس لئے آج مسلمانوں میں اعتقاد اور عمل کی چند در چند جو گمراہیاں پھیلی ہوئی ہیں اور جنھوں نے اُن کو صراطِ مستقیم سے بہت دور کر دیا ہے اگر ان کے اسباب و علل کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اُن کا اصل سبب توحید سے منحرف ہو جانا ہے اس بنا پر سب سے مقدم اور ضروری یہ ہے کہ مسلمانوں میں توحیدِ ذات اور توحید فی الصفات کا اعتقاد راسخ پیدا کیا جائے۔ اسی ضرورت کے پیشِ نظر پاکستان کے مشہور دینی اور اصلاحی ماہنامہ فاران نے یہ خاص نمبر شائع کیا ہے جو اس قدر جامع اور حاوی ہے کہ موضوعِ بحث کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس پر ایک آدھ مضمون نہ ہو۔ اگرچہ بعض مضامین میں لب و لہجہ کی زیادتی اور طرزِ تعبیر میں قدرے بے احتیاطی پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے نقطۂ اعتدال سے انحراف پیدا ہو گیا ہے مثلاً شفاعت کا مطلقاً انکار۔ اسلام میں تصوف کی نفی۔ ختم بخاری کا عدم جواز۔ بعض مفید چیزوں کو بھی بدعت قرار دے دینا تاہم مجموعی اعتبار سے سب مضامین لائقِ مطالعہ اور مفید ہیں اور خاص طور پر فاضل اڈیٹر کا مقالہ "نقشِ دل" مولانا قاری محمد طیب صاحب کا "علم غیب" مولانا ابو الحسن علی کا "توحید" اور مولانا محمد اسماعیل سلفی کا مضمون "زیارتِ قبور" زیادہ مبسوط و مفصل اور مفید ہیں۔ نمبر کو جامع بنانے کے لئے غیر مطبوعہ مضامین کے ساتھ بعض مطبوعہ مضامین، بعض مطبوعہ کتابوں کے اقتباسات اور بعض عربی مضامین کے اُردو تراجم بھی شامل کر لیے گئے ہیں۔ بہر حال اس کا مطالعہ بہت سی گمراہیوں سے نجات کا باعث ہوگا۔

الفرقان لکھنؤ کا افادات گیلانی نمبر | مدیر مسئول مولانا محمد منظور نعمانی ضخامت ۲۱۵ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت دو روپیہ پتہ:- کچہری روڈ لکھنؤ - یہ نمبر خاص مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی یادگار میں شائع کیا گیا ہے لیکن جدت یہ کی ہے کہ اس کو مولانا مرحوم سے متعلق دوسرے ارباب قلم کے مضامین کے بجائے خود مولانا کے جو مقالات الفرقان میں چھپتے رہے تھے ان کے انتخاب سے مرتب کیا ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا کے چار نہایت اہم مقالات "مجدد الف ثانی کا تجدیدی کارنامہ" "حج کیا ہے" "دجالی فتنہ اور سورۂ کہف" وفا شعاری کے دو نادر نمونے جو مولانا کے تبحر علمی - دقیقہ رسی - حسن استدلال اور وسعت نظر کے آئینہ دار ہیں - شریک اشاعت ہیں - مولانا کے مقالات میں چوں کہ تداخل مضامین کثرت سے پایا جاتا ہے اس لئے افادۂ عام کی غرض سے لائق مرتب نے ان مضامین کی ترتیب - تلخیص یا کہیں حذف و اضافہ میں بڑی کاوش کی ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اب ان مقالات سے وہ حضرات بھی کما حقہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو مولانا گیلانی کے طرز تحریر سے مانوس نہیں ہیں - ان مقالات کے علاوہ شروع میں مولوی عتیق الرحمن صاحب سنبھلی - مولانا ابو الحسن علی اور مولانا محمد منظور نعمانی کے رشحات قلم ہیں جن میں مولانا کے فضائل وکمالات پر اپنے ذاتی محسوسات یا مولانا کے خطوط کی روشنی میں گفتگو کی گئی ہے - ادارۂ الفرقان نے درحقیقت یہ بڑا کام کیا کہ مولانا گیلانی کے چار اہم مضامین کو حسن ترتیب کے ساتھ یک جا کتابی شکل میں شائع کر کے محفوظ کر دیا - امید ہے کہ ارباب ذوق اس کی قدر کریں گے۔

العلم کراچی کا جنگ آزادی نمبر | مرتبہ سید الطاف علی صاحب بریلوی صفحات ۱۹۲ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۳ روپیہ پتہ:- سعادت منزل - ناظم آباد - بندر روڈ کراچی - ۵ العلم آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کا مشہور سہ ماہی رسالہ ہے اس کا یہ خاص نمبر ۱۸۵۷ء کے مجاہدین آزادی کے تذکروں اور اس سلسلہ کے دوسرے مضامین پر مشتمل ہے ان مضامین سے اندازہ ہوگا کہ مسلمانوں نے ہندوستان پر برطانوی اثرات کو کبھی گوارا نہیں کیا اور ملک پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی گرفت کے مضبوط ہونے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی مجاہدانہ سرگرمیاں برابر بڑھتی

رہیں۔ یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء میں یہ پھوڑا پھوٹ پڑا۔ اور اس سلسلہ میں مسلمانوں نے وہ شاندار کارنامے انجام دیئے جو حبِ وطن کی تاریخ میں شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں یوں تو اس نمبر کے سب مضامین ہی خون میں گرمی پیدا کرتے ہیں لیکن جنرل بخت خان اعظم کی سرگذشت محمد علی خاں بریلوی۔ ۱۸۵۷ء کی کہانی۔ کچھ ان کی کچھ اپنی زبانی۔ نواب خان بہادر شہید منشی رسول بخش کاکوروی۔ مولانا کافی "، خاص طور پر ولولہ انگیز اور عبرت آموز ہیں ان کے علاوہ انقلاب ۱۸۵۷ء کا ایک ولولہ انگیز رومان اور سکینہ بھی دلچسپ اور لائقِ مطالعہ ہیں۔ ظفر کی شاعری پر جو مضمون ہے طالب علمانہ ہے۔ مقالات کے آخر میں مختلف ضمیمے ہیں جو انگریزوں کے مظالم سے تعلق رکھتے ہیں یوں تو مسلمانوں کے جہادِ آزادی کی تاریخ اس قدر طویل ہے کہ اس کے لئے کئی جلدیں درکار ہیں لیکن ایک سہ ماہی رسالہ کے خاص نمبر سے جو تقریباً دو سو صفحات کا ہو اور اس سے زیادہ کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔ اس حیثیت سے یہ نمبر اپنے مقصد میں بہمہ وجوہ کامیاب اور لائقِ مطالعہ ہے۔

ماہنامہ درس علی گڈھ کا کانووکیشن نمبر | مرتبہ شرافت حسین مرزا صاحب ایم۔ اے
صفحات ۸۰ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۱۲ پتہ :- جامعہ اردو علی گڈھ۔

جامعہ اردو علی گڈھ اپنے اردو امتحانات کے وسیع وعریض سلسلہ کے ذریعہ اردو زبان وادب کی جو ٹھوس اور نہایت لائق قدر خدمات انجام دے رہا ہے اہلِ نظر سے وہ پوشیدہ نہیں ہیں گذشتہ ماہ مارچ میں جامعہ نے اپنا کنووکیشن منعقد کیا تھا۔ جامعہ کے ماہنامہ درس کا یہ خاص نمبر اسی تقریب سے شائع کیا گیا ہے۔ اس نمبر میں جامعہ کی تاریخ اور اس کی خدمات کا مفصل تذکرہ آگیا ہے جس کو پڑھ کر اندازہ ہوگا کہ اگر چند مخلص کسی کام کا بیڑا اٹھالیں تو چند برسوں میں ہی وہ کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ جامعہ کے کارناموں کے تذکرہ کے علاوہ بعض مفید ادبی مقالات بھی اس نمبر میں شامل ہیں جو امیدوارانِ امتحانات کے لئے بہت مفید ہوں گے۔ جو لوگ اردو زبان کا درد رکھتے ہیں ان کو کم از کم اس نمبر کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔

برہان

جلد ۳۹ شمارہ ۳

ستمبر ۱۹۵۷ء مطابق صفر المظفر ۱۳۷۷ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

گذشتہ ماہ مئی کے برہان میں اسلامی جماعت سے متعلق جو نظرات لکھے گئے تھے ہندو پاک کے موقر اسلامی رسائل و جرائد میں اور عام مجالس میں ان کا غیر متوقع طور پر بڑا چرچا رہا بلکہ اُن کی صدائے بازگشت اب بھی کہیں کہیں سنائی دے جاتی ہے۔ ایک نوٹ میں جو مختصر اور محدود ہو جس چیز کی نسبت اظہارِ خیال کیا جاتا ہے چوں کہ لکھنے والے کی توجہ صرف اسی پر مرکوز ہوتی ہے اس لئے اس سلسلہ کی بعض جزئیات اور تفصیلات کے ذکر کرنے کا موقع نہیں ہوتا اور اس کی وجہ سے بعض حضرات کو غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں چنانچہ اس تحریر سے بھی بعض حضرات کو طرح طرح کی غلط فہمیاں اور شکوک و شبہات پیش آگئے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس خاکسار کو ان کے بارہ میں لکھنے کی ضرورت اس لئے نہیں ہوئی کہ بعض احباب نے خود اپنی تحریروں سے ان غلط فہمیوں کو دور کر دیا اس سلسلہ میں معارف نے ایک جامع نوٹ لکھ کر اُن پہلوؤں کی وضاحت کر دی جن کا ذکر نظرات میں نہیں ہو سکا تھا۔ تعصب اور تشدد کے الفاظ سے جو مغالطہ ہوا تھا۔ یا دوسری جماعتوں پر طنز و تعریض کا جو اشتباہ ہوا تھا اُس کو الحرم میرٹھ نے صاف کر دیا۔ یا بعض حضرات نے اسلامی جماعت کی غیر مشروط حمایت و موافقت کا جو الزام لگایا تھا اُس کو خود جماعت کے آرگن ایشیا لاہور نے بالکل صاف کر دیا اور اُس نے یاد دلایا کہ اسی برہان کے صفحات پر جماعت اسلامی کے بانی و امیر کے بعض افکار و خیالات پر تنقید ہو چکی ہے۔ اور اسی وجہ سے برہان کے ان نظرات کا ایک وزن ہے اور ان کو اسلامی جماعت کی جانبدارانہ حمایت نہیں کہا جا سکتا۔ خاکسار اڈیٹر برہان ان تینوں موقر مجلات کے مدیرانِ فاضل و محترم کا دل سے شکر گذار ہے کہ انھوں نے اس غریب کو جواب دہی کی زحمت سے بچا لیا۔ اور نظرات متعلقہ کی تحریر کا جو اصل مقصد

تھا اُس کو اُجاگر کر کے پیش کر دیا۔

اس سلسلہ میں اس قدر گذارش کر دینا اور ضروری ہے کہ اگرچہ عام طور پر ہوتا یہی ہے کہ کسی ادارہ کے مجلہ میں کسی مسئلہ کی نسبت جو خیال ظاہر کیا جاتا ہے وہ اُس ادارہ کے تمام ارکان کا ہی خیال سمجھا جاتا ہے اور جہاں تک ندوۃ المصنفین کے ارکانِ خصوصی کا تعلق ہے وہ بھی بحمد اللہ بڑی حد تک عام افکار و نظریات میں ایک دوسرے کے ہم خیال و ہم رائے بھی ہیں۔ تاہم اصولی طور پر جو تحریر جس کے نام سے شائع ہو اُسی کو اُس کا مسئول اور ذمہ دار قرار دینا چاہیئے اور دوسروں کو محض رفاقتِ کار کی وجہ سے اُس کے ساتھ لپیٹنے کی کوشش نہ کرنی چاہیئے۔ کیوں کہ بنیادی طور پر ہم خیالی کے باوجود چوں کہ ہر شخص کا طرزِ تعبیر اور طریقہ بیان جُدا ہوتا ہے اس لئے ممکن ہے کہ وہ خود اگر اسی خیال کو ظاہر کرتا تو کسی دوسرے طریقہ پر ظاہر کرتا۔ اور پھر قارئینِ برہان کو تو یاد ہو گا کہ ہندوستان میں انسدادِ گاؤ کُشی کے متعلق برادرِ محترم مولانا حفظ الرحمن صاحب کی تحریر خود اڈیٹر برہان کی تحریر کے رد میں برہان میں ہی شائع ہو چکی ہے۔ برادرِ گرامی قدر مولانا عتیق الرحمن صاحب عثمانی فطرتاً نہایت عالی ظرف اور بڑے وسیع الحوصلہ ہیں اُن کو اڈیٹر برہان کی کسی تحریر سے اگر کچھ اختلاف ہوتا بھی ہے تو وہ اس کی مطلق پروا نہیں کرتے اور اس کی کوشش نہیں کرتے کہ جو اُن کی رائے ہے برہان میں بھی اسی کی نمائندگی کی جائے۔

جو حضرات برہان کا شروع سے مطالعہ کر رہے ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ کسی مسئلہ میں کسی کے ساتھ موافقت ہو یا مخالفت بہرحال ہر ایک کی ایک حد ہے اور برہان کبھی اُس حد سے آگے نہیں جاتا۔ یہ موافقت یا مخالفت کسی تحزیب یا جماعت بندی کا نتیجہ نہیں ہوتی اور نہ ہونا چاہیئے۔ کیوں کہ تحزیب سے بڑھ کر حقیقت شناسی اور حق پسندی کا کوئی دشمن نہیں ہے اور ایک قومی ادارہ کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی بد نصیبی نہیں ہو سکتی کہ وہ ردّ و قبول کا معیار کسی خاص جماعت کے ساتھ وابستگی کو بنائے۔ برہان کی موافقت یا مخالفت مسئلہ زیرِ بحث کے صرف علمی تجزیہ پر مبنی ہوتی ہے اور سنجیدہ و متین لب و لہجہ میں ہوتی ہے جس میں نہ مدح سرائی ہوتی ہے اور نہ دل آزاری کی آمیزش!

یہی وجہ ہے کہ گذشتہ چند برسوں میں اڈیٹر برہان کے قلم سے جو بعض تنقیدی مضامین نکلے ہیں ان کو پڑھ کر وہ حضرات جن پر تنقید کی گئی تھی نہ صرف یہ کہ بددل اور بدمزہ نہیں ہوئے بلکہ انھوں نے بھی دعائیں دی ہیں اور شکریہ کے خطوط لکھے ہیں۔ جو بات ایمانداری اور علمی دیانت کے ساتھ کہی جاتی ہے وہ اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہتی اور اس کے برخلاف جس اختلاف خیال کا اظہار معاندانہ طریقہ پر ہوتا ہے اس سے بجائے نفع کے ہمیشہ نقصان ہی پہنچا ہے اور اصل مقصد کبھی حاصل نہیں ہوتا۔ احباب کرام اگر برہان کی اس طبعی خصوصیت اور مزاج کو ہمیشہ پیش نظر رکھیں تو بہت سی زحمتوں سے بچ جائیں گے۔

۲۵ اگست کو انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڈھ کی زیر ہدایت پورے ملک میں یوم اردو بڑے جوش و خروش کے ساتھ منایا گیا۔ لیکن جہاں تک اردو کے لئے حکومت سے کہنے سننے اور درخواست کرنے کا تعلق ہے تو اس کا صاف معاملہ یہ ہے کہ

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں

میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

تو اب سوال یہ ہے کہ آخر آپ پھر خط کب تک لکھتے رہیں گے اور اس سے اردو کو کیا فائدہ پہنچے گا؟ ضرورت اس بات کی ہے کہ حکومت سے عرض معروض اور اس سے کہنے سننے کے کام کو چند لوگوں کے سپرد کر کے اردو کے لئے اصل تعمیری کوششیں کی جائیں جن کی وجہ سے اردو نے ماضی میں شاندار ترقی کی ہے اور جن کے بغیر کوئی بھی زبان نہ زندہ رہ سکتی ہے اور نہ ترقی کر سکتی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ گذشتہ دس سال میں ہم نے اردو کے لئے چیخ پکار کافی کی ہے اور اپنا بڑا وقت اور روپیہ حکومت سے اپنی بات منوانے پر صرف کیا ہے لیکن عوام میں اردو کو مقبول بنانا علوم و فنون سے اس کے دامن کو مالا مال کرنا۔ بالغوں کی اردو تعلیم کے مرکز جگہ جگہ قائم کرنا عمدہ لٹریچر کے ذریعہ نوجوانوں میں اردو کا ذوق پیدا کرنا۔ اردو صحافت کا معیار اونچا کرنا۔ ہندی زبان میں اردو کے شاہکار شائع کرنا۔ اردو اہل قلم اور ناشرین کی حوصلہ افزائی کا سامان کرنا وغیرہ وغیرہ ان چیزوں کی طرف توجہ کم کی گئی ہے۔ حالاں کہ اصل ضروری کام یہی ہے اور صرف اسی سے اردو کے مسئلہ کا حل پیدا ہو سکتا ہے۔

نقشہ حدودِ عراق

ماخوذ از

(جی لے اسٹرینج (لینڈس آف دی ایسٹرن کیلیفیٹ)
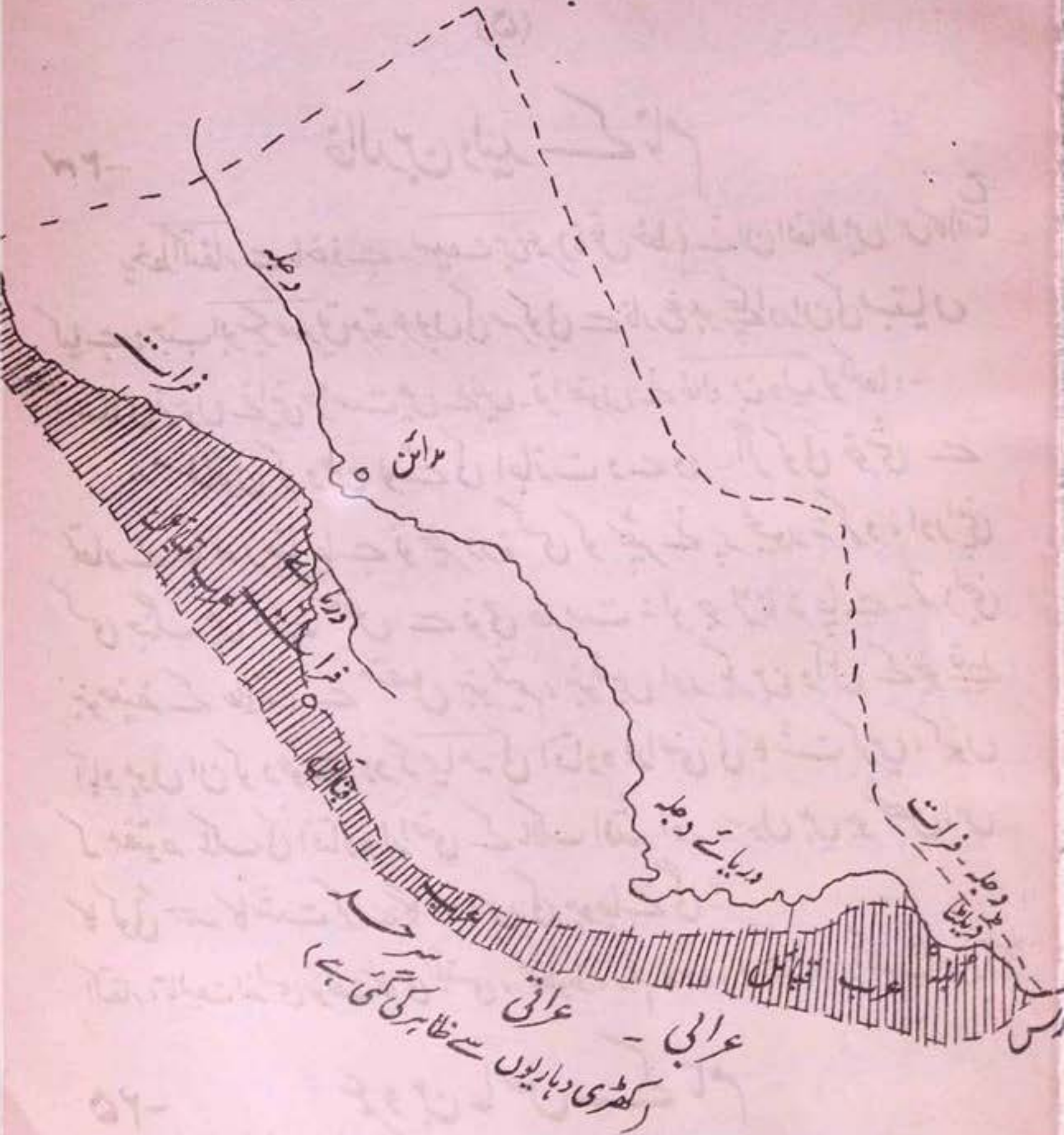
دجلہ

فرات

مدائن

دریائے دجلہ

دریائے دجلہ و فرات

فارس

(سرحد عراقِ عربی — کھڑی دہاریوں سے ظاہر کی گئی ہے)

حضرت ابو بکرؓ کے سرکاری خطوط

از

(جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب فارق - استاذ ادبیات عربی - دہلی یونیورسٹی)

(۵)

۲۴- خالد بن ولید کے نام

یہ خط اکتفار سے ماخوذ ہے۔ سیف بن عمر (ناقل خط) نے ان الفاظ میں اس کا افتتاح کیا ہے: جب ابو بکر صدیق مرتد عربوں کی سرکوبی سے فارغ ہو چکے اور ان کی بستیاں اسلامی فوجوں نے اپنی حراست میں لے لیں۔ تو انھوں نے خالد بن ولید کو لکھا:-

"مسلمانوں کو وطن لوٹنے کی اجازت دے دو۔ اگر کوئی خوشی سے تمھارے ساتھ رہنا چاہے تو خیر ورنہ کسی کو ٹھیرنے پر مجبور نہ کرو، اور اپنی کسی جنگ میں ایسے شخص سے فوجی خدمت نہ لو جو لڑنا نہ چاہے۔ تم (یعنی بنو حنیفہ کے علاقہ) سے متصل بنو تمیم، بنو قیس اور بکر بن وائل کے جو قبیلے آباد ہوں ان کو دعوت دو کہ یمامہ کی افتادہ اراضی کی کاشت کریں، کیوں کہ مفتوحہ ملک کی افتادہ اراضی کے مالک اللہ اور رسول ہیں جو شخص اس کا کوئی حصہ کاشت کرے گا وہ اس کی ہو جائے گی۔"

اکتفار، تالیف اندلسی مؤلف کلاعی بلنسی، مخطوطہ، رقم ۵۲۷، ص۳۵، دار الکتب المصریۃ، قاہرہ-

۲۵- عمرو بن عاص کے نام

یہ خط ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں بیان کیا ہے۔ اس کا سیاق سباق انوکھا ہے۔

خط اور سیاق سباق دونوں عمروؓ کی زبانی سُنئیے: مجھے رسول اللہؐ نے عمّان کا والی بنا کر بھیجا۔ جب میں وہاں پہنچا تو مقامی پادری اور راہب میرے پاس آئے اور پوچھا: "تم کون ہو؟" میں نے کہا: میرا نام عمرو بن عاص ہے، قبیلۂ قریش کا ممتاز فرد ہوں۔" انھوں نے پوچھا: تمھیں کس نے بھیجا ہے؟" میں نے کہا: رسول اللہ نے۔" انھوں نے کہا: "رسول اللہ کون؟" میں نے جواب دیا: محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب، وہ ہماری قوم کے ایک ممتاز فرد ہیں، ہم ان کے حسب نسب سے واقف ہیں، انھوں نے ہم کو عمدہ سیرت پر چلنے کی تاکید کی ہے، اور بُری سیرت سے روکا ہے، اس کے علاوہ ہم کو حکم ہے کہ بس ایک خدا کی پرستش کریں۔" پادریوں نے اپنا ایک نمایندہ مجھ سے گفتگو کرنے کے لئے مقرر کیا۔ اس نے پوچھا: اس نبی کی کوئی علامتِ نبوت ہے؟" میں نے کہا: ہاں، دونوں کندھوں کے بیچ گوشت کی ایک ٹکیا جس کو خاتمِ نبوت کہتے ہیں۔" نمایندہ: کیا وہ خیر خیرات قبول کر لیتا ہے؟" میں نے کہا: نہیں۔" نمایندہ: "اور تحفہ؟" میں نے کہا: ہاں تحفہ قبول کر لیتا ہے۔" نمایندہ: "اس کی جب قوم سے جنگ ہوتی ہے تو کون جیتتا ہے؟" میں نے کہا: "کبھی وہ اور کبھی قوم۔" اس گفتگو کے بعد نمایندہ اور اہلِ عمان مسلمان ہو گئے۔ پھر نمایندہ نے کہا: بخدا اگر تمھاری سب باتیں سچی ہیں تو آج رات اُس کا انتقال ہو گیا۔" ..... کچھ ہی دن گذرے تھے کہ ایک سوار نے اونٹ بٹھایا اور عمرو بن عاص کو پوچھنے لگا۔ میں گھبرایا ہوا اس کے پاس گیا۔ اس نے ایک خط دیا جس کا عُنوان تھا: خلیفہ رسول اللہ ابو بکر کی طرف سے عمرو بن عاص کے نام۔ خط لے کر میں کمرہ میں گیا اور مُہر توڑ کر دیکھا تو لکھا تھا:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ ابو بکر خلیفۂ رسول اللہ کی طرف سے عمرو بن عاص کو سلام علیک، واضح ہو کہ اللہ عزّ وجل نے اپنے نبی کو جب چاہا مبعوث کیا، اور جتنا چاہا زندہ رکھا، اور جب چاہا اٹھا لیا۔ اس نے اپنی سچی کتاب میں فرمایا ہے: (اے نبی) تم مرو گے اور وہ سب بھی مریں گے۔

(اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ - قرآن) (مدینہ کے) مسلمانوں نے اس قوم کی قیادت میرے ارادہ اور خواہش کے علی الرغم میرے سپرد کردی ہے۔ میں خدا سے مدد اور توفیق کا طالب ہوں۔ جب میرا خط پہنچے تو جس رسی (شتربند) کو رسول اللہ نے باندھا ہو اس کو ہرگز مت کھولنا اور جس کو انھوں نے کھولا ہو اسے ہرگز مت باندھنا، والسلام (یعنی رسول اللہ کے حسب ہدایت زکاۃ کے اونٹ وصول کرنا)۔" تاریخ دمشق، مائکروفلم ۱۶ (ماخوذ از مخطوط جزء ۱۳، کتب خانہ ظاہریہ دمشق) معہد احیاء المخطوطات العربیۃ جامعۃ دول العربیۃ، قاہرہ۔

مذکورہ بالا سیاق سباق کے انوکھے پن کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ مشہور و مستند تاریخوں میں اس کا کوئی ذکر نہیں، اس کے علاوہ اور اسباب بھی ہیں۔ مثلاً اس میں اُس مراسلہ کا کوئی ذکر نہیں جو رسول اللہ نے عمان کے دو حکمراں بھائیوں جیفر اور عبّاد کو عمرو کے ہاتھ بھیجا تھا، مثلاً اس میں ہے کہ اہل عُمان مسلمان ہو گئے، تاریخ کہتی ہے کہ اہل عُمان دو طبقوں پر مشتمل تھے، ایک فارسی جو شہروں میں تجارت کرتے اور وہاں چھائے ہوئے تھے، اور دوسرے ازدی وغیرازدی عرب جو باقی عمان میں پھیلے ہوئے تھے۔ مسلمان صرف عرب ہوئے، فارسیوں نے جزیہ دینے پر اکتفا کیا، مثلاً اس میں ہے کہ اہل عمان کے اسلام کے بعد "نمایندہ" نے کہا کہ اگر تمھاری باتیں سچی ہیں تو نبی کا آج رات انتقال ہو گیا، عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کے فوراً ہی بعد "نمایندہ" نے یہ پیش گوئی کی جو صحیح نکلی، تاریخ کی شہادت اس کے خلاف ہے۔ عمرو ۸ھ کے آخر میں عمان کے والی (محصّل زکاۃ اور صلح و جنگ کے متولی) مقرر ہوئے اور رسول اللہ کا انتقال صفر یا ربیع الاول ۱۱ھ میں ہوا، یعنی ان کے عمان پہنچنے کے کم از کم ایک سال بعد، عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہنچنے کے چند ہی دن بعد انتقال ہو گیا بہت ممکن ہے سیاق سباق کا بیشتر حصہ صحیح ہو اور جو باتیں ہم کو تاریخ سے غیر مربوط نظر آتی ہیں ان کی وجہ روایت کا نقص اور فروگذاشت ہو، یعنی راوی کچھ ضروری باتیں بیان کرنا

بھول گئے ہوں اور کچھ باتیں بے ناپے تولے کر گئے ہوں۔ اب سنئے ہمارے مورخوں نے عمرو کے تقرر کا حال کس طرح بیان کیا ہے :-

واقدی - طبری ۳/ ۱۳۹ (پہلا اڈیشن مصر) :- ۸ھ میں رسول اللہ نے عمرو بن عاص کو جیفر اور عمرو (عبّاد کی جگہ جو زیادہ مشہور ہے) جلندی ازدی کے دو۲ بیٹوں کے پاس (جو عمان کے حاکم تھے) محصل زکاۃ بنا کر بھیجا، دونوں نے عمرو کو زکاۃ وصول کرنے دی۔ مالدار عُمانیوں سے عمرو زکاۃ لیتے اور غریب عُمانیوں میں تقسیم کر دیتے، وہاں کے فارسیوں سے انھوں نے جزیہ وصول کیا، یہ فارسی شہروں میں رہتے تھے اور عرب شہروں کے آس پاس آباد تھے

فتوح البلدان، بلاذری (اڈیشن ۱۳۱۸ھ مصر) ص۸۳ :- عمان پر قبائل ازد کا غلبہ تھا، ان کے علاوہ صحراؤں میں بہت سے بدو قبیلے بھی آباد تھے - ۸ھ میں رسول اللہ نے ابوزید انصاری (جو ان صحابہ میں تھے جنہوں نے رسول اللہ کے عہد میں قرآن جمع کیا تھا) اور عمرو بن عاص کے ہاتھ عُبید اور جیفر جلندی کے دو بیٹوں کے پاس مراسلہ بھیجا جس میں انھیں اسلام لانے کی دعوت دی تھی - رسول اللہ نے ان سے فرما دیا تھا : اگر اہلِ عمان کلمۂ شہادت پڑھیں اور اللہ و رسول کی اطاعت کا دم بھریں، تو عمرو محصلِ زکاۃ اور متولیِ صلح و جنگ ہوں گے اور ابوزید امام نماز، اسلام کے مُبلّغ اور تعلیم قرآن کے انچارج، جب ابوزید انصاری اور عمرو بن عاص عمان پہنچے تو عُبید اور جیفر عُمان کے ساحلی شہر صُحار میں تھے - ابوزید اور عمرو رسول اللہ کا مراسلہ لے کر ان کے پاس گئے - وہ دونوں اسلام لے آئے، اور جو عرب وہاں تھے ان کو اسلام کی دعوت دی، وہ بھی مسلمان ہو گئے - ابوزید اور عمرو رسول اللہ کی وفات تک عُمان میں رہے اور ایک خبر یہ ہے کہ ابوزید وفاتِ رسول سے پہلے لوٹ آئے تھے -

محاذِ عراق

محاذِ عراق سے متعلق ابوبکر صدیق کے خطوط کے دو۲ بنیادی ماخذ ہیں تاریخ طبری (جو تھی

صدی ہجری) اور فتوح الشام ازدی بصری (تیسری صدی ہجری) - اس سلسلہ میں طبری نے جو خطوط اور سیاق سباق پیش کیا ہے وہ بیشتر سیف بن عمر کی روایت پر مبنی ہے، اور فتوح الشام کے مصنف نے جو خطوط پیش کئے ہیں وہ دوسرے شیوخِ روایت سے ماخوذ ہیں - اس لئے طبری اور فتوح الشام میں بیان کردہ خطوط ایک دوسرے سے کیا باعتبار مضمون اور کیا باعتبار سیاق و سباق مختلف ہو گئے ہیں، اگرچہ اس اختلاف کو تقابلی مطالعہ اور تفسیر و تعبیر کی مدد سے دور یا کم کیا جا سکتا ہے - اس کے علاوہ طبری میں سیف کے بیانات کنٹرہونیٹ اور تقدیم و تاخیر کے ساتھ بیان ہوئے ہیں جس سے واقعات کہیں مبہم اور کہیں بے ربط ہو گئے ہیں - اس نقص کو کسی حد تک الکتفار نے دور کر دیا ہے

۲۶ - خالد بن ولید کے نام

مقدمہ :- جب خالد یمامہ فتح کر چکے تو[1] ابو بکر صدیق نے ان کو لکھا :-

"میں تم کو جنگ عراق کا سپہ سالار مقرر کرتا ہوں ان لوگوں کی ایک فوج مرتب کرو جو اسلام پر قائم ہیں - یمامہ سے عراق تک تمھارے راستہ میں قبائل تمیم، قیس، بکر بن وائل اور عبد القیس کے جو مرتد آئیں ان سے جنگ کرو - ان سے فارغ ہو کر فارس (عراق) کی طرف پیش قدمی کرو اور اللہ عزوجل سے فتح و کامرانی کی دعا مانگو - عراق میں داخل ہو کر سب سے پہلے فرجِ ہند (بندرگاہ اُبُلّہ)[2] کو فتح کرو - فارسیوں اور ان اقوام کے ساتھ جو فارسی حکومت کی رعایا ہوں، حسنِ سلوک سے پیش آؤ (تاکہ وہ اسلام لے آئیں یا اس کے خیر خواہ ہو جائیں) - تم سے کوئی ظلم ہو تو مظلوم کو خود سے انصاف کا موقع دو - تم "خیر امت" ہو لوگوں کی رہنمائی کے لئے بھیجے گئے

---

[1] سنہ ۱۱ھ کے آخر یا سنہ ۱۲ھ کے شروع میں [2] دیکھئے نقشہ

ہو۔ ہم خدا سے ملتجی ہیں کہ جن لوگوں کو ہماری برادری میں داخل کرے، ان کو اسلام کا بہترین پیرو بنائے۔ اگر تم کو خدا کی عنایت سے اُبلہ میں فتح نصیب ہو تو عراق (یعنی بالائی عراق) کا رُخ کرو اور عِیاض (بن غَنْم) سے مل جاؤ۔" شعبی اور ہشام بن عروہ۔ الکتفار صنہ ۳۵۔

۲۷- اِس خط کی دوسری شکل :-

مقدمہ :- جب خالد یمامہ کی مہم سے فارغ ہوئے تو ابوبکر صدیق نے ان کو لکھا:
"عراق کی طرف پیش قدمی کرو اور اس کے حدود میں گھس جاؤ۔ سب سے پہلے فرجِ ہند (اُبُلّہ) کی فتح پر ہمت مبذول کرو۔ اہلِ فارس اور ان اقوام کی جو ان کے ملک میں ہوں تالیفِ قلب کرو۔" سیف بن عمر۔ طبری ۲/۴

۲۸- خط کی تیسری شکل :-

اس کے راوی اول سے آخر تک وہی ہیں جو رقم ۲۷ کے ہیں، پھر بھی دونوں خطوں کے مضمون میں بیّن فرق ہے اس بات کا غالب قرینہ ہے کہ الگ الگ بیان کئے ہوئے یہ دونوں خط ایک ہی مراسلہ کے حصے ہوں:

"خدا نے یمامہ میں تم کو فتح عطا کی، اب عراق (بالائی عراق) کی طرف بڑھو حتیٰ کہ عِیاض (بن غَنْم) سے مل جاؤ۔" سیف بن عمر۔ طبری ۴/۴۔

۲۹- عِیاض بن غَنْم کے نام

اس مراسلہ کا سیاق و سباق یہ ہے کہ جب ابوبکر صدیق نے خالد کو یمامہ سے عراق جانے کا حکم بھیجا تو اس کے ساتھ ہی دوسرا فرمان صحابی عِیاض بن غنم کو ارسال کیا۔ عِیاض اس وقت نِباج اور حجاز کے درمیان تھے، کس قرینہ سے یہ ہمیں نہیں معلوم، شاید کسی مہم پر بھیجے

گئے ہوں۔ ان کو حکم دیا گیا کہ مغرب کا رُخ کرو اور بادیۂ شام میں مُصَیَّخ کی عرب عیسائی بستیوں کو فتح کر کے شمال مشرق کی طرف بڑھو اور بالائی عراق کے وہ قصبے اور چھاؤنیاں جو عربی۔عراقی سرحد پر واقع ہیں فتح کرتے ہوئے حیرہ کا قصد کرو۔ دوسری طرف خالد کو ہدایت تھی کہ زیریں عراق کے سرحدی علاقے فتح کرتے ہوئے حیرہ[1] کی طرف بڑھیں خلیفہ نے یہ تصریح بھی کی تھی کہ دونوں میں سے جو سالار پہلے حیرہ پہنچ جائے گا وہی وہاں کا والی مقرر ہوگا۔ اسکیم یہ تھی کہ اس طرح عربی۔عراقی سرحد کے دونوں جانب واقع ہونے والے دیہاتوں کو رام کر کے اور وہاں کے فوجی نقطوں پر قبضہ کر کے دوسرا قدم مدائن (پایۂ تخت کسریٰ، وسط عراق) کی فتح کے لئے اٹھایا جائے اور یہ مہم اُس سالار کے سپرد کی جائے جو حیرہ پہنچنے کی دوڑ میں ناکام رہے۔

"(اپنی فوج کے ساتھ) مُصَیَّخ جاؤ، اور سب سے پہلے اس کی فتح پر توجہ مرکوز کرو اس کے بعد بالائی عراق میں داخل ہو (اور وہاں کے دیہاتوں اور فوجی نقطوں کو زیرِ نگیں کرتے زیریں عراق کی طرف بڑھو) حتیٰ کہ خالد سے مل جاؤ۔ تم دونوں کی فوج کے جو مسلمان گھر لوٹنا چاہیں ان کو اجازت دے دو اور جو شخص شریکِ جنگ ہونا پسند نہ کرے (وطن لوٹنے کی لگن میں) اس سے فوجی خدمت نہ لو۔" سیف بن عمر۔ طبری۔ ۴/۴

۳۰۔ اس خط کی دوسری شکل:۔

"مُصَیَّخ کی طرف پیش قدمی کرو۔ مُصَیَّخ تک تمہارے راستہ میں جو مسلمان قبیلے آئیں ان کو فوج میں بھرتی کر کے سب سے پہلے ان لوگوں سے لڑو جو اسلام

---

[1] عربی۔عراقی سرحد کے تقریباً وسط، فرات کے مغرب اور نجف سے چند میل جنوب مشرق میں لخمی عرب۔ عیسائی بادشاہوں کا یہ شہرۂ آفاق پایۂ تخت واقع تھا۔ ہجرت سے کوئی بیس برس پہلے کردی حکومت نے حیرہ اور اس کے ماتحت علاقہ (جو فرات کی مغربی ترائی میں تھا) اپنے تصرف میں لے لیا تھا وہاں فارسی گورنر رہتا تھا، مدائن جانے والی شاہراہ حیرہ ہو کر گذرتی تھی، اور اس کے آس پاس فوجی چوکیاں تھیں۔ معجم البلدان یاقوت پہلا اڈیشن ۳/۳۷۶، وانسائیکلوپیڈیا آف اسلام ذکر حیرہ ۲/۳۱۴۔

سے منحرف ہوں - ان سے فارغ ہو کر بالائی عراق میں داخل ہو اور وہاں سے (زیریں عراق کی طرف) فتوحات کرتے خالد سے مل جاؤ۔" الکفار صفحہ ۳

۳۱- خالد بن ولید اور عِیاض بن غُنم کے نام

"جو لوگ اہلِ ردہ سے لڑے ہوں اور جو رسول اللہ کی وفات کے بعد اسلام پر قایم رہے ہوں، ان سب کو شریکِ جنگ ہونے کی دعوت دو۔ میرے اگلے فیصلہ تک کوئی شخص جو مرتد رہ چکا ہو ہرگز لڑائی میں شریک نہ ہو۔" سیف بن عمر - طبری ۴/۴۔

۳۲- خالد بن ولید اور عِیاض بن غُنم کے نام

"خدا سے مدد اور فتح کی دعا مانگو اور اسی سے ڈرو - آخرت کی کامرانی کو دنیا کی کامیابی پر ترجیح دو - خدا کے فرمان بردار رہوگے تو وہ دنیا اور آخرت دونوں میں بامراد رکھے گا - دنیا کو آخرت پر ترجیح نہ دو ورنہ دنیا تمھیں زچ کردے گی - خدا کے نافرمان ہوگے تو وہ دنیا اور آخرت دونوں کی کامیابی سے محروم کر دے گا - کس قدر حقیر ہو جاتے ہیں بندے خدا کی نظر میں جب اس کی نافرمانی کرتے ہیں!" الکفار صفحہ ۳۵

۳۳- خالد بن ولید اور عِیاض بن غُنم کے نام

سیف بن عمر اور ان کے راوی اس خط کو اس مراسلہ کا تتمہ قرار دیتے ہیں جو خلیفہ نے خالد کو زیریں عراق اور عیاض کو بالائی عراق سے حیرہ پہنچنے کے لئے تحریر کیا تھا اور جس میں یہ تصریح بھی تھی کہ دونوں میں سے جو بھی پہلے پہنچ جائے گا وہاں کا گورنر بنا دیا جائے گا۔ یہ حصہ

راویوں نے صیغۂ غائب میں بیان کیا ہے اور تتمہ والا حصہ صیغۂ مخاطب میں - یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ مراسلہ زیر بحث کی اسناد میں کچھ راوی نئے ہیں یعنی اس کی اور خطوط رقم ۲۸ اور ۳۰ کی اسناد بالکل ایک نہیں ہے، اگر بالکل ایک ہوتی تو خط زیر بحث کو رقم ۲۸ اور ۳۰ کا تتمہ بھی قرار دیا جا سکتا تھا -

تتمہ کا مضمون :- جب تم دونوں حیرہ میں جا ملو اور اس سے پہلے تم فارسی عسکری چوکیوں کو صاف کر چکے ہو گے اور مسلمانوں پر پشتی حملہ کی طرف سے بے خوف ہو چکے ہو گے، اس وقت تم میں سے ایک سالار مسلمانوں کی رسد کا انتظام کرنے اور حیرہ کے جانشین گورنر کی تقویت کے لئے (؟) پیچھے رہ جائے اور دوسرا خدا اور تمھارے دشمن فارسیوں کے دارالسلطنت اور ان کی قوت و شوکت کے مرکز مدائن پر یورش کر دے"

سیف بن عمر - طبری ۴/ ۵ -

۳۴ - خالد بن ولید اور اُن کی فوج کے نام

جس وقت ردّہ کی آندھی چلی یعنی ۱۱ھ کے ربع اول میں تو اس کے لگ بھگ عربی عراقی سرحد پر بسنے والے قبائل ربیعہ کے ایک سردار نے جس کا نام مُثنّٰی بن حارثہ تھا، عراق کی شاداب سرزمین پر ترکتازی شروع کر دی تھی - اس ترکتازی کے اسباب خوش قسمتی سے ہمیں معلوم ہیں - ایران کے مشہور بادشاہ نوشیروان عادل کے زمانہ میں بحر قلزم کی ساحلی پٹی تہامہ میں شدید قحط پڑا جس سے مجبور ہو کر وہاں کے قبائل ربیعہ جلاوطن ہو گئے اور جزیرہ یمامہ[۱] میں آکر اُترے - اس علاقہ پر فارسی تسلط تھا - نوشیروان نے ان کے لیڈروں کا ایک وفد دریافت حال کے لئے طلب کیا - وفد نے کہا ہم قحط سے مجبور ہو کر آپ کے سرسبز علاقہ میں آئے

---

[۱] شاید اس سے مراد بحرین کا کوئی جزیرہ ہے، ہمارے جغرافیہ نویسوں نے جزیرہ یمامہ کا کوئی ذکر نہیں کیا -

ہیں اور یہاں رہنا چاہتے ہیں۔ نوشیرواں نے وعدہ لے کر کہ ان کے ہم قوم پر امن اور باضابطہ زندگی بسر کریں گے رہنے کی اجازت دے دی۔ ربیعہ کی شاخیں سارے عربی۔ عراقی سرحد پر پھیل گئیں اور عرصہ تک ان کو فارسی حکومت سے کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ یزدجرد کی تاجپوشی کے بعد[1] فارسی فوجی ڈسپلن خراب ہوگیا اور فارسی فوجی حکام قبائل ربیعہ پر دست درازی کرنے لگے۔ ان کے ظلم کا جواب دینے ربیعہ کی شاخ شیبان کا ایک سردار جس کا نام مثنیٰ بن حارثہ تھا کھڑا ہوا۔ اس کی خاندانی بستیاں حیرہ کے قریب تھیں۔ مثنیٰ سرحد پار کر کے زیریں عراق کے گاؤں پر چھاپے مارتے اور مویشی اور غلہ لوٹ لے جاتے۔ ان کی سرگرمیوں کی خبر حضرت ابوبکر کو ہوئی جو اس وقت اہل ردہ کی سرکوبی میں مصروف تھے، تو وہ محظوظ ہوئے انھوں نے مثنیٰ کے حالات اور حسب نسب معلوم کر کے ایک جھنڈا اور مراسلہ بھیجا جس میں مثنیٰ کی حوصلہ افزائی کی تھی اور فارسیوں کے خلاف مہم جاری رکھنے کی تلقین۔ (فتوح اعثم کوفی بمبئی ۱۸۸۸ء ص ۱۶) اور ایک روایت یہ ہے کہ مثنیٰ خود مدینہ آئے اور خلیفہ سے کہا: مجھے میری قوم کا سالار بنا دیجئے، وہ اسلام لے آئے ہیں، میں ان کو لے کر فارسیوں سے لڑوں گا، اور اپنے قریب کے فارسی علاقہ کو آپ کی طرف سے فتح کرلوں گا"۔۔۔۔ (فتوح الشام ازدی بصری، اڈیٹر ڈبلو، این، لیس ۱۸۵۴ء کلکتہ ص ۵۹) خلیفہ نے باضابطہ طور پر مثنیٰ کو ان کی قوم کا سالار مقرر کر دیا اب ان کو خلافت کی سند اور پشت پناہی حاصل ہوگئی، اس سے ایک طرف تو ان کا حوصلہ بہت بڑھ گیا اور دوسری طرف ان کا سارا قبیلہ ان کے زیر فرمان آگیا۔ وہ پہلے سے بڑے پیمانہ پر عراق کے دیہاتوں اور بازاروں پر غارتگری کرنے لگے۔ قریب ایک سال تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ افسوس ہے ہمارے مورخوں نے یہ نہیں بتایا کہ یہ سال کب سے شروع ہوا اور کب ختم ہوگیا، گمان غالب ہے کہ سنہ ۱۱ھ کے نصف آخر میں کسی وقت ختم ہوا ہوگا۔ مثنیٰ کی طاقت اور وسائل بڑھ گئے اور انھوں نے اپنے چچازاد بھائی سُوَید بن قُطبہ کو سواروں کے چند دستے دئے اور

[1] یہ تصریح ناسخ التواریخ کے مولف نے کی ہے۔ ۲/کتاب دوم/۱۲۸

شط العرب یعنی دجلہ ۔ فرات کے ڈھائی تین سو میل لمبے ڈیلٹا کے دیہاتوں اور چھاؤنیوں پر غارت گری کرنے بھیجا ۔ اب تک مثنیٰ کی ٹکر سرحد عراق کے رئیسوں اور فوجی نقطوں کے افسروں سے تھی ، اس نئے محاذ کے کھلنے سے ڈیلٹا کے اہم آبی اور بری راستوں اور اس عظیم بندرگاہ پر خطرہ منڈلانے لگا جہاں چین وہند ۔ عراق ۔ فارس اور شام کا سامان لادا اور اتارا جاتا تھا ، یہ اُبُلّہ نامی بندرگاہ تھا جو ڈیلٹا کی بر عرب پر واقع ہونے والی ایک خلیج پر آباد تھا ۔ مرکزی حکومت کو مداخلت کرنا پڑی ، اور فارسی فوجیں مرکز کے مامور کردہ سالاروں کی کمان میں عربوں کی گوشمالی کے لئے مامور کی گئیں ۔ مثنیٰ اور سُوَید دونوں کمزور پڑ گئے اور ان کی جارحانہ سرگرمیاں سکڑ گئیں ۔ مثنیٰ نے خلیفہ کو حالات سے مطلع کیا اور رسد طلب کی ۔ اس وقت خالد، مسیلمہ کا قصہ پاک کر یمامہ میں براجمان تھے ، یمامہ کی فتح مورخین عراق (مدائنی وغیرہ) ۱۱ھ (غالباً آخر سال) بتاتے ہیں اور ابن اسحاق وغیرہ ربیع الاول ۱۲ھ میں ۔ (دیکھئے طبری ۳/۲۶۱ ، تاریخ یعقوبی (اڈیٹر ہوتسما لیدن) ۲/۱۴۶ ، الکتفاء مخطوط دار الکتب قاہرہ ص۲۶۲ فتوح البلدان بلاذری ص۹۷) حضرت ابو بکر نے مراسلۂ ذیل لکھا اور خالد کو عراق کی مہم کا سالار اعلیٰ مقرر کر کے مثنیٰ کی پشت پناہی کے لئے بھیجا ۔ مورخ عمر بن شبہ (طبری ۴/۳) کی رائے ہے کہ خالد کو محاذِ عراق پر بھیجنے کی کارروائی محرم ۱۲ھ میں عمل میں آئی ، اس حساب سے فتح یمامہ یقیناً ۱۱ھ کے آخر میں ہوئی ہوگی ۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ عبد اللہ ابو بکر خلیفۂ رسول اللہ کی طرف سے خالد بن ولید اور ان کے ساتھ جو مہاجر ، انصار اور تابعین ہیں سب کو سلام علیک ۔ میں اس اللہ کا سپاس گذار ہوں جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ۔ تعریف ہے اس خدا کی جس نے اپنا وعدہ پورا کیا ، جس نے اپنے دین کی مدد کی ، جس نے اپنے ہوا خواہوں کو قوت وعزت عطا کی ، جس نے اپنے دشمن کو ذلیل کیا ، اور جو اکیلا متحدہ پارٹیوں پر غالب آگیا ۔

بلا شبہ اُس خدا نے جس کے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں، اُن لوگوں سے وعدہ کیا ہے جو تم میں سے ایمان لائے اور جنہوں نے عملِ صالح کئے کہ اُن کو زمین کا وارث بنا دے گا، جس طرح اس نے اُن سے پہلے مومنوں اور نیکو کاروں کو وارث بنایا تھا۔ اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اس دین کو ان کی (فلاح و بہبود) کے لئے مستحکم بنا دے گا جسے اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے، اور یہ کہ ان کو خوف و ہراس میں رہنے کے بعد امن و عافیت سے بہرہ ور کرے گا، یہ مومن میری پرستش کرتے ہیں اور میری وفاداری اور اطاعت میں کسی اور کو بالکل شریک نہیں کرتے۔ اس وعدہ کے بعد بھی جو لوگ کفر کریں تو وہ فاسق ہیں (وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ آمَنُوا مِنْکُمْ وعملوا الصالحات لیستخلفنّھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم ولیمکننّ لھم دینھم الذی ارتضیٰ لھم، ولیبدلنّھم من بعد خوفھم امنا، یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا، ومن کفر بعد ذلک فاولئک ھم الفاسقون) یہ ایسا وعدہ ہے جو جھوٹا ہونے والا نہیں، اور نہ اس میں شک کی گنجائش ہے۔ خدا نے مومنین پر جہاد فرض کیا ہے، چنانچہ وہ صاحبِ عزت ہستی فرماتا ہے: تم پر جنگ و قتال لازم کیا گیا اور وہ تمہیں ناپسند ہے، اس بات کا پورا احتمال ہے کہ تمھیں کوئی بات پسند نہ ہو، پر حقیقت میں وہ تمھارے لئے مفید ہو جیسا کہ اس بات کا احتمال ہے کہ تمھیں کوئی بات پسند ہو لیکن حقیقت میں وہ تمھارے لئے مضر ہو۔ ہونے والے فائدہ یا نقصان کا علم بس اللہ کو ہے، تمھیں نہیں۔ (کتب علیکم القتال وھو کرہ لکم، وعسیٰ ان تکرھوا شیئًا وھو خیر لکم، وعسیٰ ان تحبوا شیئًا وھو شر لکم، واللہ یعلم وانتم لا تعلمون۔ قرآن) پس خدا سے وہ وعدہ پورا کرنے کی درخواست کرو جو اس نے

تم سے کیا ہے اور جو فرض تم پر عائد کیا ہے اس کو انجام دے کر اس کی اطاعت کرو، چاہے ایسا کرنے سے کتنی ہی پریشانی اُٹھانی پڑے اور کیسے ہی مصائب جھیلنا پڑیں، اور گھر بار سے تھیں کتنا ہی دور ہونا پڑے، اور کتنا ہی جان و مال کی قربانی دینا پڑے۔ یہ سب خدا کے ثوابِ عظیم کے مقابلہ میں معمولی باتیں ہیں۔ ہم کو صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے کہ اللہ شہیدوں کو قیامت کے دن جب اٹھائے گا تو وہ تلواریں کھینچے ہوں گے، وہ خدا سے جو آرزو بھی کریں گے خدا پوری کرے گا، اور اُن کی سب مرادیں بر آئیں گی، اور وہ وہ نعمتیں ان کو ملیں گی، جن کا انھوں نے تصور کبھی نہ کیا ہوگا۔ ایک شہید جنت میں داخل ہو کر اس سے بہتر کیا تمنا کر سکتا ہے کہ اس کو خدا دنیا میں پھر لوٹا دے، تاکہ وہ اس کی بے انتہا عنایتوں کا اپنی حُسنِ سیرت سے کچھ حق ادا کر سکے۔ خدا آپ پر رحم کرے، راہِ خدا میں جہاد کرنے نکل کھڑے ہو جیئے، خواہ نہتے ہو یا مسلح اور اپنے مال و جان سے خدا کے راستہ میں جہاد کرو، اس میں آپ کے لئے خیر و برکت ہے اگر آپ کو خیر و برکت کا صحیح تصور ہو (تو اس حقیقت کو سمجھ لیں گے) میں نے خالد بن ولید کو عراق جانے کا حکم دیا ہے جس کو وہ اس وقت تک نہیں چھوڑیں گے جب تک میرا دوسرا حکم نہ صادر ہو۔ ان کے ساتھ آپ لوگ چل دیجئے، جانے سے بالکل مت کسمسائیے، خلوص سے جہاد کرنے والے اور کارِ خیر کو شوق سے انجام دینے والے کو خدا اجرِ عظیم عطا کرتا ہے۔ جب آپ عراق پہنچیں تو وہاں ٹھہریئے یہاں تک کہ میرا اگلا حکم آئے۔ خدا دنیا اور آخرت کے اہم امور کو ہماری اور آپ کی طرف سے ٹھکانے لگائے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ۔"

فتوح الشام ازدی بصری ص۲۶۔

۳۵۔ مُذعور بن عدی کے نام

ازدی نے فتوح الشام میں خط کا افتتاح ان چند لفظوں میں کیا ہے: مذعور بن عدیِ، بنو عجل کے سردار تھے، مثنیٰ کے زمانہ میں فارسیوں سے لڑتے نکلے اور ابو بکرؓ کو خط لکھا (جو ذیل میں پڑھیئے)۔ فتوح الشام ازدی میں مثنیٰ کا خلیفہ کے نام ایک مراسلہ وارد ہوا ہے جس میں مثنیٰ نے شکایت کی ہے کہ مذعور جو میری قوم کے آدمی ہیں ایک چھوٹی سی جماعت لے کر میرے حریف بن بیٹھے ہیں اور میری مخالفت کرتے ہیں (ص۵۳)۔ اکتفار نے نئے اکتشاف کئے ہیں جو سیف بن عمر سے ماخوذ ہیں اور جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عربی۔ عراقی سرحد پر تنہا مثنیٰ ہی نہیں بلکہ تین مزید عربی سردار فارسی دیہاتوں اور مسلح نقطوں پر ترکتاز کیا کرتے تھے۔ ان کے نام ہیں: مذعور بن عدی، حرملہ بن مُریطہ اور سلمی بن قین، آخر الذکر دونوں مہاجر صحابی تھے، مثنیٰ اور مذعور اپنی قوم کے ساتھ رسول اللہؐ سے ملاقات کر چکے تھے۔ یہ چاروں ابو بکر صدیقؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے (غالباً ۱۱ھ کے آخری اور ۱۲ھ کے ابتدائی ایام میں) حرملہ اور سلمی نے کہا: ہم لوگ جو بنو تمیم اور بنو بجر کے قبیلوں سے تعلق رکھتے ہیں، فارسیوں سے لڑنے کے عادی ہیں ان پر ایسی چوٹیں لگائی ہیں کہ انھوں نے اپنے بچاؤ کے لئے خندقیں کھودی ہیں، دریا اور نہروں کا پانی چھوڑ کر دلدل کر دی ہے اور ہمارے مقابلہ کے لئے محلوں کو مسلح کر لیا ہے، ہمیں ان سے لڑنے کی اجازت دیجئے۔ ابو بکر صدیقؓ نے اجازت دی اور ان میں سے ہر ایک کو اپنے اپنے متبعین کا سالار بنا دیا اور اس بات کی سرکاری سند عطا کی کہ جو جتنا فارسی علاقہ فتح کرے گا اس کا حاکم تسلیم کر لیا جائے گا۔ سیف بن عمر کہتے ہیں کہ حرملہ اور سلمی سب سے پہلے مسلمان عرب تھے جو فارسی سرزمین پر جہاد کے لئے نکلے تھے۔ یہ چاروں قائد مدینہ سے واپس ہوئے اور زیریں وسطی عربی۔ عراقی سرحد پر الگ الگ مورچے بنا کر فارسی دیہاتوں اور چھاؤنیوں پر حملے کرنے لگے۔ مورچوں اور اُن ایرانی منزلوں کے نام بھی اکتفار میں

مذکور ہیں جو ان تمیمی اور بکری سرداروں سے رزم آرا ہوئے۔ جیسا کہ ابھی آپ نے پڑھا اکتفا کا بیان مذعور کے آزاد اور خود مختار سالار ہونے کی خبر دیتا ہے، نیز اس بات کی کہ وہ خلیفہ سے ملاقات کر چکے تھے اور ان کو فارسیوں کے خلاف مورچہ بنانے کی دربارِ خلافت سے باضابطہ اجازت مل چکی تھی۔ اس کے برخلاف فتوح الشام میں بیان کردہ مثنیٰ کے شکایتی خط سے معلوم ہوتا ہے کہ مذعور خلیفہ کے لئے اجنبی شخصیت ہیں اور یہی نتیجہ خود مذعور کی اس عرضداشت سے بھی نکلتا ہے:

"میں بنو عجل کا جو بڑے شہ سوار اور جنگجو عرب ہیں، ایک فرد ہوں۔ میرے خاندان کے بہادر میرے ساتھ ہیں، ان میں کا ہر فرد دوسرے سو آدمیوں پر بھاری ہے۔ میں مرد کارزار ہوں، فارسی علاقہ کے جغرافیہ سے واقف ہوں۔ مجھے سواد (یعنی عراق کے مزروعہ اور سرسبز علاقہ) کا والی بنا دیجئے، میں آپ کی طرف سے اس کو فتح کرلوں گا۔" (فتوح الشام ازدی بصری ص۵۳۔)

خلیفہ کا جواب :۔

"تمہارا خط موصول ہوا، تمہاری لکھی باتیں میں نے سمجھیں۔ تم ویسے ہی ہو جیسا تم نے اپنے بارہ میں لکھا ہے اور تمہارے خاندان میں بھی بڑی خوبیاں ہیں۔ میری رائے ہے کہ تم خالد بن ولید سے جا ملو اور جب تک وہ عراق میں رہیں ان کے ساتھ عراق میں رہو اور وہ جب دوسرے محاذ پر جائیں تو تم بھی ان کے ہمراہ چلے جاؤ۔"

اس کے ساتھ ہی ابوبکر صدیق نے مثنیٰ کو ان کے شکایتی مراسلہ کا یہ جواب لکھا:۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ واضح ہو کہ تمہارے ہم قوم عجلی نے مجھے خط لکھا تھا جس میں کچھ درخواستیں کی تھیں۔ میں نے ان کو لکھ دیا ہے کہ میرے اگلے فیصلہ تک خالد (بن ولید) کی فوج میں رہیں۔ میں تم کو بھی تاکید کرتا ہوں کہ جب تک خالد عراق میں ہیں تم کہیں اور نہ جانا۔ جب وہ دوسرے محاذ پر چلے جائیں تو تم پھر اس جگہ ڈٹ جانا جہاں پہلے تھے (؟) تم ہر ترقی کے اہل اور ہر عنایت کے مستحق ہو، والسلام علیک ورحمۃ اللہ۔" (فتوح الشام ازدی بصری ص۵۳)

(باقی آئندہ)

ابنِ خلدون اور اس کا مقدمہ

از

(جناب ڈاکٹر محمد احمد صاحب صدیقی پروفیسر یونیورسٹی الہ آباد)

(۳)

پھر ابن خلدون خصوصیت کے ساتھ مسئلہ خلافت پر کلام کرتا ہے اس کی رائے ہے کہ عرب کا کسی کا تابع و فرماں بردار بننا بہت دشوار ہے کیوں کہ ان میں سخت مزاجی، عار، عالی ہمتی اور سرداری کی خواہش پائی جاتی ہے اس لئے ان کی خواہشات کا متفق ہونا مشکل ہے ان میں صرف مذہبی رنگ میں حکومت ہوسکتی ہے کیوں کہ وہ لوگ طبیعتِ سلیمہ رکھنے کی وجہ سے حق اور ہدایت کو سب سے جلد قبول کر لیتے ہیں۔ اور حکومت عرب کے نزدیک اسلام میں، خلافت یا امامت ہے یعنی نیابت صاحبِ شرع محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے امورِ دین اور امورِ دنیا دونوں میں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خلافت کے استحقاق کی شرطوں میں مسلمانوں میں اختلاف ہوا جس سے تین بڑے نظریئے پیدا ہوئے۔

(۱) اہلِ سنت کی رائے۔ نصبِ خلافت امت پر واجب ہے۔ خلیفہ انتخاب سے منتخب ہوگا، خود خلیفہ کی ذات کو پانچ چیزوں سے متصف ہونا ضروری ہے۔

(۱) امورِ دینیہ کا عالم ہونا۔ تاکہ ان پر عمل کرے اور اپنے امور ان سے منطبق کرسکے۔

(۲) عادل ہونا۔ کیوں کہ حکومت میں ایسے مناصب ہوتے ہیں جو عدل کے مقتضی ہیں مثلاً منصبِ قضا۔ اور چوں کہ خلیفہ حکومت کا سردار ہوتا ہے اس لئے عدل کی شرط اس میں ضروری ہے۔

(۳) اس کا خود کافی ہونا اس طرح پر کہ اقامتِ حدود (احکام اور سزاؤں کے نافذ کرنے) پر جری (دلیر) اور لڑائیوں میں گھس جانے پر قادر اور واقف کارِ جنگ ہو...

اور عصبیت کو پہچاننے والا اور سیاسی معاملات اور ذمہ داریوں کو جھیلنے پر قدرت رکھتا ہو۔
(۴) حواس اور اعضاء کے نقص اور بے کار ہونے سے محفوظ ہو جیسے جنون اور اندھا
ہونا اور ہاتھ پاؤں کا جاتے رہنا۔

(۵) پانچویں شرط میں اہلِ سنت کا اختلاف ہے اور وہ یہ کہ کیا خلیفہ قریش میں سے ہونا چاہیئے۔ ابن خلدون کی رائے اس میں اہلِ سنت کے موافق ہے، اس کا خیال ہے کہ جب کہ قریش میں عصبیت ہو تو قریش میں سے خلیفہ مقرر کرنا واجب ہے لیکن اگر عصبیت باقی نہ ہو تو پھر نسب قریشی کچھ قیمت نہیں رکھتا۔

(ب) خوارج اور بعض معتزلہ کی رائے۔ ان لوگوں کی رائے ہے کہ نصبِ خلافت واجب نہیں ہے اس لئے کہ خلافت سے مقصود حدودِ الٰہی قایم کرنا اور احکام نافذ کرنا ہے، جب یہ کام لوگوں کے باہمی اتفاق سے ہو جائے تو خلیفہ کی کوئی حاجت نہیں رہ جاتی۔ ابن خلدون نے اس رائے کو رد نہیں کیا۔

(ج) شیعہ کی رائے۔ فرقہ شیعہ کا یہ اعتقاد ہے کہ امامت واجب ہے اور وہ بطریقِ وراثۃ حضرت علی کرم اللہ تعالےٰ وجہہٗ کی اولاد کو حاصل ہوتی ہے۔

پھر ابن خلدون کہتا ہے کہ خود خلافت سلطنت کی جانب منقلب ہو جاتی ہے۔

اُس کے بعد ابن خلدون جبایۃ کا ذکر کرتا ہے "جبایۃ وہ مال ہے جسے گورنمنٹ رعیت سے وصول کرتی ہے۔" وہ کہتا ہے کہ شروع حکومت میں جبایۃ کے حصے کم ہوتے ہیں مجموعہ زیادہ ہوتا ہے اور آخر حکومت میں اس کے برعکس ہوتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ابتدا میں حکومت بدوی طرز کی ہوتی ہے اس لئے ٹیکس کم لگتا ہے۔ بدوی طرز کی حکومت میں تو کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ٹیکس مطلقاً نہیں لگتا۔ اس لئے آبادی بڑھ جاتی ہے اور آبادی بڑھنے سے حصوں کا شمار بڑھ جاتا ہے اس لئے جبایۃ کا مجموعہ کثیر ہو جاتا ہے لیکن جب حکومت میں شہریت کا رنگ آجاتا ہے تو وہاں کے باشندوں کی خواہشات میں زیادتی ہو جاتی ہے اس

وقت اموالِ کثیرہ کی حاجت ہوتی ہے اس لئے حکومت کو جبایۃ کی مقدار بڑھانے اور اس کی وصولی میں سختی کرنے کی ضرورت پڑتی ہے لہذا عام لوگ تعمیرات اور امنگوں میں سُست پڑ جاتے ہیں اس لئے جبایۃ کا مجموعہ کم ہو جاتا ہے تب ارکینِ حکومت اس امر پر مجبور ہوتے ہیں کہ ٹیکسوں کی مقدار زیادہ بڑھائیں اور طرح طرح کے نئے ٹیکس مقرر کریں اور حکومت کمزور اور اطرافِ بعیدہ سے ٹیکس وصول کرنے سے قاصر ہو جاتی ہے تب قسم قسم کے نئے ٹیکس ایجاد کیے جاتے ہیں جن کو تجارت پر اور ان کی ایک مقدارِ معین بازاروں میں قیمتوں پر اور خود مالِ تجارۃ پر لگائے جاتے ہیں جس کے نتیجے میں بازار امیدوں میں خلل پڑ جانے کی وجہ سے سُست پڑ جاتے ہیں اور آبادی کے برباد ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے، یہ امر جبایۃ کے عظیم نقصان کا باعث ہوتا ہے تب گورنمنٹ زراعت اور تجارت کی طرف مجبور ہوتی ہے اور یہ چیز رعایا اور جبایۃ کے لئے مضر ہوتی ہے کیوں کہ حکومت رعایا کے راس المال کے اعتبار سے بہت بڑے راس المال کی مالک ہوتی ہے۔ پھر حکومت کبھی تُجّار سے مالِ کثیر لے لیتی ہے غصب کے طریقہ پر یا تھوڑا ثمن دے کر کیوں کہ اس کے خریدنے میں اس سے جھگڑنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ پھر جب زراعت کے فوائد ..... ریشم یا شہد یا شکر وغیرہ کی شکل میں حاصل ہوتے ہیں تو ان لوگوں کو جو ان چیزوں سے تعلق رکھتے ہیں ان سامانوں کے خریدنے کی تکلیف دیتی ہے اور اس کے ثمن کو قیمت کے مساوی یا اس سے زیادہ ٹھہراتی ہے ..... اور کبھی حالت کی انتہا ہی ہو جاتی ہے کہ سرکاری لوگ غلّوں اور سامان کو ان کے مالکوں سے جو کہ ان کے شہر میں پہنچتے ہیں خریدنے پر آمادہ ہوتے ہیں اور ثمن جتنا چاہتے ہیں مقرر کرتے ہیں اور ان سامانوں کو ان کی ضرورت کے وقت میں رعایا کے ہاتھ اس ثمن سے جو وہ خود مقرر کرتے ہیں بیچ ڈالتے ہیں۔ اور یہ حالت پہلی حالت سے زیادہ سخت، رعیت کو زیادہ تباہ کرنے والی اور ان کے احوال کو زیادہ خراب کرنے والی ہے۔

۵۔ وہ احوال جو اجتماعِ حضری میں پیش آتے ہیں: خصوصاً شہروں اور بڑی عمارتوں میں ۔۔ بے شک بادشاہ شہر میں قیام کی خواہش کرتا ہے آرام و سکون حاصل کرنے

کے لئے اور آسائش کو درست رکھنے کی وجہ سے ۔ پھر کبھی باہمی تعاون کی حاجت اور کارکنوں کی کثرت اس کی مقتضی ہوتی ہے کہ منتظمینِ امورِ سلطنت لوگوں کو شہروں میں بسنے پر آمادہ کریں تاکہ ان شہروں سے وہ قلعوں کا کام لیں جب کہ کوئی ان سے جھگڑا کرے یا کوئی ان پر اچانک جا پہنچے۔" شہر پر غلبہ حاصل کرنا نہایت دشوار ہے، شہر متعدد لشکروں کا قائم مقام ہوتا ہے کیوں کہ اس میں حفاظت کا اور دیواروں کے پیچھے سے جنگ کا موقع ہوتا ہے بغیر اس کے کہ زیادہ فوج کی یا زیادہ اسلحہ کی ضرورت پڑے۔" پھر بڑے شہروں کو منتظمانِ سلطنت بہت سے کاریگروں کو جمع کر کے بناتے ہیں اور انجنیروں اور انجنیری کے آلات سے مدد لیتے ہیں۔ نیز ضروری ہے کہ شہروں کے وضع میں کشادہ اطراف اور زرعی اور تجارتی اور فوجی میدانوں کا لحاظ رکھا جائے اہلِ شہر کی تعداد جس قدر زیادہ ہوگی شہر اسی قدر بڑھیا ہوگا۔

شہروں میں بسنا اس کا مقتضی ہوتا ہے کہ مکانات بنائے جائیں اور باغات لگائے جائیں لیکن عمارتیں زیادہ مفید نہیں ہوتیں۔ اور جب حکومت کمزور ہو جاتی ہے اور شہر پر دشمن کے حملہ کا خوف ہوتا ہے تو عمارتیں اور زمینیں بالکل سستی ہو جاتی ہیں۔ جائداد کے مالک شہر میں جاہ اور عصبیت کے حاجت مند ہوتے ہیں کہ اپنی جائدادوں سے دوسروں کے جبر اور زیادتی کو دفع کریں اور بادشاہ کے لالچ کو اس سے ہٹائے رہیں کہ وہ سخت ٹیکس اس پر نہ لگائے۔ نیز شہر صنعتوں سے ممتاز ہیں۔ تقریباً ہر شہر ایک خاص صنعت کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے۔ پھر آسائش اور عادات کی زیادتی بدوی کو شہروں میں قیام کرنے سے مانع ہیں کیوں کہ بدوی ان اخراجات سے جو بڑی شہریت کے لئے لازم ہیں عاجز ہے۔ پھر کسی شہر پر جتنا زمانہ زیادہ گزرتا ہے اس کی حضارت وسیع ہوتی جاتی ہے اور وہ حکومت جس نے اسے آباد کیا ہے حکومت اور غلبہ میں زیادہ پائدار ہو جاتی ہے یہاں تک کہ جب وہ حکومت ختم ہوتی ہے تو اس کے ساتھ ہی وہ شہر بھی ختم ہو جاتا ہے جس کو اس حکومت نے اپنے لئے بنایا تھا یا جو اس حکومت کی وجہ سے بنا تھا،

ابن خلدون شہروں کی ویرانی کی علت یہ بتاتا ہے کہ ان کے لئے ایک عمر مقرر ہوتی ہے، شہروں

کی ویرانی کی علامات ہیں سے شہروں میں حضارت کی زیادتی اور حاجاتِ کمالیہ کی زیادتی کی ہے جو عادت کے ساتھ ضروریہ بن جاتی ہیں ان کے باشندے اخراجات میں اسراف کے مرتکب ہوتے ہیں حتی کہ اپنی ضروری حاجات سے عاجز ہو جاتے ہیں گرانی پیدا ہو جاتی ہے اور بازار خراب ہو جاتے ہیں تو ٹیکس میں کمی آجاتی ہے اس کے ساتھ ہی یہ ہے کہ شہری زندگی نسل، خلق اور بدن کے لئے مُضر ہے۔

ابن خلدون کی عجیب ترین اور صحیح ترین رایوں میں سے اس کا یہ قول ہے کہ شہر کے باشندے جب بہت بڑھ جاتے ہیں تو ضروری غذا کا نرخ ارزاں ہو جاتا ہے اور کمائی کا نرخ گراں ہو جاتا ہے اور اگر باشندے کم ہوتے ہیں تو اس کے برعکس ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آبادی جب عظیم ہو جاتی ہے تو امورِ کمالیہ کی طلب کثیر ہو جاتی ہے اور موجود اسٹاک حاجت کے لئے ناکافی ہوتا ہے تو راحت و آسائش والے بڑی قیمت ادا کر کے لیتے ہیں اس لئے وہ گراں ہو جاتا ہے اسی طرح کام کرنے والوں کی اُجرت بہت بڑھ جاتی ہے۔ یہ بھی ہے کہ شہروں میں نرخ بادیہ کے نرخ کے اعتبار سے گراں ہوتا ہے۔ کیوں کہ شہروں میں بالخصوص حکومت کے آخر میں طرح طرح کے محصول اور ٹیکس کی زیادتی ہو جاتی ہے۔

۶۔ حضر میں کسب اور معاش کے طریقے۔ ابن خلدون کے نزدیک کسب کی بُنیاد انسانی عمل ہے کیوں کہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ فائدے اور کمائیاں سب کے سب یا ان میں سے زیادہ تر انسانی اعمال کے معاوضے ہیں اور معاش کی صورتیں بہت ہیں مثلاً

(۱) دوسرے کے ہاتھ سے مال لے لینا رواجی قانون پر اقتدار کی وجہ سے۔ اس کا نام جرمانہ یا ٹیکس رکھا جاتا ہے۔

(۲) صحرائی جانور کو کسی ہتھیار سے چیر پھاڑ کر یا اس کو کسی تدبیر سے خشکی یا تری سے پکڑنا۔ اس کا نام شکار رکھا جاتا ہے۔

(۳) پالتو جانور سے اس کی وہ زائد چیزیں جن میں لوگ تصرف کر کے نفع پاتے ہیں الگ کرنا

جیسے دودھ ۔ اون ۔ ریشم اور شہد ۔

(۴) نباتات سے نفع کمانا ۔

(۵) انسانی اعمال سے روزی کمانا وہ صناعۃ ہو یا زراعت ہو یا خدمت ہو ۔ خدمت کا یہ مفہوم ہے کہ ایسے کاموں کو جن کا خود کرنا ضرورت مندوں کو شان کے خلاف معلوم ہوتا ہے دوسروں سے معاوضہ دے کر کرانا ۔ ایسے کاموں کو اُجرت پر انجام دینا خدمت ہے (یہ حالت (خدمت) انسان کی طبعی جواں مردی کے اعتبار سے ناپسند چیز ہے اس لئے کہ دوسروں پر بھروسا کرنا عجز ہے . . . . اور خدمت عجز اور نامردی پر دلالت کرتی ہے اور جواں مردی کے طریقوں میں ان دونوں (عجز و خنث) سے مُنزہ ہونا ضروری ہے) مگر یہ تو آرام طلبی اور آسودگی کا نتیجہ ہے ۔ اسی طرح موہوم دفینوں سے اموال حاصل کرنے کی کوشش کرنی غیر طبیعی امر ہے اور ظاہر یہ ہے کہ جاہ سے مالی فائدہ ہوتا ہے کیوں کہ لوگوں کی عادۃ ہے کہ جاہ والے سے تقرب چاہتے ہیں، اس پر اعتبار کرتے ہیں اور اس سے معاملات کرتے ہیں (خواہ وہ جاہ دینی ہو یا اجتماعی ہو یا تجارتی ہو) اور اس میں شک نہیں کہ بہت کچھ کمائی انھیں کو حاصل ہوتی ہے جو دبّو اور خوشامدی ہوتے ہیں اور اسی وجہ سے ہم ان لوگوں میں جو عالی ہمت اور بلند حوصلہ ہوتے ہیں زیادہ لوگوں کو پاتے ہیں کہ ان کو جاہ کا مقصد نہیں حاصل ہوتا پس وہ اپنی محنتوں سے کمائی پر قناعت کرتے ہیں اور فقر و فاقہ برداشت کرتے ہیں . . . . پھر کاموں کا معاوضہ ضرورت و حاجت کے اعتبار سے متفاوت ہوتا ہے ۔ اگر وہ اعمال آبادی میں ضروری اور عام طور پر کارآمد ہیں تو ان کا معاوضہ بہت زیادہ ہوگا اور ان کی طرف حاجت شدید ہوگی ۔ اور اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ دین کے کاموں مثلاً قضا، فتویٰ نویسی، علوم دین کا پڑھانا اور امامت اور وعظ اور اذان کو انجام دیتے ہیں عموماً وہ زیادہ مال دار نہیں ہوتے ۔

ابن خلدون پانچ قسم کی کمائیوں کو انسان کے لئے طبیعی بتاتا ہے ۔

(۱) فلاحۃ (کاشتکاری) یہ سب صنعتوں پر مقدم ہے کیوں کہ اس سے غذا حاصل ہوتی

ہے جس سے حیاتِ انسانی کی تکمیل ہوتی ہے۔ اور اس پیشہ کو دیہاتیوں سے خصوصیت حاصل ہے کیوں کہ گاؤں شہر سے پہلے ہے۔ اور کاشتکاری منکسرالمزاج اور امن پسند دیہاتیوں کا ذریعہ گذران ہے۔ اور اسی لئے غالباً کوئی شہری یا کوئی راحت پسند آدمی اس پیشہ کو اختیار نہیں کرتا۔

(ب) تجارۃ۔ وہ کمائی چاہتا ہے مال کو اس طرح بڑھا کر کہ کوئی سودا کم دام میں خرید کر زیادہ دام میں بیچا جائے۔ اس معاملہ سے جو زیادہ مال ملتا ہے اس کو 'نفع' کہتے ہیں۔ اس نفع کا خواہش مند یا تو سامان کو اکٹھا رکھتا ہے اور جب بازار میں اس سامان کا نرخ گراں ہوجاتا ہے تب بیچتا ہے تو اس کو عظیم نفع ملتا ہے۔ یا اس سامان کو ایسے مقام میں بھیجتا ہے جہاں اس کا خرچ اور مانگ زیادہ ہے وہاں وہ سامان زیادہ قیمت پر جاتا ہے تو زیادہ نفع ملتا ہے۔ اور چوں کہ نفع راس المال کے اعتبار سے کم ہوتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ راس المال بڑا ہو تاکہ اس سے بڑا نفع حاصل ہو۔ پھر کبھی راس المال اور نفع دونوں میں سے بہت کچھ کھوٹا ہونے اور کم تولنے اور ادائیگی میں ٹال مٹول کرنے کی وجہ سے ضائع ہوجاتا ہے اور کبھی دَین کے انکار کی وجہ سے تاجر کا کل مال ضائع ہوجاتا ہے ہاں اگر تاجر جھگڑے پر دلیر حساب سے واقف مقدمہ باز حکام رس ہو تو اس ضرر سے بچ سکتا ہے ورنہ اس کو خریدار لقمہ بنالے گا کیوں کہ عموماً لوگوں میں اور خصوصاً ظالموں اور خریداروں میں یہ بات بہت پائی جاتی ہے کہ وہ لوگ دوسروں کے مال کے حریص اور اس کے لوٹنے والے ہوتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے تاجروں کے اخلاق سرداروں اور بادشاہوں اور رئیسوں کے اخلاق سے گرے ہوئے ہوتے ہیں اور وہ بے مروت ہوتے ہیں کیوں کہ ان کو جھگڑا اور مقدمہ بازی اور کھوٹ کرتے اور دام بتانے میں جھوٹی قسموں کی عادت ہوجاتی ہے گو بہت کم تاجران باتوں سے بچتے بھی ہیں۔ اور گو وہ لوگ ظاہر بھی کرتے ہیں کہ وہ ان بری باتوں کے مرتکب صرف کمانے کے لئے ہوتے ہیں۔ مگر کچھ دنوں میں یہ چیزیں ان کی پختہ عادت بن جاتی ہیں۔ اور ابن خلدون کی رائے ہے کہ نرخوں کی ارزانی تاجروں کو اور خود آبادی کو بھی ضرر رساں اسی طرح ہے جس طرح سخت گرانی ہے کیوں کہ جب نرخ بہت ارزاں ہوجاتا ہے۔

تو تاجروں کا حال خراب ہو جاتا ہے اور وہ ارزاں قسم کی خرید و فروخت سے اور اُس کے پیدا کرنے سے رک جاتے ہیں۔ ہاں زراعت میں ارزانی پسندیدہ ہے کیوں کہ اس کی طرف عام حاجت ہوتی ہے اور غذاؤں کی طرف لوگ بے چین رہتے ہیں۔

(ج) صناعۃ۔ صناعت اس ملکہ کو کہتے ہیں جو کسی ایسے امر میں ہوتا ہے جو عملی بھی ہے اور فکری بھی۔ وہ عمل کے لئے جسمانی مشقت کا مقتضی ہے اور صنعت کے لئے تعلیم عقلی کا اور اس کے سیکھنے میں کچھ زمانہ کی حاجت ہوتی ہے صناعت کے آسان اور مشکل ہونے کے اعتبار سے۔ ترقی پذیر صنائع شہر کے لوازم میں سے ہیں۔ اور صنائع کی ترقی آبادی کی وسعت اور قدامت اور استحکام کے تابع ہے۔ ابن خلدون کا اعتقاد ہے کہ جو شخص کسی ایک صناعت میں کامل ہوتا ہے اس کا دوسری صناعت میں ماہر ہونا کم ہوتا ہے۔ پھر صنائع میں ترقی اور کثرت اس وقت ہوتی ہے جب کہ اس کی مانگ بہت ہو کیوں کہ اس وقت وہ سامانِ تجارت کے مانند ہو جاتے ہیں۔ ابن خلدون اس کا بھی مدعی ہے کہ عرب (بدو) صنائع سے سب آدمیوں سے زیادہ دور ہیں۔ اور بڑے صنائع میں سے کاشتکاری اور تعمیر اور بڑھئی کا کام اور کپڑا بننا اور سلائی کا کام عملی ہے۔ اور نافع آزاد پیشوں میں سے فن تولید اور طب ہے لیکن کہاں؟ لبستیوں اور شہروں میں۔ صحراؤں میں نہیں۔ کیوں کہ بیماری راحت و آسائش کا نتیجہ ہے اور وہ صحرا میں معدوم ہے۔، عمدہ انسانی صنائع میں سے خوشنویسی اور کتابوں کو لکھنا اور جلد سازی اور موسیقی ہے، ابن خلدون کا صنائع پر ایک عمدہ نہایت محکم نظریہ ہے وہ یہ کہ صناعت سے صانع کو عقل حاصل ہوتی ہے کیوں کہ صنائع میں مشغول ہونے اور ان کے درجات کو بتدریج طے کرنے اور اس کی باریکیوں کی مشاقی سے عقل میں پختگی پیدا ہوتی ہے اس لئے کہ صنائع کے لئے کچھ قاعدے ہوتے ہیں کہ جب آدمی انھیں جان لیتا ہے تو اس کی نفس اور عقل میں کچھ علوم مرتب ہو جاتے ہیں پس ان سے عقل زیادہ ہو جاتی ہے۔

۷۔ انسانی آبادی میں علم و تعلیم طبیعی امر ہے۔ یہ تو ممکن نہیں ہے کہ ہم اس فصل کو مفصل

طور پر بیان کریں کیوں کہ یہ علوم کے کل انواع کو مشتمل ہے لیکن میں ابن خلدون کے آراء خاصہ کو علوم مختلفہ میں بیان کرتا ہوں پھر اس کی رائیں تعلیم کے بارے میں بیان کروں گا کیوں کہ وہ رائیں نہایت صحیح اور جدید ہیں۔

ابن خلدون کی رائے ہے کہ انسان دوسرے حیوانات سے متمیز ہے اس فکر کی وجہ سے جس سے اس کو اپنے معاش کے حاصل کرنے کی اور اپنے ہم جنسوں سے تعاون کی اور انبیاء کی تعلیم کو قبول کرنے کی راہ ملتی ہے اور وہ ہمیشہ فکر مند رہتا ہے فکر سے کبھی سُست نہیں پڑتا اور حضارت کی ترقی کے ساتھ علوم کی کثرت ہوتی ہے کیوں کہ وہ بھی صنائع کمالیہ میں سے ہیں۔ پھر علوم کی دو قسم ہیں۔

۱۔ وہ جو کہ انسان کے لئے طبیعی ہیں جن کو انسان اپنے غور و فکر سے پا لیتا ہے جیسے علوم فلسفیہ

(۲) وہ جو واضع شرعی سے بذریعہ خبر کے حاصل ہوتے ہیں اور ان میں عقل کو کچھ دخل نہیں ہے مگر مسائلِ فرعیہ کو اصول کے ساتھ لاحق کرنے میں۔ اور وہ علوم نقلیہ وضعیہ ہیں اور وہ شرعی علوم کتاب و سنت ہیں جو ہمارے لئے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے مشروع ہیں اور وہ علوم ہیں جو ان سے متعلق ہیں پھر ان کے لئے زبان عربی کے علوم ضروری ہیں۔

(ل) علوم نقلیہ قرآن کے علوم ہیں یعنی قراءات و تفسیر۔ پھر حدیث و فقہ اور فرائض (میراث) کے علوم۔ اور علمِ کلام اور اس علم کا مقصد ان لوگوں کا رد کرنا ہے جو سلف کے مذاہب سے اعتقادات میں منحرف ہیں۔ ابن خلدون کی رائے ہے کہ اس علم (کلام) کی طرف اس زمانہ میں حاجت تھی جب کہ مبتدعین کی کثرت تھی مگر اب (ابن خلدون کے زمانہ میں) اہلِ بدعت کا وجود باقی نہیں ہے اس لئے اب اس علم سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اسی طرح علم تصوف ابن خلدون کے نزدیک علوم شرعیہ حادثہ فی الملۃ سے ہے اور اس کی بنا دنیا سے بے رغبتی پر ہے لیکن متاخرین متصوفین راہ مستقیم سے بہک گئے ہیں۔ اور ابن خلدون کا اعتقاد ہے کہ بعض اولیاء کے لئے ایسی کرامات ہیں جن سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اور وہ ظاہر کرتا ہے کہ صوفیہ میں سے جو لوگ معتدل ہیں ان کی رائیں قبول کرنا چاہیئے اور اس کا اعتقاد ہے کہ خواب کا وجود ہے اور اس کی تعبیر ضروری ہے کیونکہ

وہ معلوم ہے معلوماتِ غیب میں سے۔ اس لئے کہ وہ (سچا خواب) نبوت کا ایک چھوٹا جزو ہے۔

(ب) ابن خلدون علومِ عقلیہ کو ذکر کرتا ہے اور ان کا حال بیان کرتا ہے اور علوم عددیہ مثلاً حساب اور جبر و مقابلہ اور معاملات (تجارتی حساب) کے بارے میں کچھ رائے ظاہر نہیں کرتا پھر علومِ ہندسیہ کی طرف جھکتا ہے تو ہندسہ مسطحہ اور ہندسہ مخصوصہ باشکال کرویہ اور مخروطات پھر مساحت پھر مناظر (بصریات) کو ذکر کرتا ہے اور عقل میں ان سب کے مؤثر ہونے کی مدح کرتا ہے اور علم ہیئت (فلک) پر کلام کرتا ہے۔ اور بعد ازیں وہ منطق اور طبعیات کو ذکر کرتا ہے اور طب کو اس بنا پر کہ وہ طبعیات کی ایک فرع ہے علم کی طرح نہ صناعت کی طرح۔ اور اسی طرح فلاحت ہے۔ پھر علمِ الٰہیات پر کلام کرتا ہے اور اس کی تاریخ بخوبی بیان کرتا ہے اور اپنا میلان نہیں ظاہر کرتا۔ اور جب وہ سحر اور طلسمات پر کلام کرتا ہے تو تاثیر روحانی کا انکار نہیں کرتا اور وہ وجود سحر کا منکر نہیں ہے جیسا کہ دینی روایات میں آیا ہے لیکن اس کا یہ اعتقاد ہے کہ وہ ضرر رساں ہے اور عقیدہ ایمانیہ کو خراب کرنے والا ہے کیوں کہ وہ امور کو غیر اللہ کی طرف راجع کرتا ہے اور وہ سحر کی ترغیب نہیں دیتا بلکہ اس سے نفرت کرتا ہے۔ اور کیمیا (کم قیمت دھات مثلاً سیسہ۔ تانبا کا قیمتی دھات مثلاً چاندی۔ سونا بن جانا) پر کلام کرتا ہے تو کیمیا گروں کے اقوال پیش کرنے کے بعد اس کا انکار کرتا ہے اور اس کے محال ہونے کا یقین کرتا ہے۔ اس کے بعد کہ وہ فلسفہ کے نتیجہ کا اس قول سے انکار کر چکا ہے "کہ وہ موجودات جو حس کے دائرہ سے باہر ہیں اور وہ روحانیات ہیں سو ان کی ذاتیں بالکل غیر معلوم ہیں اور نہ ان تک پہنچنا ممکن ہے اور نہ ان پر دلیل قائم کرنا" ابن خلدون اس فن نجوم کے بطلان کا قائل ہے جس کا مقصد ستاروں کے ذریعہ سے غیب کا جاننا ہے۔ اس لئے کہ کواکب کی تاثیر اس کے نیچے والی چیزوں میں باطل ہے کیوں کہ توحید کے باب میں ثابت ہو چکا ہے کہ سوا اللہ کے کوئی مؤثر (بالذات) نہیں ہے۔

(ج) خاص صناعت تعلیم۔ تعلیم ایک خاص صناعۃ ہے اس کی غرض علم کی استعداد

سیکھنے والوں کے نفوس میں پیدا کرنا ہے یہ نہیں کہ طالب علموں کو علوم کے مسائل فرعیہ کے حفظ کرنے پر اُبھارا جائے۔ ابن خلدون اس نظریہ کی تحقیق کے لئے چند قاعدے مقرر کرتا ہے

(۱) طالب علم کی عقلی قوت کی رعایت کرنا کسی نوع کے علم سکھانے میں۔ اور اس نوعِ علم کی مقدار کی رعایت۔

(۲) طالب علم کو آسان سے آسان طریقہ پر تین بار تعلیم دینا (جان لو کہ طالب علم کو علم سکھانا اس وقت مفید ہوتا ہے جبکہ بتدریج ایک ایک چیز کی تھوڑی تھوڑی تعلیم دی جائے پہلے اس کو فن کے ہر باب کے وہ مسائل بتائے جائیں جو اس باب کے اصول ہیں اور ان مسائل کی شرح اجمالی طور پر بتائی جائے لیکن اس میں اُس کی عقل کی قوت اور استعداد پر قبول کرنے کے لئے سکھائی جانے والی باتوں کے نظر رکھی جائے یہ صورت فن کے آخر تک جاری رہے اس طریقہ سے طالب علم کو اس علم میں ملکہ حاصل ہو جائے گا لیکن یہ ملکہ ناقص اور کمزور ہوگا اس ملکہ کا فائدہ یہ ہے کہ وہ طالب علم کو اس فن کے سمجھنے اور اس کے مسائل حاصل کرنے کے قابل بنادے گا۔ اس کے بعد اسے دوبارہ اس فن کی طرف متوجہ کیا جائے اس دفعہ اُس کو پہلے سے بڑے پیمانہ پر تعلیم دی جائے اور شرح اور تقریر پورے طور پر کی جائے اجمال سے نکال کر تفصیل کی طرف لایا جائے اختلاف اور اس کی وجہ بیان کی جائے اسی طرح پورے فن کی تعلیم ہو اس سے اس کا ملکہ پختہ ہو جائے گا۔ اب قوی ہونے پر اس کو سہ بارہ فن میں لگایا جائے ہر مشکل اور مبہم اور دشوار مسئلہ اس پر واضح کیا جائے اور ہر بات اس پر کھول دی جائے اب وہ فن سے بخوبی واقف ہو جائے گا اور اس کا ملکہ کامل ہو جائے گا۔ یہ تعلیم کا مفید طریقہ ہے۔ عموماً یہ تین بار میں حاصل ہوتا ہے جیسا کہ ابھی جان چکے ہو۔ کبھی تین بار سے کم میں بھی بعض کو یہ بات حاصل ہو جاتی ہے یہ متعلم کی عقلی حیثیت پر مبنی ہے۔

(۳) بہتر یہ ہے کہ متعلم ایک ایک علم میں مشغول ہو بغیر ایک علم کے پختہ کئے ہوئے دوسرے علم میں نہ لگے۔ "تعلیم میں عمدہ طریقوں میں سے یہ ہے کہ طالب علم کو اکٹھا دو علموں میں نہ کھپا دے

کیوں کہ اس صورت میں بہت کم کامیابی ہوتی ہے کہ طبیعت دو طرف بٹ جاتی ہے اور ہر علم سے ہٹ کر دوسرے علم کے سمجھنے کی طرف متوجہ ہونا پڑتا ہے اس لئے دونوں علم اس کے لئے مشکل ہو جاتے ہیں اور دونوں میں ناکام ہو جاتا ہے اور جب ایک علم میں فکر کو مشغول کر دیتا ہے اور صرف اسی میں لگا رہتا ہے تو عموماً تحصیلِ علم میں یہ طریقہ بہتر ہوتا ہے۔

(۴) "معلم کو چاہیئے کہ ایک فن کی تعلیم میں مجالس کی تفریق کو طویل نہ کرے اور مجالسِ تعلیم کے درمیان میں ناغہ نہ بڑھائے کیوں کہ اس سے بھول جانے کا اور فن کے بعض مسائل کا بعض سے الگ ہو جانے کا خطرہ ہے اس لئے تفریقِ مجالس سے حصول ملکہ دشوار ہو جائے گا اور جب علم کی باتیں شروع اور آخر کی غور و فکر کے سامنے حاضر رہیں گی اور نسیان نہ پیش آئے گا تو ملکہ کا حاصل ہونا آسان ہوگا اور مسائل میں ارتباط قوی ہوگا اور ذہن میں جلد مرتسم ہوں گے کیوں کہ ملکہ فکر کے پے در پے اور بار بار پائے جانے سے ہوتا ہے اور جب فعل میں تاخیر ہوگی تو ملکہ فعل ہی سے ناشی ہوتا ہے اس لئے اس کے حاصل حصول میں بھی تاخیر ہوگی۔

(۵) طالب علموں پر سختی کرنا ان کو مضر ہے (خصوصاً چھوٹے بچوں پر کیوں کہ اس سے ملکہ بگڑ جاتا ہے جس طالب علم کی تربیت میں جور و قہر سے کام لیا جاتا ہے قہر اس پر غالب ہو جاتا ہے اور اس کا امنگ وانبساط رخصت ہو جاتا ہے اس میں تنگدلی اور سستی اور کم ہمتی آجاتی ہے جھوٹ اور فریب پر وہ آمادہ ہو جاتا ہے یعنی مافی الضمیر کے خلاف ظاہر کرتا ہے اس خوف سے کہ قہر کے ڈنڈے اس پر پڑیں گے" اس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ انسانیت سے الگ ہو جاتا ہے اور دوسروں پر بار ہو جاتا ہے اور فضائل اور خلق جمیل کے حاصل کرنے سے نفس سست ہو جاتا ہے

(۶) "علوم کے طلب میں اور اساتذہ سے ملاقات کے لئے سفر کرنا تعلیم میں کمال کو زیادہ کرنے والا ہے" اور اس کا سبب یہ ہے کہ لوگ معلومات اور اخلاق کو اور ان مذاہب و فضائل کو جنہیں اختیار کرتے ہیں کبھی علم و تعلیم سے حاصل کرتے ہیں اور کبھی اساتذہ سے مل کر اور ان سے سن کر حاصل کرتے ہیں مگر ملکات کا حصول اساتذہ سے مل کر اور ان سے سیکھ کر بہت مستحکم اور راسخ ہوتا ہے خصوصاً جب کہ اساتذہ متعدد ہوں اور ان کی تعلیم میں تنوع ہو۔

(باقی آئندہ)

انبیاء کرام اسلام کی نظر میں

(مولانا محمد ظفیر الدین صاحب دار الافتاء دار العلوم دیوبند)

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کر کے انھیں بے سہارا نہیں چھوڑا، بلکہ اپنی رافت و رحمت سے اس نے انبیاء کرام علیہم السلام کو بھیجا، اور ان کے ذریعہ خیر و شر، ظلمت و نور، اور حق و باطل کی نشان دہی کی، تاکہ بندے اپنے مولائے حقیقی سے غافل نہ ہو سکیں، اور نجات کی راہ کو چھوڑ کر بربادی کی راہ پر نہ لگ جائیں۔

اللہ تعالیٰ کی یہ بھی رحمت ہے اس نے نبی کسی غیر جنس کے افراد کو نہیں بنایا، کہ لوگوں کو شکوک و شبہات کے دلدل میں پھنسنا پڑے، وحشت و دہشت سے دوچار ہونا پڑے اور یہ دیکھ کر کہ یہ ہم سے الگ جنس ہیں بدک جائیں۔

بلکہ انسانوں ہی میں سے کچھ افراد کو اس نے منتخب فرمایا، ان میں نبوت کی صلاحیت ودیعت فرمائی، شروع زندگی سے ان کی نگرانی کی، اور اعلیٰ علوم، اعلیٰ عقل، اور اعلیٰ اخلاق کا حامل بناکر انسانوں میں بھیجا، گو یہ صحیح ہے کہ کچھ نادانوں نے حیرت سے پوچھا۔

قَالُوْا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا (۹۵) — انھوں نے کہا کیا اللہ نے بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے؟

یعنی ان کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ بشر رسول کیسے ہوگا، بشر کو تو رسول نہیں ہونا چاہیے، اگر رسول ہونا ہی تھا تو فرشتہ کو ہونا چاہیے، اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا

قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا (بنی اسرائیل - ۱۰۰)

آپ فرما دیجیے کہ اگر زمین پر فرشتے ہوتے، کہ وہ اس میں چلتے بستے، تو البتہ ہم ان پر آسمان سے فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجتے۔

جواب کا ماحصل یہ ہے کہ جن میں رسول آیا ہے ان لوگوں میں اور جو رسول بن کر آیا، اس میں

مناسبت ضروری ہے، اگر قوم فرشتوں کی ہوتی، تو رسول بھی فرشتہ ہی ہوتے، لیکن جب بسنے والی قوم انسانوں کی ہے، تو رسول کو بھی انسان ہی ہونا چاہیئے، اور یہی وجہ ہے کہ بشر کو ہی رسول بنا کر بھیجا گیا۔

حضرت مرشد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اگر کسی کو یہاں وسوسہ ہو کہ جب ایسی بات ہے تو فرشتے جو نبی کے پاس وحی لے کر آتے ہیں، ان کو بھی فرشتہ نہیں ہونا چاہیئے تھا، کیوں کہ اس طرح پھر یہاں بھی مناسبت جو ضروری ہے، باقی نہیں رہتی ہے۔ اس لئے کہ رسول انسان ہیں اور وحی لانے والے فرشتے۔

جواب کے سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"جواب یہ ہے کہ رسول میں چوں کہ شانِ ملکیت کی بھی ہوتی ہے اس لئے اس (نبی) کو فرشتہ اور بشر دونوں سے مناسبت ہوتی ہے، کہ فرشتہ سے وحی لے کر بشر کو پہنچا دے، بخلاف عوام بشر کے، ان میں شان ملکیت کی نہیں ہوتی ہے، اس لئے کہ مجانست شرطِ مناسبت ہے۔"[1]

پھر آگے ایک دوسرے اشکال کا جواب تحریر فرماتے ہیں

"اور اگر یہ وسوسہ ہو کہ اگر فرشتہ آدمی کی شکل میں بن کر آجاتا تو عوام کو بھی مناسبت ہو جاتی، اس کے دو جواب ہیں ..... دوسرا یہ کہ شکل بدلنے سے فرشتہ کی خاصیت نہیں بدلتی، اس لئے پھر بھی مناسبت نہ ہوتی۔"[2]

اس وسوسہ کا پہلا جواب سورۃ انعام میں مذکور ہے آیت کا ترجمہ مع تفسیر حضرت تھانوی رح کی ہی زبانِ قلم سے سنئے۔ آیت یہ ہے وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ حضرت تھانوی رح تحریر فرماتے ہیں:

"اگر ہم اس بھیجے ہوئے کو فرشتہ تجویز کرتے، تو چوں کہ فرشتہ کی شکل میں بھیجنا اس لئے نہ ہوتا کہ آدمی ان حواس متعارفہ میں فرشتہ کو اس کی اصلی صورت میں دیکھنے پر قادر نہیں، اس لئے ہم

---

[1] بیان القرآن جلد ۶ صہ ۱۰۲ [2] ایضاً [3] ایضاً ج ۳ صہ

اس فرشتہ کو باعتبار شکل کے آدمی ہی بناتے، اور جب آدمی کی شکل پر وہ ہوتا تو ہمارے اس فعل سے اس وقت پھر ان پر وہی اشکال و اشتباہ ہوتا، جو اب اشکال و اشتباہ کر رہے ہیں، یعنی اس فرشتہ کو بشر سمجھ کر پھر بھی اعتراض کرتے، غرض نزول ملک سے ان کا نفع تو کچھ نہ ہوتا کیوں کہ ان کا اشتباہ بحالہ باقی رہتا، اور ان کا خود یہ ہوتا کہ ہلاک کر دیے جاتے، اس لئے ہم نے اس طرح نازل نہیں کیا۔[۱]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی وجہ سے اپنی بشریت کا بار بار اعلان کیا، تاکہ ایک طرف نبی اور خدا میں فرق ظاہر ہو جائے، غلو میں کوئی نبی کو خدا سے ملانے کی سعی نہ کرے، اور دوسری طرف معلوم ہو جائے کہ نبی کا بشر ہونا عیب نہیں، ہنر ہے، ارشادِ ربانی ہے

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ (کہف ۱۲)

آپ کہہ دیجئے میں تو تم ہی جیسا بشر ہوں ہاں مرے پاس وحی آتی ہے کہ بس تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے۔

اس سلسلہ میں بہت سی حدیثیں صحاح ستہ میں موجود ہیں، جن کے نقل کرنے کی یہاں ضرورت نہیں ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ دوسرے انبیاء بھی آدمی ہی تھے اور قرآن نے اس کو بھی صفائی سے بیان کر دیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُّوحِي إِلَيْهِم مِّنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ (یوسف ۱۲)

اور ہم نے آپ سے پہلے مختلف بستی والوں میں سے جتنے نبی بھیجے سب آدمی ہی تھے، جن کے پاس ہم وحی بھیجتے تھے۔

پھر انبیاء علیہم السلام بیوی اور بچے بھی رکھتے تھے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّن قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ أَزْوَاجًا وَذُرِّيَّةً (الرعد ۶)

اور ہم نے یقیناً آپ سے پہلے بہت سے رسول بھیجے اور ہم نے ان کو بیبیاں اور بچے بھی دیے

---

[۱] بیان القرآن ج ۳ ص

انبیاء و مرسلین کھانا بھی کھاتے تھے، اور بازاروں میں چلتے پھرتے بھی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ (فرقان - ۲)

اور ہم نے آپ سے پہلے جتنے پیغمبر بھیجے، سب کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں بھی چلتے پھرتے تھے۔

گویا یہ چیزیں بھی نبوت کے منافی نہیں ہیں، جن کو کچھ نادان منافیٔ نبوت سمجھ رہے ہیں یہ تو خوبی کی بات ہے کہ انھی میں کا ایک آدمی جس کو اللہ تعالیٰ نے نبوت سے نوازا ہے، رسول بن کر آتا ہے اور راہِ حق کی طرف دعوت دیتا ہے۔

کسی اور قبیل کا نبی ہوتا تو کہا جا سکتا تھا کہ یہ کون سا بڑا کمال ہے، کمال تو اس وقت سمجھا جاتا کہ انسان ہو کر، بال بچوں میں رہ کر، اور ان انسانی قویٰ کا حامل ہو کر اعتدال کی راہ اختیار کرتا۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ نبوت کی کیا ضرورت ہے، عقلِ انسانی کافی ہے، جواب یہ ہے کہ یہ سب وہم ہی وہم ہے، کچھ امور ایسے ہیں جن کی طرف رہنمائی عقل کے لئے آسان نہیں، جیسے آخرت اور نجات کا مسئلہ ہے، اس لئے بے حد ضروری تھا کہ مخلوق اور خدا کے درمیان کوئی ایسا واسطہ ہوتا، جو ان مسائل کو کھول کر بتا سکتا اور اس طرح بندوں پر اتمامِ حجت کا کام بھی انجام پذیر ہو جاتا، اسی واسطے انبیاء علیہم السلام کے ذمہ یہ فرائض عاید کئے گئے۔

پھر جس عقل کو سہارا بنایا جا رہا ہے، کیا اس میں خردمندانِ جہان کے درمیان اختلاف نہیں ہوتا، ایک شخص ایک وقت کسی چیز کو نیکیوں کے خانہ میں جگہ دیتا ہے، دوسرا شخص ٹھیک اسی چیز کو اسی وقت موجبِ ہلاکت جانتا ہے، اگر عقل حسن و قبح کا درست فیصلہ کیا کرتی، تو پھر اس باب میں عقلاء کا اختلاف نہ ہوتا، مگر کون انکار کر سکتا ہے کہ ایسی بات نہیں ہوتی۔

پھر عقل احکام کا استقصار نہیں کر سکتی، اس لئے کہ کوئی بھی عقلمند ہو، اس کی سوجھ

محدود ہوگی، پوری دنیا کی اصلاح کا نقشہ مرتب کرنا انسانوں کے بس سے باہر کی بات ہے اور وہ بھی اس طرح کہ سب کا لحاظ و پاس ہو۔

پھر یہ بھی اپنی جگہ مسلم بات ہے کہ طبائع بشری اوہام پرست واقع ہوئے ہیں، عموماً انسان ایسے ہی ہوا کرتے ہیں، ایک مکان کے اندر کوئی مردہ ہو، اس کے پاس کسی عقل مند کو بٹھا دیجئے اور بتا دیجئے یہ مردہ ہے، مگر بایں ہمہ وہ رہ رہ کر چونک اٹھے گا، اور خوفزدہ ہو کر بھاگنے کی سعی کرے گا حالاں کہ اس کو یقین ہے کہ یہ مردہ ہے بے بس ہے، مگر وہم اس کو چین سے بیٹھنے نہ دے گا۔

کوئی بھی عاقل ہو، اس کی عقل محدود ہوگی، ایک حد پر جا کر وہ ختم ہو جائے گی، کسی نے بڑی اچھی مثال دی ہے کہ عقل کی مثال اس ترازو کی ہے، جس سے سونا تولا جاتا ہے، کوئی اس سے پہاڑ وزن کرنا چاہے تو یہ ناممکن ہے۔

کتاب و سنت کی روشنی میں اس مسئلہ پر غور کرتے ہیں، تو یہاں بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ عقلِ انسانی محدود ہے، کوئی لامحدود شئی نہیں، رب العزت کا ارشاد ہے۔

(الف) وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا — اور تم کو تو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔

(بنی اسرائیل -۱۰)

(ب) وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ (بقرہ) — اور وہ (موجودات) اس کے معلومات میں سے کسی چیز کو اپنے احاطہ علمی میں نہیں لا سکتے۔

رہا سائنس کا مسئلہ، تو یہ بالکل عیاں چیز ہے کہ اس کا تعلق بھی عقل و تجربہ ہی سے ہے، اس سے حشر و نشر، حساب و کتاب، نیکی و بدی، دنیا و آخرت اور نجات و عدم نجات کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔

کوئی عقل و خرد سے ان مسائل کو معلوم بھی کر لے، تو ، ضروری نہیں کہ شریعت و عقل دونوں کے حکم میں موافقت بھی ہو۔

انھی وجوہ کی بنیاد پر ماننا پڑتا ہے کہ نبوت کا مسئلہ لازم و ضروری ہے، اس سے کوئی چارہ کار

انبیاء و مرسلین کھانا بھی کھاتے تھے، اور بازاروں میں چلتے پھرتے بھی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ (فرقان - ۲)

اور ہم نے آپ سے پہلے جتنے پیغمبر بھیجے، سب کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں بھی چلتے پھرتے تھے۔

گویا یہ چیزیں بھی نبوت کے منافی نہیں ہیں، جن کو کچھ نادان منافیِ نبوت سمجھ رہے ہیں یہ تو خوبی کی بات ہے کہ انہی میں کا ایک آدمی جس کو اللہ تعالیٰ نے نبوت سے نوازا ہے، رسول بن کر آتا ہے اور راہِ حق کی طرف دعوت دیتا ہے۔

کسی اور قبیل کا نبی ہوتا تو کہا جا سکتا تھا کہ یہ کون سا بڑا کمال ہے، کمال تو اس وقت سمجھا جاتا کہ انسان ہو کر، بال بچوں میں رہ کر، اور ان انسانی قویٰ کا حامل ہو کر اعتدال کی راہ اختیار کرتا۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ نبوت کی کیا ضرورت ہے، عقلِ انسانی کافی ہے، جواب یہ ہے کہ یہ سب وہم ہی وہم ہے، کچھ امور ایسے ہیں جن کی طرف رہنمائی عقل کے لئے آسان نہیں، جیسے آخرت اور نجات کا مسئلہ ہے، اس لئے بے حد ضروری تھا کہ مخلوق اور خدا کے درمیان کوئی ایسا واسطہ ہوتا، جو ان مسائل کو کھول کر بتا سکتا اور اس طرح بندوں پر اتمامِ حجت کا کام بھی انجام پذیر ہو جاتا، اسی واسطے انبیاء علیہم السلام کے ذمہ یہ فرائض عاید کئے گئے۔

پھر جس عقل کو سہارا بنایا جا رہا ہے، کیا اس میں خردمندانِ جہان کے درمیان اختلاف نہیں ہوتا، ایک شخص ایک وقت کسی چیز کو نیکیوں کے خانہ میں جگہ دیتا ہے، دوسرا شخص ٹھیک اسی چیز کو اسی وقت موجبِ ہلاکت جانتا ہے، اگر عقل حسن و قبح کا درست فیصلہ کیا کرتی، تو پھر اس باب میں عقلاء کا اختلاف نہ ہوتا، مگر کون انکار کر سکتا ہے کہ ایسی بات نہیں ہوتی۔

پھر عقل احکام کا استقصار نہیں کر سکتی، اس لئے کہ کوئی بھی عقل مند ہو، اس کی سوجھ

محدود ہوگی، پوری دنیا کی اصلاح کا نقشہ مرتب کرنا انسانوں کے بس سے باہر کی بات ہے اور وہ بھی اس طرح کہ سب کا لحاظ و پاس ہو۔

پھر یہ بھی اپنی جگہ مسلم بات ہے کہ طبائع بشری اوہام پرست واقع ہوئے ہیں، عموماً انسان ایسے ہی ہوا کرتے ہیں، ایک مکان کے اندر کوئی مردہ ہو، اس کے پاس کسی عقل مند کو بٹھا دیجیے اور بتا دیجیے یہ مردہ ہے، مگر بایں ہمہ وہ رہ رہ کر چونک اُٹھے گا، اور خوفزدہ ہو کر بھاگنے کی سعی کرے گا حالاں کہ اس کو یقین ہے کہ یہ مردہ ہے بے بس ہے، مگر وہم اس کو چین سے بیٹھنے نہ دے گا۔

کوئی بھی عاقل ہو، اس کی عقل محدود ہوگی، ایک حد پر جا کر وہ ختم ہو جائے گی، کسی نے بڑی اچھی مثال دی ہے کہ عقل کی مثال اس ترازو کی ہے، جس سے سونا تولا جاتا ہے، کوئی اس سے پہاڑ وزن کرنا چاہے تو یہ ناممکن ہے۔

کتاب و سنت کی روشنی میں اس مسئلہ پر غور کرتے ہیں، تو یہاں بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ عقل انسانی محدود ہے، کوئی لامحدود شئی نہیں، رب العزت کا ارشاد ہے۔

(الف) وَمَآ أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا — اور تم کو تو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔

(بنی اسرائیل - ۱۰)

(ب) وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ (بقرہ) — اور وہ (موجودات) اس کے معلومات میں سے کسی چیز کو اپنے احاطہ علمی میں نہیں لا سکتے۔

رہا سائنس کا مسئلہ، تو یہ بالکل عیاں چیز ہے کہ اس کا تعلق بھی عقل و تجربہ ہی سے ہے، اس سے حشر و نشر، حساب و کتاب، نیکی و بدی، دنیا و آخرت اور نجات و عدم نجات کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔

کوئی عقل و خرد سے ان مسائل کو معلوم بھی کر لے، تو ضروری نہیں کہ شریعت و عقل دونوں کے حکم میں موافقت بھی ہو۔

انھی وجوہ کی بنیاد پر ماننا پڑتا ہے کہ نبوت کا مسئلہ لازم و ضروری ہے، اس سے کوئی جائے گا

نہیں، اور انسان کی فلاح اسی میں ہے کہ وہ نبی کے ذریعہ ان مسائل مہمہ کو معلوم کرکے نجات کی راہ پر لگ جائے۔

خیال ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر شخص کو نبی کی سی سمجھ عطا کر دیتا، اور سب پر امورِ دینیہ کو منکشف کر دیتا، مگر سوچنا چاہیئے کہ جب دنیاوی بادشاہ اپنے فرمان کے متعلق ایک ایک سے کہتا نہیں پھرتا، بلکہ جو حاشیہ نشین اور خاص سکرٹیری ہوتا ہے، اسی کے ذریعہ اپنے فرمان کی اشاعت کرتا ہے، تو پھر رب العالمین کے لئے یہ چیز کس طرح مناسب ہوتی، کہ مرکزیت کو ختم کرکے انتشار پیدا کر دیتا، اور خود ایک ایک سے کہتا پھرتا۔

اگرچہ اس مسئلہ کو دنیاوی مسئلہ پر کسی طرح ڈھالا نہیں جا سکتا، کیوں کہ دونوں میں کوئی مناسبت نہیں مگر سمجھانے کے لئے کہا جا سکتا ہے، کہ صدر کے لئے جس طرح وزرار کی ایک کیبنٹ ہوتی ہے، جو حکومت کے قوانین کا عوام میں نفاذ کرتی ہے، لوگوں کو نشیب و فراز سے آگاہ کرتی ہے، ہر چیز کی دیکھ بھال اس کے ذمہ ہوتی ہے، اور ان میں سب سے بڑا درجہ وزیر اعظم کو حاصل ہوتا ہے بغیر کسی تشبیہ کے سمجھ لیجئے انبیاء کرام بھی رب العالمین کے وزرار معصوم ہوتے ہیں اور ان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وزیر اعظم کی حیثیت حاصل ہے۔

انبیاء علیہم السلام کا کام انسانوں کی مَلکی و روحانی قوت کی تربیت کرنا ہے، اسی وجہ سے شیطان کی بھی یہاں نہیں چلتی، حدیث میں آیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شیطان ہر جگہ وسوسہ ڈال سکتا ہے، مگر میرے معاملہ میں وہ میرے تابع کر دیا گیا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کی اس عظیم الشان صلاحیت و قوت کا انکار کر دینا ایسا ہے، جس طرح کوئی بچہ قوتِ عاقلہ و ممیزہ کا انکار کر دے، بس جیسے بچہ کا یہ انکار معتبر نہیں، کسی انسان کا نبی کی استعداد سے انکار بھی معتبر نہیں ہو سکتا۔

رات دن ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ انسان میں بچپن سے بوڑھاپے تک عقل و خرد کی کتنی منزلیں طے ہوتی ہیں، کوئی کم کوئی زیادہ عقل مند ہوتا ہے، پھر اگر یہ کہا جاتا ہے کہ رب العزت نے اپنے

فضل وکرم سے انبیاء علیہم السلام کو اس سلسلہ میں سب سے بڑی قوت عطا کی، تو حیرت کی کیا بات ہے؟

انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان کے اندر جو صلاحیتیں ہیں، ان کو ضائع نہ ہونے دیں، بلکہ اعتدال پر رکھ کر کام میں لگا دیں۔

انسان میں دو طرح کے اخلاق پیدا کئے گئے ہیں، ایک وہ جن کو ہم اخلاقِ حسنہ کہتے ہیں دوسرے جو ان کے خلاف ہے، جن کو اخلاق سیئہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، اخلاق حسنہ آدمی کے حالات کو سنوارتے ہیں، اور اخلاقِ سیئہ بظاہر ان کے برعکس ہیں، مگر سوچیئے تو معلوم ہو کہ انسانی ترقی وحفاظت کے لئے ان کا آزاد چھوڑ دیا جانا ہی ضروری تھا، کیوں کہ اگر ان پر فطری طور پر کنٹرول کر لیا جاتا، تو ترقی کی رفتار سست پڑ جاتی، ہاں ان میں اعتدال پیدا کرنا ضروری تھا، اس لئے کہ اگر ان کو اعتدال کی راہ پر ڈالا نہ جاتا تو یہ نفع کے بجائے سراپا نقصان کا ذریعہ بن جاتے۔

اللہ تعالیٰ نے نبیوں اور رسولوں کو اسی لئے بھیجا کہ یہ انسانوں کو بے جا جوش وخروش سے روکیں اور اس اخلاقِ سیئہ والی قوت کو مفید و کارآمد راستہ پر ڈال دیں، اس طرح کہ یہ بھی حسنہ کی صف میں آ جاتے۔

غُصّہ ایک بُرا وصف ہے لیکن اگر اسے عزتِ نفس، عفت وعصمت کی حفاظت، اور اور غیرت دینی وملی کے موقع پر استعمال کیا جائے، تو کون کہہ سکتا ہے کہ یہ بُرا کیا گیا، حرص ایک بُرا مرض ہے، مگر اگر اسی حرص کو کارِ خیر، دنیاوی جائز ترقی، اور اس طرح کے دوسرے موقعوں پر استعمال کیا جائے، تو کیا یہاں بھی اسکو بُرا ہی کہا جائے گا؟

اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء ورسل سے اسی طرح کا کام لیتے ہیں، فطری قوت ختم نہیں کرتے، بلکہ اسے جائز اور اچھے موقع پر صرف کرنے کی راہ بتاتے ہیں، کبھی ترغیب کے پیرایہ میں، کبھی ترہیب کے رنگ میں۔

عقل کی نارسائی کا حال تو یہ ہے کہ وہ ہر شخص کو یہ بات بھی نہیں بتا سکتی کہ تمھارے فلاں

مرض میں یہ دوائیں مفید ہوں گی، انسان اطباء اور ڈاکٹروں کی طرف مرض کے سلسلہ میں رجوع کرنے کے لئے اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے۔ اسی طرح سمجھ لیجئے کہ انسان اس سے کچھ زیادہ ہی مجبور ہے کہ وہ نجات و آخرت کے سلسلہ میں انبیاء علیہم السلام کی طرف رجوع کرے۔

پھر یہ مسئلہ اس وقت قابلِ بحث ہوتا، جب یہ کوئی نئی چیز ہوتی، نبوت کا مسئلہ تو تخلیقِ آدم کے ساتھ ساتھ ہے، جب سے انسان پیدا کیا گیا، نبی بھی بھیجے گئے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کا ہونا ضروری تھا، پھر نبوت کی عدم ضرورت پر زور دینا بے وقوفی نہیں تو اور کیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اس سلسلہ میں جب اعتراض کیا گیا تو اللہ تعالےٰ نے فرمایا۔

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ	آپ کہہ دیجئے میں کوئی انوکھا رسول تو ہوں نہیں
وَمَآ اَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ بِيْ وَلَا بِكُمْ	اور میں نہیں جانتا کہ مرے ساتھ کیا کیا جائے گا اور
اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ وَمَآ اَنَا	نہ تمھارے ساتھ، میں تو صرف اس کا اتباع کرتا
اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (الاحقاف-۱)	ہوں جو مرے پاس وحی کے ذریعہ آتا ہے اور میں
	تو صرف صاف صاف ڈرانے والا ہوں۔

یعنی یہ مسئلہ تو تخلیقِ کائناتِ انسانی کے ساتھ ساتھ لگا ہوا ہے، پھر تم کو حیرت کیا ہے ہر عقل مانتی ہے کہ ہادی و پیغمبر کا ہونا ضروری ہے، ہاں یہ اس وقت حیرت کی بات ہوتی جب پیغمبر علمِ غیب کا دعویٰ کرتے، یہاں بڑی صفائی سے اعلان کیا جارہا ہے کہ ہمیں جو حکم ہوتا ہے وہی کرتے ہیں اور جو چیز بتائی جاتی ہے وہی جانتے ہیں، اس سے زیادہ کچھ دعویٰ نہیں اور یہ مسلّم ہے کہ رسول کی یہی شان ہونی بھی چاہیئے۔

کون نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ اپنے ان برگزیدہ بندوں کے ذریعہ انسانوں کو بتایا کہ ان چیزوں کا رب العالمین کی طرف سے حکم ہے، اور ان کی ممانعت ہے، جو حکمِ الٰہی بجالائیں گے، ان کے لئے خوشخبری ہے، اور جنت و ثواب سے ان کو نوازا جائے گا، جو خلاف ورزی کریں گے وہ دوزخ کے ایندھن بنیں گے، تاکہ پھر بندہ کو یہ کہنے کا حق قانوناً باقی نہ رہے کہ ہمیں خبر نہ ہوئی۔ ارشادِ ربانی ہے

لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ — تاکہ رسولوں کے بعد لوگوں کے لئے حجت کی بات نہ ہو سکے۔

حضرت شاہ ولی اللہ رح لکھتے ہیں

"رسولوں کی بعثت کا مقصد یہ ہے، کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر نور کے دائرہ میں لاکر کھڑا کر دے، اسی وجہ سے اس نے اپنا حکم نبیوں کے پاس بھیجا، پھر اپنا نور ان میں القا فرما دیا اور اصلاحِ عالم کی تڑپ اِن میں پیدا کر دی۔"

چنانچہ انبیار علیہم السلام کی زندگی سے اس کی تصدیق ہوتی ہے، کہ تبلیغ دین کا ان میں بے پناہ جذبہ ہوتا ہے، وہ چاہتے ہیں کہ جس طرح بن پڑے بھٹکے ہوئے انسانوں کو مولیٰ حقیقی کے آستانہ پر لاکر ڈال دیا جائے، اس سلسلہ میں وہ ہر اذیت کو برداشت کرتے ہیں، ہر صبر آزما موقع کا مسکراتے ہوئے استقبال کرتے ہیں، اور ہر خار دار وادی سے گذر کر انسانوں کے پاس پہنچتے ہیں۔

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ — آیا ہے تمہارے پاس رسول تم میں کا، بھاری ہے اس پر
عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم — جو تکلیف تم کو پہونچے، حریص ہے تمہاری بھلائی پر،
بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ — ایمان والوں پر نہایت شفیق مہربان ہے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق قرآن نے بتایا کہ آپ کا یہ حال تھا، کہ اصلاحِ عالم کے لئے بے چین تھے، لوگ راہِ راست پر نہیں آتے، تو غم اتنا ہوتا کہ معلوم ہوتا کہ آپ اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالیں گے۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلَىٰ آثَارِهِمْ — سو شاید آپ ان کے پیچھے غم سے اپنی جان دے
إِن لَّمْ يُؤْمِنُوا بِهَٰذَا الْحَدِيثِ — دیں گے، اگر یہ لوگ اس مضمون پر ایمان نہ لائے
أَسَفًا (کہف - ۱)

دوسرے انبیار علیہم السلام کا بھی یہی حال تھا، قرآن میں اس سلسلہ میں کافی مواد ہے۔

رسول و نبی ہوتے تو انسان ہی ہیں، لیکن ان میں کچھ ایسی صفتیں ہوتی ہیں جو دوسرے عام

انسانوں میں نہیں ہوتیں، اللہ تعالیٰ ان کی فطرت کو نبوت کے لئے سنوار دیتا ہے، سلامتی اور اخلاق کے بڑے اونچے مقام پر پہنچا دیتا ہے، یہ ہمیشہ بھلی بات کہتے ہیں، عدل و انصاف سے کبھی سرمو انحراف نہیں کرتے، اور ان کے کارنامے اتنے شاندار ہوتے ہیں، کہ کوئی غیر نبی ان کا اس میں مدِ مقابل نہیں ہو سکتا۔

اخلاقِ رذیلہ، نفسانی خواہشات، اور دوسرے انسانی عیوب سے انبیاء علیہم السلام پاک ہوتے ہیں، من جانب اللہ ان کے قلب میں معروف کی محبت اور منکر کی نفرت جاگزیں ہوتی ہے، کوئی ایسی ویسی بات ان کی شان کے خلاف ان سے بلا قصد اگر سرزد ہونے کا خطرہ ہوتا ہے، تو رب العالمین حسن و خوبی سے اس سے ان کو بچا لیتا ہے، یہ ساری کارروائی ان کے ساتھ اس لئے ہوتی ہے، تاکہ یہ جو پیغام لائیں، وہ ہر طرح قابلِ اعتماد ہو۔

علاوہ ازیں بذریعہ فرشتہ ان کی حفاظت کی جاتی ہے، تاکہ ان سے دین کے معاملہ میں کوئی غلطی، نسیان، یا اس طرح کی کوئی اور بات نہ ہو سکے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو غیب کا علم نہیں ہے۔

فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِن رَّسُولٍ فَإِنَّهُ يَسْلُكُ مِن بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ رَصَدًا لِيَعْلَمَ أَن قَدْ أَبْلَغُوا رِسَالَاتِ رَبِّهِمْ وَأَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَأَحْصَىٰ كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا (الجن - ۲)

اور یہ اس وجہ سے کہ یہ معصوم ہوتے ہیں، ارشاد حق تعالیٰ ہے سو وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا، ہاں مگر اپنے کسی برگزیدہ پیغمبر کو، تو اس پیغمبر کے آگے اور پیچھے محافظ فرشتہ بھیج دیتا ہے، تاکہ معلوم ہو جائے کہ انھوں نے اپنے پروردگار کے پیغام پہنچا دئے، اور اللہ تعالیٰ ان کے تمام احوال کا احاطہ کئے ہوئے ہے، اور اس کو ہر چیز کی گنتی معلوم ہے۔

ابن کثیر اس آیت کے ضمن میں لکھتے ہیں

انہ یحفظ رسلہ بملائکتہ لیتمکنوا من

اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کی اپنے فرشتوں کے ذریعہ

ادا ءرسالاتہ لیحفظ ما ینزلہ الیھم من الوحی لیعلم ان قد ابلغوا رسالات ربھم (ابن کثیر ج ۴ ص ۴۳۳)

حفاظت کرتا ہے تاکہ انبیاء اللہ کے پیغامات کو پہنچانے پر کماحقہ قادر ہوسکیں، اور ساتھ ہی وہ اس چیز کی بھی حفاظت کرتا ہے جو انبیاء پر نازل فرماتا ہے اوران تمام نگرانیوں کا منشاء یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہوجائے کہ انھوں نے اس کے پیغامات پہنچادئے۔

لیسلك من بین یدیہ کے نیچے لکھتے ہیں

ای یخصہ بمزید معقبات من الملائکۃ یحفظونہ من امر اللہ ویساوقونہ علی مامعہ من وحی اللہ (ایضاً)

کہ اللہ تعالیٰ مخصوص فرشتوں کے ذریعہ پے درپے اس کو محفوظ رکھتا ہے کہ جو امر اللہ اور وحی اس کے ساتھ ہے وہ محفوظ رہ سکے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں جہاں امرأۃ العزیز کے پھسلانے کا تذکرہ ہے، اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ امرأۃ العزیز کے دل میں حضرت یوسف علیہ السلام کا خیال جم چکا تھا، لَقَدْ ھَمَّتْ بِہٖ، ادھر یوسف علیہ السلام بھی امر طبعی کے درجہ میں کچھ کچھ سوچنے لگے تھے، کہ اتنے میں اللہ کی دلیل (عصمت) آکھڑی ہوئی، اور یہ بالکل محفوظ ہوگئے، یہاں پہنچ کر بطور احسان اللہ تعالیٰ نے فرمایا

كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ (یوسف - ۳)

ہم نے اسی طرح ان کو علم دیا تاکہ ہم ان سے صغیرہ و کبیرہ گناہ دور رکھیں، وہ ہمارے برگزیدہ بندوں میں سے تھے۔

اس آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو ہر طرح کے صغیرہ و کبیرہ گناہوں سے مصئون و محفوظ رکھتے ہیں، جس کا نام عصمت ہے۔

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ان بندوں کو معصوم رکھتا ہے جو اس کے مخلص بندے ہوتے ہیں حیث عِبَادَنَا الْمُخْلَصِيْنَ، وہ خواہ یوسف علیہ السلام ہوں، یا دوسرے انبیاء، قرآن پاک میں "مخلص" کا لفظ انبیاء علیہم السلام کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔

ایک دوسری آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ "مخلصین" پر شیطان کا کوئی داؤ نہیں چلتا، یہ تو آپ جانتے ہیں کہ شر اور گناہ کے کام کی دعوت شیطان کی ہی طرف سے ہوتی ہے، اور قرآن کا اعلان ہے کہ شیطان خدا کے "مخلص" بندوں پر اپنے داؤ پیچ آزمانے کی سعی نہیں کر سکتا، خود شیطان نے کہا تھا جس کی حکایت قرآن میں ہے۔

فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِيْنَ	تری عزت کی قسم کہ میں ان سب کو گمراہ کروں گا
إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ (ص۔ ۵)	بجز آپ کے ان بندوں کے جو ان میں منتخب کئے گئے ہیں

پس معلوم ہوا کہ انبیاء معصوم ہوتے ہیں قرآن میں ایک دوسرے موقع سے رب العزت نے انبیاء کے متعلق فرمایا ہے کہ اُن پر شیطان کا کوئی تسلط نہیں ہوتا ارشاد ہے۔

إِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ	بلاشبہ مرے بندوں پر تجھ کو تسلط حاصل نہیں ہے

حدیث میں بھی آیا ہے کہ شیطان خون کی طرح انسان میں دوڑتا ہے، مگر نبی و رسول کے باب میں وہ مطیع کر دیا گیا، یہاں اس کی کچھ نہیں چلتی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

فَإِنَّ الشَّيْطَانَ يجري من احدكم	شیطان تم میں سے ہر ایک کی رگ میں خون کی
مجري الدم قلنا ومنك يا رسول الله	طرح دوڑتا ہے ہم نے کہا یا رسول اللہ اور آپ کے
قال ومنّي ولكن الله اعانني عليه	بھی، فرمایا مجھ میں بھی لیکن اللہ نے مری اعانت
فاسلم رواه الترمذي (باب مشكوٰة النظر	فرمائی جس کی وجہ سے وہ اطاعت گذار ہو گیا۔
الى المخطوبه)	

(باقی آئندہ)

قائدین کی تربیت اور اوصاف و خصائص

از

(جناب مولانا محمد تقی صاحب امینی مدرسہ معینیہ درگاہ شریف اجمیر)

"قائدین" روحوں اور دلوں کی بستیاں اُلٹ کر ان میں ایمان و اعتقاد کی قوت بھرتے ہیں۔ عقائد و افکار میں انقلاب برپا کر کے فکر و عمل کی نئی دنیا بساتے ہیں۔ ذہنی و اخلاقی استعداد کی تربیت کر کے ایسا ذہن و اخلاق بناتے ہیں کہ قوم کے افراد اختلافِ طبائع کے باوجود قومی اور جماعتی کاموں میں یک نگاہ و عمل دکھائی دینے لگتے ہیں۔ اس بنا پر یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ قائدین ہی دراصل قوم کی روح اور جان ہوتے ہیں انھیں کے ہاتھوں قوم کی بُنیاد رکھی جاتی ہے اس کی تنظیم و تشکیل ہوتی ہے اور پھر وہ عروج و بقاء کی منزلیں طے کرتی ہے یہ واقعہ اور مشاہدہ ہے کہ قوم کو جب تک صحیح قیادت نہ میسر ہو اس وقت تک نہ اس کی صحیح تنظیم و تربیت ہو پاتی ہے اور نہ ہی کوئی جد و جہد برگ و بار لا سکتی ہے۔ گاڑی کے چلانے کے لئے جب تک تجربہ کار ڈرائیور نہ ہو اس وقت تک نہ اسٹیم (جذبات) کی طاقت منزلِ مقصود پر پہنچا سکتی ہے اور نہ لائن (فضاء) کی درستی و ہمواری۔

مناسب ہے کہ "زوال کے بُنیادی اسباب" سے پہلے قائدین کے اوصاف و خصائص کا اجمالی تذکرہ کر دیا جائے۔

قرآنِ حکیم نے اس سلسلہ میں انبیاء کرام کی زندگی کا جو نقشہ پیش کیا ہے وہ اپنی معنویت کے لحاظ سے مکمل و جامع اور قیادت کے نہایت اونچے مرتبہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے یہاں ہم چند ان بُنیادی باتوں کے بیان پر اکتفار کریں گے جن کا قائدین میں پایا جانا ضروری ہے اور جن کے بغیر کوئی قائد حقیقی معنوں میں قائد کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا ہے[1]

---

[1] ظاہر ہے کہ قائدین سے آج کل کے سیاسی لیڈر مراد نہیں ہیں بلکہ وہ ہیں جو قوم میں نئی روح پھونکتے ہیں، نئی جان ڈالتے ہیں اور پھر نئی زندگی اور نئے دور کے بانی قرار پاتے ہیں۔ (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

وہ بنیادی باتیں چھ ہیں۔

(۱) تربیت۔ (۲) صلاحیت۔ (۳) فنائیت۔ (۴) عملیت۔ (۵) اخلاقیت اور (۶) قوتِ استدلال وبیان۔ ان میں سے ہر ایک کی بالترتیب تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) پہلی تربیت ہے۔

تربیت کی دو صورتیں کسی قائد کی قیادت میں تربیت پائی ہو اور یا قدرتی طور پر اس کی تربیت ہوئی ہو

اس کی دو صورتیں ہیں (۱) کسی قائد کی قیادت میں رہ کر حالات کے نشیب و فراز اور قومی مزاج سے اچھی طرح واقفیت حاصل کی ہو۔ اس کی رہنمائی میں کام کر کے موقع کے لحاظ سے بعض جذبات کو دبانے اور بعض کو بروئے کار لانے کی ٹریننگ پائی ہو۔ سطح سے ہٹ کر گہرائی پر نظر ڈالنے اور تقلید و جمود کی جگہ تنقیدی شعور سے کام لینے کی مشق کی ہو ماضی کی عظمتوں سے محض عقیدت رکھنے کے بجائے ان کی محرکات اور روح کو سمجھا ہو۔ حال کی پر فریب امیدوں میں گم ہونے کے بجائے ڈوبتی کشتی کو پار لگانے کا انداز سیکھا ہو غرض اس طرح اس کی تربیت ہوئی ہو کہ ہر موقف اور ہر موڑ کو سمجھ کر صحیح راہِ عمل تلاش کر سکتا ہو۔

(۲) قائد کی قیادت تو نہ میسر آئی ہو لیکن زندگی کے حالات کچھ اس قدر مختلف گذرے ہوں کہ زمانہ خود معلم بن گیا ہو۔ گرد وپیش کے ماحول نے غور وفکر کی نئی نئی راہیں پیدا کی ہوں اور ان میں قطع و برید کر کے قومی مزاج اور اس کی ضروریات کو سمجھنے میں کامیاب ہو گیا ہو مختلف المزاج لوگوں کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ویسے اجتماعیین نے لیڈروں کے اعمال وخصائص پر کافی بحثیں کی ہیں یہاں ہم ان کی تفصیل سے اس بنا پر گریز کر رہے ہیں کہ قرآن حکیم نے جس باریک بینی اور دقیقہ رسی سے کام لے کر اس بحث کو بلندی پر پہنچایا ہے ان کے یہاں اس کا پتہ نہیں چلتا ہے پھر دونوں کے زاویہ نگاہ میں بنیادی فرق موجود ہے، قرآن حکیم جس نظر سے سماجی زندگی کو دیکھتا ہے اور اس کے مسائل حل کرتا ہے ظاہر ہے کہ وہ نظر نہ ان کے پاس ہو سکتی ہے اور نہ ہے۔

اس کے علاوہ قرآن حکیم نے قیادت کے لئے انبیاء کرام کی زندگی کو بطور نمونہ پیش کیا ہے اور اجتماعیین نے انقلاب لانے والے لیڈروں کو زیادہ اہمیت دی ہے دونوں کے انقلاب کی نوعیت اور اس لحاظ سے دونوں کی زندگیوں میں بڑا فرق ہے ان تمام باتوں کے باوجود ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ انھوں نے کافی معلومات اور کافی ثبوت فراہم کئے ہیں جن سے ہم عہدہ برآ نہیں ہو سکتے ہیں۔

ساتھ معاملت نے زندگی میں اس قدر ہمواری پیدا کردی ہو کہ ضبط و تحمل کے ساتھ ہر مکتب خیال کے لوگوں کو ایک مرکز پر جمع کر سکتا ہو یعنی قدرتی طور پر اس کی ایسی تربیت ہوئی ہو کہ ذہن و دماغ کا ایک خاص سانچہ اخلاق و عمل کا ایک خاص نقشہ، حوال و ظروف کا ایک خاص اندازہ اس کے سامنے آگیا ہو۔

انبیاء کرام کی زندگی میں دونوں کی مثالیں ملتی ہیں

ان دونوں صورتوں کی مثالیں انبیاء کرامؑ کی زندگی میں بکثرت ملتی ہیں بعض کی تربیت کسی دوسرے نبی کے پاس کی گئی تھی مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضرت شعیبؑ کے پاس مدین بھیجا گیا اور وہاں بکریاں چرانے کی ڈیوٹی سپرد کی گئی اور بعض کی حالات و مقامات کی مناسبت سے قدرتی طور پر کی گئی تھی مثلاً حضرت یوسف علیہ السلام کو جن حالات سے دوچار ہونا پڑا اور جس قدر کڑی آزمائشوں سے گذارا گیا غور سے دیکھا جائے تو یہ سب ایک خاص مقام تک پہنچانے کی استعداد پیدا کرنے کے لئے تھا۔

اسی طرح بالعموم نبیوں کا ان حالات سے دوچار ہونا جو عام لوگوں کو نہیں پیش آتے ہیں عمر کا کافی حصہ گذرنے کے بعد نبوت کے عہدہ سے سرفراز کیا جانا ہر نبی کے ذمہ بکریاں چرانے کی ڈیوٹی سپرد ہونا[۱] حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کتاب ملنے سے پہلے روزہ کی حالت میں کوہِ طور پر رہنا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا روزہ رکھ کر ایک سنسان جنگل میں رہنا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ ابی و امی) کا نبوت سے پہلے غارِ حرا میں مہینوں عزلت گزیں رہنا اور وہاں فکر و مراقبہ اور عبادت و ریاضت میں مصروف رہنا وغیرہ یہ سب دراصل تربیت کے لئے تھا۔

یہاں اس شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ نبوت کسبی شے ہے جس تک انسان تربیت کے ذریعہ پہنچ سکتا ہے وہ یقیناً وہبی شی ہے جس میں انسان کے قصد و ارادہ اور سعی و عمل کو کوئی دخل نہیں ہے

---

[۱] بخاری و مسلم کی روایت ہے کہ رسول اللہ سے پوچھا گیا:۔

اکنت ترعی الغنم قال نعم وھل من نبی الا رعاھا (مشکوٰۃ کتاب الاطعمۃ)

کیا آپ نبوت ملنے سے پہلے بکریاں چرایا کرتے تھے فرمایا "ہاں" اور کوئی نبی ایسا نہیں گذرا جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں۔

جو لوگ بکریوں کی "نفسیات" سے واقف ہیں وہ اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ بکریوں کے چرانے میں جذبات کی کیسی تربیت ہوتی ہے؟ نیز قیادتِ قوم کی تربیت کے لئے رعایت شاۃ کس قدر موزوں ہے۔

البتہ منشار نبوت کے مطابق یہ ضروری سمجھا گیا کہ وحی کی استعداد پیدا کرنے کے لئے اور اس کو عملی شکل میں متشکل کرنے کے لئے مختلف قسم کے ریاضات و مجاہدات کے ذریعہ نبی کی تربیت کی جائے۔

قرآن حکیم میں تربیت کا ثبوت | تربیت کے سلسلہ میں درج ذیل آیت خاص اہمیت رکھتی ہے۔

وفتناك فتونا فلبثت سنين في اهل مدين ثم جئت على قدر يموسى واصطنعتك لنفسي ۲۰/۴۰

اے موسیٰ۔ ہم نے تمھیں ہر طرح کی حالتوں میں ڈال کر آزمایا پھر کئی برس تک تم مدین کے لوگوں میں رہے بالآخر وہ وقت آگیا کہ تم ایک مقررہ اندازہ پر پورے اتر آئے اس طرح ہم نے تمہیں اپنے لئے (اپنے خاص کام کے لئے) بنایا اور تیار کیا ہے۔

"علی قدر" سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قیادت قوم کے لئے خاص سانچے اور اندازہ کے مطابق بننا پڑتا ہے جب کہیں جا کر لیاقت پیدا ہوتی ہے اور قدرت کی جانب سے انتخاب ہوتا ہے۔[1]

دوسری آیت یہ ہے جس سے مذکورہ مفہوم کی اشارۃً تائید ہوتی ہے۔

قل لو شاء الله ما تلوته عليكم ولا ادرٰكم به فقد لبثت فيكم عمرا من قبله افلا تعقلون ۱۰/۱۶

آپ کہہ دیجئے کہ اگر اللہ چاہتا تو میں قرآن تمہیں سناتا ہی نہیں اور تمھیں اس سے خبردار ہی نہ کرتا پھر یہ واقعہ ہے کہ میں اس معاملہ سے پہلے تم لوگوں کے اندر ایک پوری عمر بسر کر چکا ہوں کیا تم سمجھتے بوجھتے نہیں؟

علمائے اخلاق و نفسیات کا اس بات پر اتفاق ہے کہ انسان کے ابتدائی چالیس سال کا زمانہ اخلاق و خصائل کے بننے اور اُبھرنے کا زمانہ ہوتا ہے اور جذبات کے ماہرین کا خیال ہے کہ انسانی دماغ

---

[1] مفسرین نے "علی قدر" کے یہ معنی بیان کئے ہیں

قدر نالك سبيل المعرفة ووقتها فجئت على ذلك القدر (تفسیر عرائس البیان ج ۲ ص ۳) على حد من الكمال المقدر بحسب استعدادك (تفسیر محی الدین ابن عربی ج ۲ ص ۳۶)

اندازہ کیا ہم نے تیرے واسطے معرفت کے راستہ اور اس کے وقت کا پس تو اس اندازہ کے مطابق پورا اُترا اپنی استعداد کے مطابق کمالِ مقدر کی حد پر تو پہنچ گیا۔

کا نشوونما چالیس سال کی عمر میں تکمیل کو پہنچ جاتا ہے[1]۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چالیس سال تک لوگوں میں رہے اس عرصہ میں خاص سانچہ کے مطابق آپ کی تربیت ہوئی اور خاص اندازہ کے مطابق اعمال و اخلاق ڈھلے پھر کہیں جاکر نبوت کا اعلان ہوا۔

دوسری صلاحیت ہے۔

قائدین میں صلاحیت کام اور مقام کی مناسبت سے ہونی چاہیئے

قائدین میں صلاحیت ان کے کام اور مقام کی مناسبت سے ہونی چاہیئے وہ دراصل روح اور دل کے طبیب ہوتے ہیں ان کا کام طبیعت کی اصلاح و درستی ہے مزاج اور ذہنیت کو بدلنا ہے۔ اس بنا پر ان میں ایسی صلاحیت درکار ہے کہ مرض کی صحیح تشخیص کر کے اس کا صحیح علاج تجویز کرسکیں، قومی مزاج اور وقت کی اہم ضروریات کو سمجھ کر اصلاح و انقلاب کا بیڑا اٹھا سکیں۔

جس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ طبیب کے پاس ایک ہی مرض کے دو مریض آتے ہیں ایک کے لئے وہ سرد دوا اور گرم غذا تجویز کرتا ہے اور دوسرے کے لئے گرم دوا اور گرم غذا۔ مقصد ایک ہے وہ یہ کہ طبیعت میں قوتِ مدافعت پیدا کر کے مرض کو دور کرنا لیکن مزاج کے اختلاف کی بنا پر دوا اور غذا کی تشخیص و تجویز میں اختلاف ہوتا ہے۔

بعینہٖ یہی صورت قائدین کی سمجھنا چاہیئے جس طرح فرد و افراد کے مزاج میں یکسانیت نہیں ہوتی ہے اسی طرح قوم و اقوام کے مزاج میں بھی یکسانیت نہیں پائی جاتی ہے۔ (کیوں کہ مزاج بنانے والے مؤثرات و محرکات ہر قوم میں کسی نہ کسی حد تک مختلف ہوتے ہیں[2]۔) اور جس طرح

---

[1] فلسفۂ جذبات ص۲۶ [2] خاندان، جغرافیانہ ماحول، آب و ہوا، رسم و رواج، عادات و اطوار وغیرہ مزاج بنانے میں سب دخل رکھتے ہیں، اصل یہ ہے کہ نفس کی اثر پذیری کا معاملہ بڑا نازک اور نہایت لطیف ہے، انسان شعوری و غیر شعوری طور پر کن کن چیزوں سے اور کس کس طرح متاثر ہوتا رہتا ہے اس کا ٹھیک ٹھیک پتہ لگانا بہت دشوار ہے نفسیین اور اجتماعیین نے اس سلسلہ میں کافی پیش رفت کی ہے اس کے باوجود ابھی انھیں بہت کچھ کرنا باقی ہے۔

اختلاف مزاج کی بنا پر گرمی و سردی کا لحاظ افراد میں کیا جاتا ہے اسی طرح اقوام و جماعات میں بھی کرنا لازمی ہے اس کے بغیر کوئی تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی ہے انبیاء علیہم السلام کا شرائع اور منہاج میں جو اختلاف نظر آتا ہے اس کی بنیادی وجہ یہی قومی مزاج کا اختلاف ہے کیوں کہ ہر ملک اور ہر عہد کے حالات مختلف ہوتے ہیں جس کی بنا پر ہر قوم کا مخصوص مزاج بنتا ہے اور اس کی رعایت ضروری سمجھی جاتی ہے۔ درج ذیل آیت میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے:۔

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ہر امت کے لئے ہم نے الگ الگ شریعت اور راستہ بنایا۔

۵/۴۸

یہ اصل کا اختلاف نہیں ہے فرع کا ہے حقیقت کا نہیں ہے ظاہری شکل و صورت کا ہے اس کی حیثیت وہی ہے جو انسان کے معاشرتی اور طبعی اختلاف کی ہوتی ہے۔[1]

اسی بنا پر مبصرین نے رسول اللہؐ کے اعمال و افعال کی دو قسمیں کی ہیں (۱) وہ کہ آپ نے بطور عادت کئے ہیں۔ (۲) وہ کہ آپ نے بطور عبادت کئے ہیں۔ پہلی قسم کو قانونی حیثیت حاصل نہیں ہے ان کی صرف روح کو سمجھنا کافی ہے۔ دوسری قسم کو قانونی حیثیت حاصل ہے اور ہر جزئیہ و کلیہ پر عمل کرنا ضروری ہے۔[2]

قومی مزاج اور حالات کے پیشِ نظر قائدین کو رفتہ رفتہ قدم اٹھانے کی ضرورت ہے

اور اسی بنا پر قائدین کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ عارضی طور پر قوم کو ان مباح اور جائز باتوں سے روک دے جو غلط استعمال کی وجہ سے برائیوں کا ذریعہ بن گئی ہوں۔

اس اصول کا ثبوت درج ذیل آیت سے ہوتا ہے

---

[1] شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اس موضوع پر نہایت نفیس بحث کی ہے اور خاص انداز سے سمجھانے کی کوشش کی ہے ملاحظہ ہو حجۃ اللہ البالغہ ج ا ص ۸۵ تا ۹۱ و ۱۲۱ اور الفوز الکبیر ص ۸ [2] حجۃ اللہ البالغہ ج ا ص ۱۲۷ [3] اس کا ثبوت رسول اللہ کی زندگی میں کئی طریقوں سے ملتا ہے مثلاً آپ نے کچھ دنوں کے لئے شراب کے برتنوں کے استعمال سے روک دیا تھا اور عورتوں کو زیارت قبور سے منع فرما دیا تھا وغیرہ

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ﴿۴/۱۵۹﴾

یہودیوں کے ظلم کی وجہ سے ہم نے کئی ایک اچھی چیزیں ان پر حرام کر دیں جو (پہلے) ان کے لئے حلال تھیں اور نیز اس وجہ سے کہ وہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے بہت روکنے لگے تھے۔

غور سے دیکھا جائے تو یہ اصول سماجی زندگی کی اصلاح کے سلسلہ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اور جدید دنیا کے پیدا کئے ہوئے کئی مسائل اس کے ذریعہ حل کئے جا سکتے ہیں۔

اسی طرح قائدین کے لئے یہ بات ضروری ہے کہ ابتدا میں ان باتوں سے اعراض وچشم پوشی کریں جو عوامی زندگی میں انتشار وافتراق کا سبب بنیں یا ان کی وجہ سے سماجی زندگی کے مختل ہونے کا اندیشہ ہو۔ اور ابتدائی دعوت صرف انھیں باتوں کی طرف ہو جو سب میں مشترک ہوں۔ حطیم خانۂ کعبہ کا ایک حصہ تھا اور کعبہ سے علیحدہ تھا اس کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کعبہ کے ساتھ شامل کرنے کا حکم نہیں دیا اور اس کی وجہ یہ فرمائی کہ

لولا حداثۃ عھد قومك باللہ لنقضت الکعبۃ ولجعلتھا علیٰ اساس ابراھیم[1]

اگر تیری قوم نئی نئی کفر سے اسلام کی طرف نہ آئی ہوتی تو میں کعبہ کو توڑ کر اساس ابراہیم پر اس کی تعمیر کراتا۔

---

[1] اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ کسی قوم کا رسم ورواج جو صدیوں سے چلا آرہا ہو دفعۃً نہیں مٹایا جا سکتا بلکہ آہستہ آہستہ رفتہ رفتہ اس میں اصلاح ہوتی ہے غلامی کا رواج مدتوں سے چلا آرہا تھا اور انسانوں کا ایک بڑا طبقہ موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا تھا اسلامی تعلیمات نے اس رسم کے دور کرنے کی پوری کوشش کی خلفاء راشدین نے اس کوشش کو آخری حد تک لے جانے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا لیکن بعد کی سلطنتوں نے اس تعلیم کی غایت کو نظر انداز کر دیا اور بعض ناجائز خواہشات کی طرح غلامی کا سلسلہ بھی قایم رہا اگرچہ غلامی کی نوعیت میں بہت کچھ تبدیلی ہو گئی۔

یہاں اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ کسی نظام فکر وعمل پر تحقیقی نظر ڈالنے کے لئے مقامی وعہدی حالات کا جائزہ لینا نہایت ضروری ہے اس کے بغیر نہ وہ نظام سمجھ میں آسکتا ہے اور نہ ہی اس کا انقلابی کارنامہ۔ ہوتا یہ ہے کہ آج کے دماغ اور آج کی فضا کو سامنے رکھ کر ہزاروں سال پہلے کے اجتماعی اور سماجی اصلاح کے مسائل پر تنقیدیں شروع کر دی جاتی ہیں نہ اُس وقت کے حالات کا پتہ ہوتا ہے اور نہ مزاج کا۔

کر دا ساسِ ابراہیم میں حطیم خانہ کعبہ میں شامل تھا بعد میں جب اس کی تعمیر ہوئی تو خرچ کی کمی کی وجہ سے الگ کر دیا گیا تھا) نووی شارح مسلم نے اس حدیث سے چند مسائل نکالے ہیں۔ (۱) بڑی چیز کی خاطر چھوٹی چیزوں کو قربان کر دینا چاہیئے۔

(۲) تالیفِ قلب کا حتی الامکان خیال رکھنا چاہیئے۔

(۳) کسی ایسی چیز سے تعرض نہ کرنا چاہیئے جو زیادہ اہم نہ ہو لیکن قومی رغبت کی بنار پر اس کی وجہ سے نفرت کا اندیشہ ہو[۱]

قرآنِ حکیم میں رسول اللہ کی دعوت یہ مذکور ہے۔

یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم [پ ۳] — اے اہل کتاب تم اختلاف و نزاع کو چھوڑ کر اس بات کی طرف آجاؤ جو سب میں مشترک ہے۔

غلامی اسلامی مزاج کے خلاف ہے جن لوگوں نے اسلامی معاشرہ کا تحقیق و بصیرت کی روشنی میں مطالعہ کیا ہے وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ اسلام ایک لمحہ کے لئے اس کو برداشت کرنے کے واسطے تیار نہیں اس کے باوجود رسول اللہ نے ابتدا میں رواجِ غلامی کے منسوخ ہونے کا حکم نہیں صادر فرمایا اگرچہ ضمنی طور پر خاتمہ کی بہت سی شکلیں بتائیں۔ اور غلاموں کو اتنا زیادہ بلند کر دیا کہ غلامی آقائی میں تبدیل ہوگئی۔

اگر رسول اللہ ابتدا میں منسوخ فرما دیتے تو سماجی زندگی مختل ہو جاتی اور انسانوں کا ایک بڑا طبقہ کیڑے مکوڑوں کی طرح زندگی گذارنے پر مجبور ہو جاتا۔ نہ کھانے پینے کا کوئی سہارا ہوتا اور نہ رہنے سہنے کا کوئی بندوبست[۲]

قرآنِ حکیم میں قائدین کی صلاحیت کا تذکرہ اور لفظ حکم کی تشریح

حاصل یہ کہ قائدین میں ایسی صلاحیت ہونی چاہیئے کہ بدلے ہوئے حالات کے نشیب و فراز اور قومی مزاج کو سمجھ کر اپنا مقام متعین کر سکیں اور صحیح راہِ عمل تلاش کر کے تحریک کو آگے لے جاسکیں۔

---

[۱] مسلم ج ۱ ص ۴۲۹ [۲] نووی ج ۱ ص ۴۲۹۔

قرآن حکیم نے اس قسم کی صلاحیت کو تین لفظوں سے ادا کیا ہے (۱) حکم (۲) حکمت اور (۳) علم تاویل الاحادیث۔ محل اور موقف کے لحاظ سے ان تینوں کے مختلف درجے اور مرتبے ہیں انبیاء علیہم السلام میں یہ تینوں کامل ترین اور اعلیٰ ترین درجہ پر پائے جاتے ہیں اور قائدین میں اُس سے کمتر درجہ پر۔ ائمہ لغت اور مفسرین کی تصریحات کے مطابق ہر ایک کی تشریحات حسب ذیل ہے۔

(۱) حکم۔ قرآن حکیم میں ہے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ ﴿﴾

کسی انسان کو یہ بات سزاوار نہیں کہ اللہ اسے کتاب حکم اور نبوت عطا فرمائے اور پھر اس کا شیوہ یہ ہو کہ لوگوں سے کہے خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ بلکہ چاہیے کہ ربانی انسانی بنو

امام راغب اصفہانی کہتے ہیں۔

والحکم بالشیء ان تقضی بالشیء بانہ کذا او لیس کذا سواء الزمت ذلک غیرہ او لم تلزمہ [1]

کسی شی پر حکم کرنے کا مطلب یہ فیصلہ کرنا ہے کہ یہ شی ایسی ہے یا ایسی نہیں ہے اس سے بحث نہیں کہ دوسرے کو اس فیصلہ کا پابند کر سکو یا نہ کر سکو۔

عربی لغت کی مشہور کتاب لسان العرب میں ہے

الحکم العلم والفقہ والقضاء بالعدل [2]

حکم کے معنی علم۔ سمجھ بوجھ اور منصفانہ فیصلہ کرنا۔

مفسرین نے حکم کی تفسیر۔ سمجھ بوجھ قوتِ فیصلہ حکمت وغیرہ الفاظ سے کی ہے [3]۔ آیت

---

[1] مفردات القرآن ص ۱۲۶ [2] لسان العرب ج ۱۵ از سیرۃ النبی ج ۴ [3] ملاحظہ ہو تفسیر خازن و مدارک و حسینی و جلالین وغیرہ۔

کہ "اساس ابراہیم میں حطیم خانہ کعبہ میں شامل تھا بعد میں جب اس کی تعمیر ہوئی تو خرچ کی کمی کی وجہ سے الگ کر دیا گیا تھا) نووی شارح مسلم نے اس حدیث سے چند مسائل نکالے ہیں۔ (۱) بڑی چیز کی خاطر چھوٹی چھوٹی چیزوں کو قربان کر دینا چاہیئے۔

(۲) تالیفِ قلب کا حتی الامکان خیال رکھنا چاہیئے۔

(۳) کسی ایسی چیز سے تعرض نہ کرنا چاہیئے جو زیادہ اہم نہ ہو لیکن قومی رغبت کی بناء پر اس کی وجہ سے نفرت کا اندیشہ ہو[۱]

قرآنِ حکیم میں رسول اللہ کی دعوت یہ مذکور ہے۔

یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم ۳ع | اے اہل کتاب تم اختلاف و نزاع کو چھوڑ کر اس بات کی طرف آجاؤ جو سب میں مشترک ہے۔

غلامی اسلامی مزاج کے خلاف ہے جن لوگوں نے اسلامی معاشرہ کا تحقیق و بصیرت کی روشنی میں مطالعہ کیا ہے وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ اسلام ایک لمحہ کے لئے اس کو برداشت کرنے کے واسطے تیار نہیں اس کے باوجود رسول اللہ نے ابتداء میں رواجِ غلامی کے منسوخ ہونے کا حکم نہیں صادر فرمایا اگرچہ ضمنی طور پر خاتمہ کی بہت سی شکلیں بتائیں۔ اور غلاموں کو اتنا زیادہ بلند کر دیا کہ غلامی آقائی میں تبدیل ہو گئی۔

اگر رسول اللہ ابتداء میں منسوخ فرما دیتے تو سماجی زندگی مختل ہو جاتی اور انسانوں کا ایک بڑا طبقہ کیڑے مکوڑوں کی طرح زندگی گذارنے پر مجبور ہو جاتا۔ نہ کھانے پینے کا کوئی سہارا ہوتا اور نہ رہنے سہنے کا کوئی بندوبست[۲]

قرآنِ حکیم میں قائدین کی صلاحیت کا تذکرہ اور لفظ حکم کی تشریح

حاصل یہ کہ قائدین میں ایسی صلاحیت ہونی چاہئے کہ بدلے ہوئے حالات کے نشیب و فراز اور قومی مزاج کو سمجھ کر اپنا مقام متعین کر سکیں اور صحیح راہ عمل تلاش کر کے تحریک کو آگے لے جاسکیں۔

---

[۱] مسلم ج ۱ ص ۴۲۹ [۲] نووی ج ۱ ص ۴۲۹۔

قرآن حکیم نے اس قسم کی صلاحیت کو تین لفظوں سے ادا کیا ہے (۱) حکم (۲) حکمت اور (۳) علم تاویل الاحادیث ۔ محل اور موقف کے لحاظ سے ان تینوں کے مختلف درجے اور مرتبے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام میں یہ تینوں کامل ترین اور اعلیٰ ترین درجہ پر پائے جاتے ہیں اور قائدین میں اُس سے کمتر درجہ پر۔ ائمہ لغت اور مفسرین کی تصریحات کے مطابق ہر ایک کی تشریحات حسب ذیل ہے۔

(۱) حکم ۔ قرآن حکیم میں ہے ۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ ۳/۴

کسی انسان کو یہ بات سزاوار نہیں کہ اللہ اسے کتاب حکم اور نبوت عطا فرمائے اور پھر اس کا شیوہ یہ ہو کہ لوگوں سے کہے خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ بلکہ چاہیے کہ ربانی انسان بنو

امام راغب اصفہانی کہتے ہیں ۔

والحکم بالشیٔ ان تقضی بالشیٔ بانہ کذا اولیس کذا سواء الزمت ذلک غیرہ اولم تلزمہ[1]

کسی شی پر حکم کرنے کا مطلب یہ فیصلہ کرنا ہے کہ یہ شی ایسی ہے یا ایسی نہیں ہے اس سے بحث نہیں کہ دوسرے کو اس فیصلہ کا پابند کر سکو یا نہ کر سکو۔

عربی لغت کی مشہور کتاب لسان العرب میں ہے

الحکم العلم والفقہ والقضاء بالعدل[2]

حکم کے معنی علم ۔ سمجھ بوجھ اور منصفانہ فیصلہ کرنا۔

مفسرین نے حکم کی تفسیر ۔ سمجھ بوجھ قوتِ فیصلہ حکمت وغیرہ الفاظ سے کی ہے[3]۔ آیت

---

[1] مفردات القرآن ص ۱۲۶ [2] لسان العرب ج ۱۵ از سیرۃ النبی ج ۴ [3] ملاحظہ ہو تفسیر خازن و مدارک و حسینی و جلالین وغیرہ۔

کے رائے وقوع سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔ کیوں کہ مذکورہ آیت میں تین چیزوں کا ذکر ہے (۱) کتاب (۲) حکم اور (۳) نبوت۔ بشر سے مراد یا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں یا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دونوں صورتوں میں حکم کے معنی حکومت اور سلطنت کے نہیں ہو سکتے ہیں کیوں کہ حضرت عیسیٰؑ کو تو حکومت کا شائبہ بھی نہیں ملا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نزول آیت کے زمانہ تک حکومت نہیں ملی تھی۔ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی ہے جب کہ اسلام کمزور وناتواں تھا اور یہودیوں کی پوری قوت مدینہ کے اطراف میں موجود تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں حکم سے مراد کتاب اور نبوت ہی کی جنس سے کوئی چیز ہو سکتی ہے اور وہ وہی ہے جس کی تفصیل اوپر گذر چکی۔ مذکورہ آیت سے یہ بات ثابت ہوئی کہ انبیاء کی دعوت ربانی انسان بننے کی طرف ہوتی ہے، اس سے قائدین کی دعوت و تبلیغ کا مقام متعین ہوتا ہے۔ ربانی انسان وہ ہے جو اللہ کی صفات کے ساتھ متصف ہو، یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ رسول اللہ نے فرمایا تھا تخلقوا باخلاق الرحمٰن۔

حکمت کی تشریح اور اس سے صلاحیت پر استدلال

(۲) حکمت۔ قرآن حکیم میں تقریباً سبھی انبیاء علیہم السلام کے تذکرہ میں حکمت کا لفظ آیا ہے اور اس بات کا کہ حکمت دوسرے انسانوں کو بھی ملتی ہے مثلاً

یوتی الحکمۃ من یشاء ومن — اللہ جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے اور

یوت الحکمۃ فقد اوتی خیراً کثیراً ۲/۲۶۹ — جس کو حکمت کی دولت مل گئی اس کو بڑی دولت (بھلائی) دی گئی۔

حکمت کی تشریح یہ ہے۔ یعنی حکمت ملنے سے انبیاء اور رسل کی خلافت عطا ہوئی یہ سب سے بڑی دولت ہے۔

امام راغب اصفہانی کہتے ہیں

والحکمۃ اصابۃ الحق بالعلم — علم اور عقل کے ذریعہ سچی اور صحیح بات کو پہنچنا

والعقل[1] حکمت ہے

لسان العرب میں ہے

والحکمۃ عبارۃ عن معرفۃ افضل الاشیاء بافضل العلوم[2] — افضل اور بہترین چیز کو بہترین علم کے ذریعہ جاننا حکمت ہے

مفسرین کہتے ہیں

(۱) حکمت کے معنی قول اور عمل میں درستی الاصابۃ فی القول والعمل۔

(۲) ہر شئے کو اس کے مناسب محل میں رکھنے کی صلاحیت، وضع کل شئی موضعہ

(۳) اشیاء کے حقائق کی معرفت "معرفۃ الاشیاء لحقائقھا"

(۴) حق و باطل کے درمیان فیصلہ کی قوت "الفصل بین الحق والباطل"[3]

(۵) وہ معارف و احکام جن سے نفوسِ انسانی کمال کو پہنچیں "ما یکمل نفوسھم من المعارف والاحکام"

(۶) ان کے علاوہ اور بہت سے معنی مفسرین سے منقول ہیں مثلاً انوارِ قلوب کی معرفت اسرارِ عیوب سے واقفیت نفس اور شیطان کی دقیقہ رسی سے آگاہی ۔ شیطانی اور انسانی تقاضوں میں امتیاز کی قوت ۔ عقل کی رہنمائی اور قلب کی بصیرت ۔ برائیوں کی صحیح نشان دہی کر کے علاج کی صحیح تدبیریں ۔ مخلوق کے احوال کا علم ۔ خاص قسم کی فراست (قیافہ شناسی) وغیرہ[4] ۔ علامہ ابن مسکویہ نے حکمت کے تحت حسب ذیل چیزیں بیان کی ہیں ۔ زکاوت و ذہانت ۔ تعقل ۔ سرعتِ فہم ۔ قوتِ فہم ۔ ذہن کی صفائی ۔ سہولتِ تعلم پھر اس کے بعد کہتے ہیں

وبھذہ الاشیاء یکون حسن — انھیں چیزوں کے ذریعہ حکمت کی حسنِ استعداد

---

[1] مفردات القرآن ص۱۲۶ [2] لسان العرب ج ۱۵ از سیرۃ النبی ج ۴ [3] تفسیر خازن ص۸۶ تفسیر مظہری ص۲۲ [4] ملاحظہ ہو عرائس البیان فی حقائق القرآن ص۶۰

اِلّا استعداد للحکمۃ[1] پیدا ہوتی ہے۔

حاصل یہ کہ حکمت عقل و فہم کی ایک ایسی قوت کا نام ہے کہ اس کے ذریعہ انسان حقائق کی معرفت کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور نظر خلق انسانی کی تہذیب پر مرکوز ہوتی ہے۔

(۳) تاویل الاحادیث۔

تاویل الاحادیث سے صلاحیت پر استدلال	حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں آیا ہے وَیُعَلِّمُكَ مِنْ تَاوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ	اور تیرا رب یہ بات سکھلانے والا ہے کہ باتوں کا مطلب اور نتیجہ کیوں کر ٹھہرایا جائے۔

عربی میں تاویل کے معنی کسی بات کے نتیجہ اور مآل کے ہیں چوں کہ الفاظ کے معانی بھی ان کی دلالت کا مآل اور مصداق ہوتے ہیں اس لئے مطالب و معانی پر بھی اس کا اطلاق ہونے لگا۔

مفردات القرآن میں امام راغبؒ کہتے ہیں

"تاویلؔ اول سے بنا ہے جس کے معنی اصل کی طرف رجوع کرنا مؤل اس جگہ کو کہتے ہیں جس کی طرف رجوع کیا جائے اس بنا پر تاویل کے معنی شی کو اس کے اصل مقصد کی طرف لوٹانا علمی طریقے پر ہو یا عملی طریقے پر علمی کی مثال "وما یعلم تاویلہ الا اللہ" اور عملی کی مثال "ھل ینظرون الا تاویلہ یوم یاتی تاویلہ ای بیانہ الذی ھو غایتہ المقصود منہ"[2]

زجاج نے تاویل الاحادیث کا یہ مطلب بیان کیا ہے،

"انبیاء اور امم سابقہ کے اقوال و احوال کے مآل اور مصداق کو سمجھنا کتب منزلہ کے مفہوم و مطالب کو پہنچنا۔"[3]

ع یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ تاویل کے مذکورہ معنی اس کی ساخت اور اصل استعمال کے اعتبار سے ہیں بعد میں جو تبدیلی ہوئی اور اصل سے ہٹ کر جس مفہوم میں استعمال ہونے لگا اس سے ہمیں بحث نہیں البتہ اتنا ہم جانتے ہیں کہ اس لفظ کے غلط استعمال نے اسلامی زندگی کی چولیں ہلا دیں اور ایسے فتنوں کا دروازہ کھول دیا کہ ان کے بند کرنے کے لیے زبردست انقلاب کے بغیر چارہ نہیں ہے۔

[1] تہذیب الاخلاق ص۳ [2] مفردات القرآن و حاشیہ شیخ زادہ علی تفسیر البیضاوی ج ۲ [3] تفسیر خازن ج ۳

ابن زید کہتے ہیں

"تاویل الاحادیث سے مراد علم وحکمت ہے"[1]

یعنی علم وبصیرت کی ایسی قوت پیدا ہو کہ معاملات کی کُنہ تک پہنچ جائے، بات کے مطلب اور مآل کو پالے، امور وجہات کے بھیدوں کا روشناس بن جائے غرض ہر الجھی ہوئی گتھی کو اس طرح سلجھا دے کہ ساری باتوں کی کل درست ہو جائے۔

قیادت کی صلاحیت کے لئے دماغی وجسمانی قابلیت کی ضرورت ہے نہ کہ مال ودولت اور نسل وخاندان کا شرف

جو لوگ مال ودولت کی وسعت اور خاندان کی شرافت میں قیادت کی صلاحیت دیکھتے تھے درج ذیل آیت میں اللہ نے ان کی تردید فرمائی اور اس کے لئے دو چیزیں ضروری قرار دیں (۱) علم کی قوت (۲) اور جسم کی قوت (دماغی وجسمانی قابلیت)

وزادہ بسطۃ فی العلم والجسم ۲/۲۴۷ اللہ نے علم اور جسم دونوں میں طالوت کو وسعت دی۔

ظاہر ہے کہ یہاں علم سے مراد کوئی خاص اصطلاحی علم نہیں ہے بلکہ کام کی مناسبت سے عقل وذہانت فہم وتدبیر وغیرہ مراد ہیں اسی طرح جسم سے اُس کی لمبائی چوڑائی سے بحث مقصود نہیں ہے بلکہ صورت وسیرت کا اعتدال اور اندرونی قویٰ کی پختگی ومضبوطی مراد ہے۔

اسی بناء پر فخر الدین رازیؒ نے ان دونوں سے وہ کمالاتِ حقیقیہ مراد لیئے ہیں جو جوہرِ انسانی کو حاصل ہوتے ہیں[2] انبیاء کے تذکرہ میں بھی علم کا ذکر آتا ہے اور بعض کو بچپن ہی میں علیم کا خطاب ملا ہے مثلاً

وبشروہ بغلٰم علیم ۵۱/۲۸ انا نبشرک بغلٰم علیم ۱۵/۵۳ اس سے بھی علمی قوت اور ذکاوت وذہانت ہی وغیرہ مراد ہیں کیوں کہ وحی کا علم تو بعد میں حاصل ہونا تھا۔

یہ دیکھا گیا ہے کہ نفسیاتی طور پر انسان کی ظاہری ساخت اور صورت شکل کا بھی کافی اثر

---

[1] تفسیر خازن ج ۳ [2] تفسیر کبیر صفحہ ۲۸۹

پڑتا ہے نیز قیادت کے فرائض انجام دینے کے لئے ذہنی قویٰ کی مضبوطی کے ساتھ ساتھ جسمانی قویٰ کی مضبوطی بھی درکار ہوتی ہے اس بنا پر آیت میں علم کے ساتھ جسم کا ذکر آیا ہے

(۳) تیسری فنائیت ہے

فنائیت یہ ہے کہ قائدین کے سارے دل اور ساری روح میں بس نظریۂ حیات کا عشق سمایا ہوا ہو

فنائیت کا مطلب یہ ہے کہ قائدین جس نظریۂ حیات کی طرف قوم کو دعوت دیتے ہیں وہ ان کے دل و دماغ میں اس قدر رچ بس گیا ہو کہ اس میں اب کسی اور کی گنجائش نہ باقی رہ گئی ہو یعنی ان کے سارے دل اور ساری روح میں بس اسی کا عشق سمایا ہوا ہو اور اسی کی نشر و اشاعت کو ہر شی سے زیادہ محبوب رکھتے ہوں اس راہ میں دنیا کا خوف حکومت کا ڈر جان و مال کی محبت اعزہ و اقربار کی ملامت غرض کسی مصیبت کی پرواہ نہ ہو ان کو۔ اور نہ کوئی بڑی سے بڑی توقع اس راہ سے انھیں ہٹا سکتی ہو انبیار کرام کی زندگی کا گوشہ گوشہ فنائیت کے اونچے سے اونچے نمونہ کی مثال پیش کرتا ہے قرآنِ حکیم میں جو واقعات بیان ہوتے ہیں ان سے بھی اسی حقیقت کا پتہ چلتا ہے۔

داعیِ انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہمارے سامنے ہے ایک طرف ہر بڑی سے بڑی تکلیف کا مظاہرہ ہے اور دوسری طرف ہر اونچی سے اونچی خواہش کی تکمیل کا وعدہ۔ اس کے باوجود آپ فرماتے ہیں کہ "اگر میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے پر چاند رکھ دیا جائے جب بھی اس راہ سے نہ ہٹوں گا" یعنی اس سلسلہ میں محال و ناممکن کو بھی ممکن بنا دیا جائے جب بھی میرے قدم نہ رکیں گے میرے پائے استقامت کو لغزش نہ آئے گی۔ (باقی آئندہ)

صراطِ مستقیم

ادبیات

غزل

از
(جناب آلم مظفرنگری)

لذتِ غم مئے سرجوش ہوئی جاتی ہے
جھوم کر روح بھی مدہوش ہوئی جاتی ہے

خلد رضوان مری آغوش ہوئی جاتی ہے
اشکِ گلرنگ سے گل پوش ہوئی جاتی ہے

آئی ہے کون سے مےخانے سے کھنچ کر ساقی
مے ۔ کہ جزو لبِ مے نوش ہوئی جاتی ہے

کیا کہوں کس لئے آمادۂ نالہ ہو کر
فطرتِ عشق جفا کوش ہوئی جاتی ہے

پردۂ سازِ غمِ عشق کی ہر اک آواز
خود بخود محشرِ خاموش ہوئی جاتی ہے

قافلے بانگِ درا سمجھے ہوئے تھے جس کو
اب وہ آوازِ بھی خاموش ہوئی جاتی ہے

خاکِ پروانہ کہے گی شبِ غم کی روداد
ہوتے دو شمع جو خاموش ہوئی جاتی ہے

منزلِ گورِ غریباں یہ بتادے ۔۔ دنیا
کیوں تری خاک ہیں روپوش ہوئی جاتی ہے

پھر اٹھی خلوتِ الہام سے کوئی آواز
بزم ہستی ہمہ تن گوش ہوئی جاتی ہے

جس نے سمجھا ہے مقاماتِ خودی کو وہ قوم
رفعتِ عرش کی ہم دوش ہوئی جاتی ہے

کون اب نظمِ دو عالم کو سنبھالے گا آلم
ان سے خالی مری آغوش ہوئی جاتی ہے

"حیات ہے نجانے کیا"

از
(جناب شمس نوید)

خرد کو اپنی ابتدار، مآل کی خبر نہیں
جواب کی تلاش ہے سوال کی خبر نہیں
تخیلات کی رسائی روح کائنات تک
مگر ہنوز مرکزِ خیال کی خبر نہیں!
دگا رہی ہے آگہی یقیں پہ تازیانے کیا!
حیات ہے نجانے کیا؟

وہی حسین مسکراہٹوں کا خون سرد ہے
وہی غریب آنسوؤں میں زندگی کا درد ہے
سکون کی تلاش میں بھٹک رہے ہیں قافلے
تھکے ہوئے قدم جبیں پہ صدیوں کی گرد ہے
بدل سکا نہ سوزِ دل، بدل گئے زمانے کیا
حیات ہے سجانے کیا؟

کبھی یہ ٹھوس زندگی سکونِ دل سے دُور ہے
کبھی لطیف خواب بھی کہ بے پئے سرور ہے
کبھی یقینِ زیست دور ہو کے بھی قریب تر
کبھی حیات اس قدر قریب ہو کے دُور ہے
فسانے ہیں حقیقتیں، حقیقتیں فسانے کیا
حیات ہے سجانے کیا؟

شعور آج سرحدِ نگاہ سے بلند ہے
زمین سے بلند مہر و ماہ سے بلند ہے
قدم قدم نئے بلند تر خدا کی جستجو
گناہ کر رہا ہے اور گناہ سے بلند ہے
جبیں میں جذب ہو گئے تمام آستانے کیا
حیات ہے سجانے کیا؟

بجا کہ ذہن میں اوج پر ہے کاروبارِ زندگی
بجا کہ جانِ زیست ہے یہ خلفشارِ زندگی
مگر سکوت نیم شب کی خلوتوں میں گم ہوا
مسائلِ حیات کا خمار "بارِ زندگی
شعورِ ذات ہی میں ہیں سکون کے خزانے کیا
حیات ہے سجانے کیا؟

تبصرے

شاعر بمبئی کا افسانہ نمبر مرتبہ اعجاز صدیقی و مہندر ناتھ صاحبان۔ ضخامت ۲۱۸ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت دو روپیہ پتہ :- مکتبہ قصر الادب پوسٹ بکس نمبر ۵۲۶۴ بمبئی ۔ ۸

شاعر اُردو زبان کا پُرانا اور مشہور ادبی ماہنامہ ہے اُس نے گذشتہ ماہ فروری، مارچ اور اپریل کی تین اشاعتوں کو یک جا کرکے افسانہ نمبر کے نام سے شایع کیا ہے، یہ ایک ادبی سانحہ ہے کہ گذشتہ چند برسوں سے ہماری زبان میں افسانہ نگاری نے نہ صرف یہ کہ کوئی ترقی نہیں کی بلکہ اُس کا رُخ زوال کی طرف ہے اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ افسانہ نگاروں نے ایسے مشاغل زندگی اختیار کرلئے ہیں جن کے باعث نہ اُن کو عالمی ادبیات کا موقع ملتا ہے اور نہ وہ زندگی کے مسائل کا ہمہ جہتی مطالعہ عُمق و تفکر کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ تاہم اس نمبر میں کوشش کی گئی ہے کہ بہتر سے بہتر افسانے شامل کئے جائیں اور یہ کوشش بڑی حد تک کامیاب ہے۔ کرشن چندر - اشک - ل - احمد - مہندر ناتھ پرانے اور مقبول افسانہ نویس ہیں اُن کے علاوہ اور دوسرے لوگوں کے افسانے بھی پڑھنے کے لایق ہیں اس مجموعہ کا بڑا فائدہ یہ ہوگا - کہ اس کے مطالعہ سے افسانہ نگاری کا موجودہ رجحان معلوم ہوگا۔

مشرب کراچی کا تاریخ ادب اردو نمبر مرتبہ جناب ابومسلم صاحب صحافی۔ تقطیع متوسط ضخامت ۹۶۰ صفحات - کتابت و طباعت بہتر قیمت آٹھ روپیہ :- دفتر مشرب - نوری مسجد تین ہٹی کراچی۔

پاکستان کے بعض ماہنامے عجب زندہ دل واقع ہوئے ہیں۔ اپنے سالانہ خاص نمبر ایک ایک ہزار صفحات کے نکالتے ہیں لیکن بڑی خوبی یہ ہے کہ ان خاص نمبروں میں ادھر

ادھر کے مختلف قسم کے مضامین جمع نہیں کر دئے جاتے بلکہ پورا رسالہ کسی ایک موضوع سے متعلق ہی مضامین کا مجموعہ ہوتا ہے اور اس طرح یہ کہنے کو ایک ماہنامہ کا خاص نمبر ہوتا ہے ورنہ در حقیقت ایک خاص عنوان پر ایک انسائکلوپیڈیا ہوتا ہے۔ چنانچہ مشرب کا یہ خاص نمبر تاریخ ادب اردو سے متعلق ہے۔ اس نمبر میں علاوہ غزلوں اور نظموں کے ۵۰ مضامین ہیں جو ادب اُردو کے مختلف مباحث پر لکھے گئے ہیں، لکھنے والوں میں کہنہ مشق ادیب بھی ہیں اور نوجوان اہلِ قلم بھی۔ اس بناء پر نہ سب مضامین کا معیار یکساں ہے اور نہ تاریخی ادوار یا صنفِ شاعری کے اعتبار سے کوئی خاص ترتیب ہے، تاہم تاریخ ادب اُردو کے مختلف مباحث و مسائل سے متعلق بعض بڑے اچھے اور مفید مضامین یک جا ہو گئے ہیں اور جدید ادباء و شعراء کا تعارف ہو گیا ہے۔ بہر حال تاریخی۔ تنقیدی اور سوانحی مضامین و مقالات کا یہ ایک بڑا دلچسپ اور مفید مجموعہ ہے۔ کتاب میں مشاہیر اردو ادب کی شبیہیں بھی جا بجا ہیں اور بعض قیمتی ادبی دستاویزات بھی ہیں، یہ نمبر اس لائق ہے کہ اُردو ادب کے طلباء اور اُس کا ذوق رکھنے والے حضرات اس کا مطالعہ کریں اور ادارۂ مشرب کے کارکنوں کی ہمت و محنت کی داد دیں۔

مشرب کراچی کا مقالات نمبر | حجم ۴۰۰ چار سو صفحات قیمت للعہ

یہ نمبر مذکورۂ بالا تاریخ ادب اردو نمبر کا دوسرا حصہ ہے جو صرف مقالات کے لئے مخصوص ہے۔ اس میں اردو نظم و نثر کا ارتقاء۔ سرحد میں اردو ادب۔ اردو کے آرمینی شاعر۔ دکن میں اُردو شاہنامے کی داستانیں۔ اردو املا۔ اردو علم العروض پر ایک نظر۔ ان کے علاوہ امیر خسروؒ، میر تقی میر۔ مرزا دبیر۔ غالب۔ وحشت۔ افسوس۔ حسرت وغیرہ عنوانات پر سنجیدہ و متین اور پُر از معلومات مضامین ہیں۔ لکھنے والوں میں ڈاکٹر مولوی عبد الحق۔ ڈاکٹر عبد الستار صدیقی پروفیسر محمد حسن عسکری۔ ڈاکٹر زور۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی اور نصیر الدین ہاشمی جیسے مشاہیر اہل قلم اور محققین کے نام شامل ہیں، امید ہے کہ اربابِ ذوق اس کی بھی قدر کریں گے۔

ڈاکٹر اقبال اور اُن کی شاعری | (ہندی) از پروفیسر ہیرالال چوپڑا ایم۔ اے ٹائپ جلی

اور روشن، سائز متوسط۔ ضخامت ۲۰۸ صفحات قیمت بیتے پتہ :- ہندی پرچارک پستکالے بنارس۔

پروفیسر ہیرالال صاحب چوپڑا ایم اے اُردو اور فارسی زبان و ادب کے نامور فاضل اور دونوں زبانوں کے مشہور ادیب اور شاعر ہیں، علامہ اقبال مرحوم کے ساتھ ایک عرصہ تک فیضِ صحبت و مجالست رکھنے کے باعث علامہ کے فلسفہ اور شاعری پر بڑی اچھی اور مبصرانہ نگاہ رکھتے ہیں اور ہزاروں اشعار زبانی بھی یاد ہیں، موصوف نے ہندی خواں حضرات کو علامہ مرحوم اور ان کی شاعری سے روشناس کرانے کی غرض سے ہی یہ کتاب لکھی ہے۔ چنانچہ شروع کے ۳۰ چالیس صفحات میں مرحوم کی مختصر سوانح عمری۔ شاعری کی خصوصیات۔ وطنی اور ملکی خیالات وجذبات اور پھر مرحوم کی نسبت سر عبد القادر کے خیالات کا تذکرہ کیا گیا ہے اور اس کے بعد مرحوم کے اردو کلام سے منتخب کر کے ۸۱ نظمیں دیوناگری رسم الخط میں درج کی گئی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ حواشی میں مشکل الفاظ کے معانی اور تلمیحات کی تشریح بھی کر دی گئی ہے نظموں کے علاوہ چند رباعیات بھی اس مجموعہ میں شامل ہیں۔ اردو اور ہندی دونوں زبانوں کو ترقی دینے اور ان کے باہمی تعلق کو خوش گوار بنانے کے لئے اس بات کی بڑی سخت ضرورت ہے کہ ایک زبان کے ادبی شاہکار اصلاً یا ترجمہ کی شکل میں دوسری زبان میں شائع کئے جائیں، پروفیسر صاحب کی یہ کتاب اس راہ میں بڑا مستحسن اقدام ہے جس پر وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

خلافتِ راشدہ

حصہ دوم تاریخ ملت :- عہد خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے واقعات قدیم و جدید عربی تاریخوں کی بنیاد پر صحت و جامعیت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں یہ کتاب کالجوں اور اسکولوں کے کورس میں داخل ہونے کے لائق ہے۔ جدید ایڈیشن صفحات ۲۷۶ قیمت بیہ، مجلد ۱۲/۳۔

علامہ گیلانیؒ (م جون ۱۹۵۶ء)

- فکر و نظر کی وسعت، علمی جامعیت اور ذہانت میں اپنی مثال آپ تھے۔
- ان کی ژرف نگاہی نے ہر بساطِ علم و فن پر نکات و تحقیقات کے وہ گل کھلائے جو سدا بہار ہیں۔
- انھوں نے تنہا تحقیق و تصنیف کا اتنا کام کیا جتنا یورپ میں ادارے اور انجمنیں کرتی ہیں غرض ـــــ "وہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔"

ماہنامہ **الفرقان** لکھنؤ ـــــ مرحوم کے قدر شناسوں کی خدمت میں ان کی وفات کے ٹھیک ایک سال بعد

افادات گیلانی نمبر

کی شکل میں ایک یادگاری تحفہ جون ۵۷ء میں پیش کر دیا گیا ہے

جو الفرقان میں شائع شدہ علامہ مرحوم کے اُن اہم علمی و تحقیقی مضامین پر مشتمل ہے جو مستقل کتابی شکل میں شائع نہیں ہوئے ہیں

اس نمبر میں :- مولانا مرحوم کا ایک تقریباً سوا سو صفحے کا طویل مقالہ ہے جو بجائے خود ایک قیمتی کتاب اور ان کی جامعیت و ذہانت کی بہترین یادگار ہے ـــــ ایک اُن کے اس مقالہ کی تلخیص ہے جو الفرقان کے مجدد الف ثانی نمبر کی زینت بنا اور اہل علم کی نظر میں مصنف کا عظیم تحقیقی کارنامہ قرار پایا ـــــ اس کے علاوہ بعض سلسلہ وار مضامین کی اہم اقساط ـــــ اور شروع میں مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے قلم سے علامہ مرحوم کی شخصیت پر ایک دل آویز، بصیرت افروز اور جامع مقالہ "نقوش و تاثرات" کے عنوان سے۔

ضخامت :- کم و بیش ۲۰۰ صفحات ـــــ **قیمت** :- ۲ روپیہ علاوہ محصول ڈاک/

سال بھر کے لئے الفرقان کی خریداری قبول کرنے والے حضرات سے سالانہ چندہ پانچ روپے کے علاوہ اس نمبر کی کوئی قیمت نہیں لی جائے گی۔ البتہ رجسٹری فیس کے ۸ر آنے چندہ کے علاوہ لازمی طور پر آنے چاہئیں۔ پاکستانی حضرات ـ سکریٹری ادارہ اصلاح و تبلیغ ـ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کے پتہ پر منی آرڈر کرکے رسید کے ساتھ ہمیں اطلاع دیں۔

ناظم رسالہ الفرقان ـ لکھنؤ

بُرہان

جلد ۳۹ شمارہ ۴

اکتوبر ۱۹۵۷ء مطابق ربیع الاوّل ۱۳۷۷ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

ہماری قومی سیرت کا ایک بڑا کمزور پہلو یہ ہے کہ کسی تحریک میں اس وقت تک جوش و خروش پیدا نہیں ہوتا جب تک کہ اُس کی بنیاد کسی مطالبہ پر اور کسی گروہ یا جماعت یا حکومت کے ساتھ بالواسطہ یا بلاواسطہ مخالفانہ رویہ پر نہ ہو گویا کوئی تحریک خواہ مذہبی ہو یا سیاسی۔ ادبی ہو یا لسانی منفی نقطۂ نظر کے بغیر چل ہی نہیں سکتی اس کا نتیجہ یہ ہے کہ قوم میں تعمیری تحریکوں میں سرگرمی کے ساتھ حصہ لینے کی صلاحیت روز بروز کم ہوتی جارہی ہے۔ اگر آپ کو کسی بات پر حکومت یا کسی شخص کے خلاف مظاہرہ کرانا ہو تو دوچار اخباروں میں کوئی اشتعال انگیز خبر چھپوا دیجئے۔ ہزاروں انسان آپ کے ارد گرد جمع ہو جائیں گے اور پھر اُس وقت جو کام آپ اُن سے لینا چاہیں لے سکتے ہیں۔ لیکن اگر انھیں لوگوں سے کہا جائے کہ فلاں کام کے کرنے سے قوم زندہ اور مضبوط ہوتی ہے۔ مگر وہ کام ٹھنڈے دل و دماغ سے کرنے کا ہے۔ پتّہ مار کر کرنے کا ہے زبان کو بند مگر آنکھوں اور دماغ کو کھلا رکھ کر کرنے کا ہے تو سب لوگ منتشر ہو جائیں گے اور ممکن ہے اُن میں سے بہتیرے آپ کو گالیاں بھی دینے لگیں۔ آزادی سے قبل جب کہ انگریز نشانہ پر تھا کانگرس کیا تھی! لیکن آج جب کہ تعمیر و ترقی کا دور ہے اُس کا کیا حال ہے؟ تقسیم سے پہلے جب کہ ہندو اکثریت کا کابوس لیگ کے دل و دماغ پر مسلط تھا مسلم لیگ کا کیا جاہ و جلال اور طنطنہ تھا لیکن آج وہ کہاں ہے؟ آزادی سے قبل جو لیڈر قوم کے سرتاج تھے آج اُن کی پوزیشن کیا ہے اور ملک میں ان کو کیا وقار حاصل ہے؟ حالانکہ یہ لوگ اگر کل مخلص اور دیانت دار تھے تو آج بھی ان کو ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ اور اگر آج وہ خود غرض اور بد دیانت ہیں تو اُس کا صاف مطلب یہ ہے کہ کل بھی ایسے ہی تھے۔ بہر حال یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ یہ یا وہ قوم کا ایک نہ ایک طرزِ عمل جو اپنے لیڈروں کے ساتھ ہے غلط ہے۔ کیوں کہ خلوص اور خود غرضی دونوں کا تعلق

انسانی جبلت اور فطرت سے ہے اور جبلت کبھی نہیں بدلتی۔

قومی سیرت کی اس کمزوری کا اثر یہ ہے کہ بعض اوقات سنجیدہ فکر و دماغ کے لیڈروں کو بھی عوام کا اعتماد برقرار رکھنے کے لئے ایسی راہ اختیار کرنی پڑتی ہے جس کو وہ خود قوم کے حق میں بہتر نہیں سمجھتے۔ مثلاً اُردو کی جو تحریک آج کل چل رہی ہے اسی کو لیجئے۔ پورے ملک میں اُردو کو علاقائی زبان بنوانے کا شور ہے۔ ہنگامہ ہے۔ پہلے یہ مطالبہ صرف اُتر پردیش کے لئے تھا لیکن اب سی پی۔ بہار۔ اور آندھرا وغیرہ بھی اس میں شامل کرلئے گئے ہیں۔ ۲۴ / ۲۵ / اور ۲۶ / دسمبر کو دلی میں جو آل انڈیا اردو کانفرنس ہورہی ہے اُس کے متعلق اخبارات میں جو خبر چھپی ہے اُس میں بھی منقطع کا بند یہی ہے کہ کانفرنس سے پہلے ایک وفد صدر جمہوریہ سے ملاقات کرے گا اور کانفرنس میں اس ملاقات کی رپورٹ پیش کرے گا۔

اُتر پردیش میں اُردو کو علاقائی زبان بنانے کی تحریک جب شروع ہوئی تھی تو اسی وقت اُردو کے سچے خیر خواہ مگر دور اندیش اصحاب کو اندیشہ تھا کہ اگر صدر جمہوریہ نے یہ درخواست منظور فرما بھی لی تو کہیں اس کا نتیجہ یہ تو نہیں ہوگا کہ صوبہ میں فرقہ پرستی کا طوفان از سر نو امنڈ آئے اور اس کی وجہ سے اقلیت پر عرصۂ حیات تنگ ہوجائے۔ پہلے یہ صرف اندیشہ ہی اندیشہ تھا لیکن کم و بیش چار ماہ سے آج کل جو کچھ پنجاب میں ہورہا ہے اور جس طرح ہورہا ہے اسے دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ یہ اندیشہ بالکل بے بنیاد اور محض خام خیالی ہے۔ بھلا فرقہ پرستی کے اس جنون کا کوئی ٹھکانہ ہے کہ پنجاب میں جھگڑا ہے ہندوؤں اور سکھوں کے درمیان، نزاع ہے ہندی اور گورمکھی کا لیکن خواہ مخواہ اس کی تان ٹوٹ رہی ہے غریب مسلمانوں پر اور نہرو جی اور کانگرس کو طعنے دئے جارہے ہیں مسلم پروری کے۔ پس جب صورت حال یہ ہو تو ہمارے زعماء کو غور کرنا چاہیے کہ اُردو کو علاقائی زبان بنانے پر اس قدر اصرار اور اس کے لئے بار بار صدر جمہوریہ سے عرض معروض اور پھر پبلک میں سب سے زیادہ اسی کو موضوع بحث بنانا اور اس پر گرم گرم تقریریں کرنا کہاں تک مقتضائے مصلحت و عقلمندی ہوسکتا ہے؟

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ دیکھیں کیا گذرے ہے قطرہ پہ گہر ہونے تک

صدرِ جمہوریہ اور اُن کی حکومت فرقہ پرستوں کے جذبات اور اُن کے ارادوں سے بے خبر نہیں ہیں اس لئے جب تک اس طرف سے اطمینان نہیں ہوجاتا۔ آپ ایک نہیں دس میمورنڈم پیش کیجئے۔ بہرحال اُن کا جواب ظاہر ہے۔ تو پھر بھی اس مطالبہ پر اصرار کئے جانا اور اپنی تمام جدوجہد کو اسی ایک نقطہ پر مرکوز رکھنا اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ اقلیت ذہنی طور پر شکست خوردگی اور احساسِ کمتری کا شکار ہو کر رہ جائے۔ اُس کی وجہ سے اُس کے قوائے عملیہ مفلوج ہو جائیں اور اُردو زبان کی اصل تعمیری ضرورتوں کی طرف سے غفلت برتنے لگے۔

آج کل دوسرے اوقاف ایکٹوں کے ساتھ مسلم اوقاف کے مختلف ایکٹ بھی حکومت کے مقرر کردہ لاکمیشن کے زیرِ غور میں ابھی تک یہ نہیں معلوم کہ یہ غور وخوض کس نقطۂ نظر سے کیا جارہا ہے اور اس بات کا بھی علم نہیں ہے کہ اس کمیشن کا ممبر کوئی مسلمان بھی ہے یا نہیں اس بنا پر کوئی قطعی بات تو ابھی نہیں کہی جاسکتی لیکن لاکمیشن کو یہ بتا دینا ضروری ہے کہ جہاں تک مسلم اوقاف کے دروبست اور اُن کے انتظام کا تعلق ہے تو حکومت اُس میں مسلمان نمائندوں کی رائے اور مشورہ سے ایسا تغیر و تبدل کر سکتی ہے کہ جس سے وقف کی آمدنی اور اُس کے صرف میں بے قاعدگی و بے ضابطگی نہ ہو اور اُس کا ایک پیسہ بھی خورد برد نہ ہونے پائے لیکن جہاں تک اوقاف کے مصارف کا تعلق ہے۔ اسلامی احکام کے ماتحت اُن کا واقف کی تعیین و تشخیص کے مطابق رہنا ضروری ہے کسی جماعت یا حکومت کو یہ حق نہیں ہے کہ اُس میں اپنی صوابدید کے مطابق کسی قسم کی ترمیم و تنسیخ کرے مسلم اوقاف کا مسئلہ مسلمانوں کے پرسنل لا کا مسئلہ ہے اس لئے لاکمیشن کو اس پر اسی حیثیت سے غور کرنا چاہیے۔

پچھلے دنوں جنوبی ہند میں ذات پات اور امریکہ کی ایک جنوبی ریاست میں رنگ و نسل کی بنیاد پر جو سخت ہولناک جھگڑے ہوئے وہ جمہوریت اور مساواتِ انسانی کے اس دورِ ترقی میں انسانیت کی پیشانی کا انتہائی بدنما داغ ہیں۔ اے کاش کوئی ان لوگوں کو قرآن کا ارشاد "یَا اَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی" اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان لا فضل لاسود علی احمر ولا لاحمر علی اسود سنا کر یہ باور کرا سکتا کہ محض قانون اور دستور کوئی چیز نہیں ہے جب تک کسی جمہوری نظامِ زندگی کی بنیاد خدا اور یومِ آخرت کے عقیدہ پر اور اُس کے ماتحت مذہب کی بخشی ہوئی اخلاقی قدروں پر نہیں ہوگی وہ جمہوریت

عرب۔شام سرحد، مدینہ سے شام کو جانیوالی دو شاہراہیں
تیماء، اجنادین، مرج الصُفّر، واقوصہ، یرموک
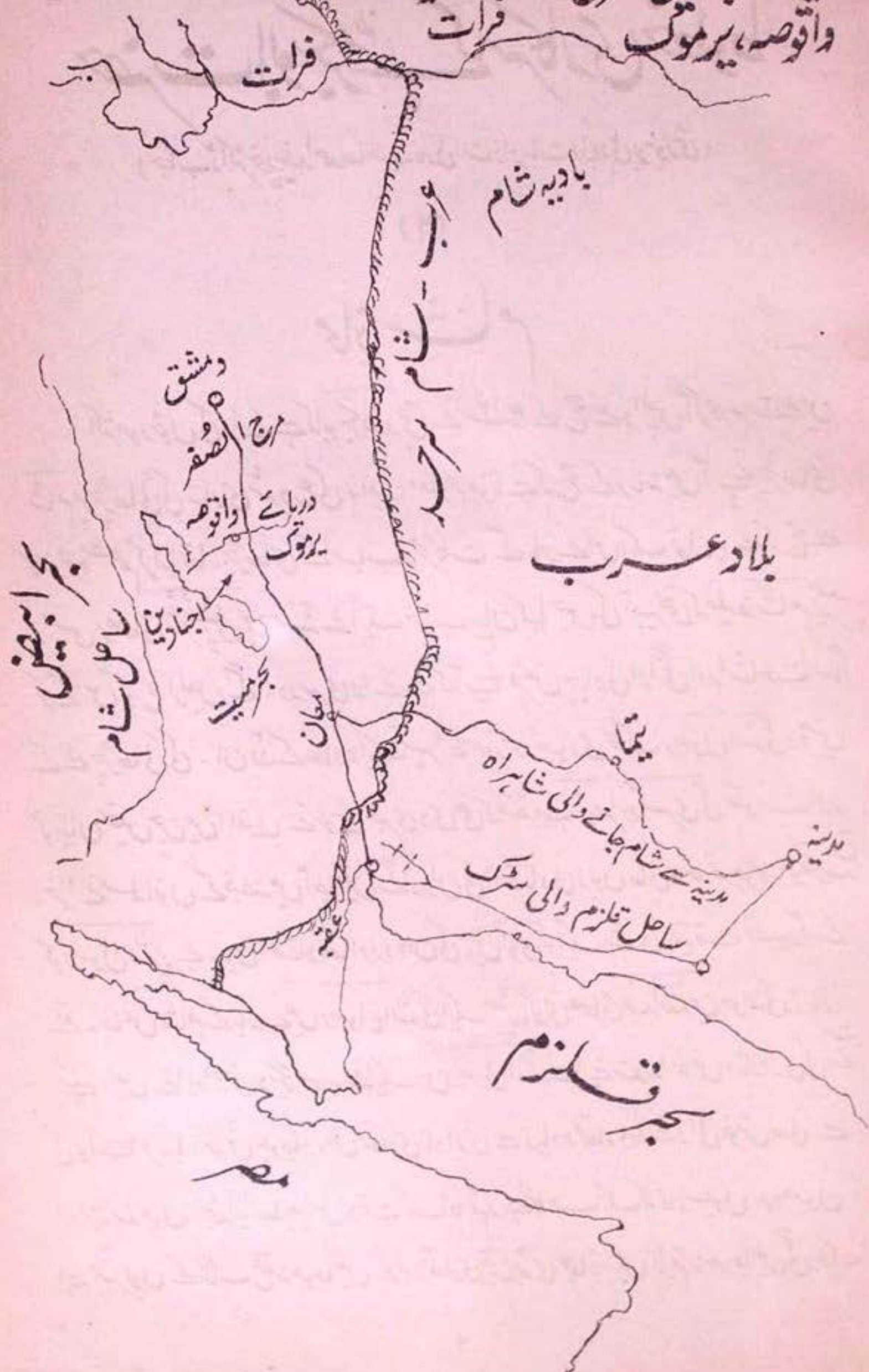
فرات

فرات

بادیہ شام

عرب۔شام سرحد

دمشق

مرج الصُفر

دریائے یرموک

واقوصہ

بلاد عرب

بحر ابیض

ساحل شام

اجنادین

بحر میت

معان

تیما

مدینہ سے شام جانے والی شاہراہ

مدینہ

ساحل قلزم والی سڑک

عقبہ

بحر قلزم

مصر

حضرت ابوبکرؓ کے سرکاری خطوط

از

(جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب فارق استاذ ادبیات عربی دہلی یونیورسٹی)

(۶)

محاذِ شام

اکثر مورخوں کی رائے ہے کہ ابوبکر صدیق نے سنہ ۱۲ھ کے حج سے واپس آکر محرم ۱۳ھ میں شام پر چڑھائی کی تیاری شروع کی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حج کے زمانہ میں آپ نے چڑھائی کا ارادہ مصمم کرلیا تھا۔ چڑھائی کے اسباب ومحرکات کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ حج سے واپسی پر صحابی شرحبیل بن حسنہ نے ایک خواب بیان کیا جس کی تعبیر تھی کہ خلیفہ شام پر حملہ کرکے اس کو فتح کرلیں گے۔ دوسری رائے ہے کہ آپ نے فرض جہاد کی ادائگی اور اشاعتِ اسلام کے لئے چڑھائی کی۔ اِن دو کے علاوہ ایک تیسرا طاقتور اور بنیادی محرک رسول اللہ کی وہ پیش گوئیاں تھیں جن میں انھوں نے خوش خبری دی تھی کہ عنقریب قیصر اور کسریٰ کی حکومت اور خزانے مسلمانوں کے قبضہ میں آجائیں گے اور ان کی اقتصادی زبوں حالی کا خاتمہ ہوگا۔ ابوبکر صدیق کو رسول اللہ پر بے پایاں اعتقاد تھا اور وہ ان کی پیش گوئی کو ایک شدنی حقیقت تصور کرتے تھے۔ خاص شام کے بارے میں رسول اللہ کی ایک پیش گوئی صحابی عبداللہ بن حوالہ کی زبانی سُنیئے: میں نے اور بعض دیگر صحابہ نے ایک دن رسول اللہ سے اپنے شدید افلاس ونا داری کی شکایت کی تو آپ نے فرمایا: خوش ہوجاؤ، میں تمھاری ناداری سے زیادہ تمھاری آنے والی خوش حالی سے اندیشہ مند ہوں۔ بخدا یہ اسلام اس وقت تک قائم رہے گا جب تک کہ فارسیوں، رومیوں اور حمیریوں کے ملک فتح نہ ہوجائیں گے اور تمھاری تین بڑی چھاؤنیاں قائم نہ ہوجائیں گی: ایک

شام میں، دوسری عراق میں اور تیسری یمن میں، اور تمھاری مالی حالت اتنی بہتر ہو جائے گی کہ ایک شخص سو دینار تنخواہ لیتے ہوئے ناک بھوں چڑھائے گا۔" عبداللہ بن حوالہ نے کہا: رسول اللہ شام کو کون فتح کر سکتا ہے جہاں بڑے مال والے رومیوں کی حکومت ہے۔" رسول اللہ نے فرمایا: خدا تم کو ضرور شام میں رومیوں کا جانشین بنا دے گا حتی کہ وہاں کے سفید قمیص پوش گھٹی گدھی والے امرار کی جماعت کالے عرب کے سامنے سر تسلیم خم کئے حکم کے منتظر کھڑے ہوں گے اور آج تو بلاشبہ وہاں ایسے پر تمکنت اور با اقتدار حاکم ہیں جن کی نظر میں تم اونٹ کے چوتڑ کی کلی سے زیادہ حقیر ہو۔" (معجم البلدان یاقوت ۵/۲۲۱ - ذکر شام)

محاذِ شام سے متعلق ابو بکر صدیق کے خطوط کے دو خاص ماخذ ہیں: ازدی بصری مصنف فتوح الشام اور سیف بن عمر جن کی بہت سی روایتیں طبری نے اپنی تاریخ میں جمع کر لی ہیں اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ فتوح الشام سے بس ان دو مورخوں نے ہی دل چسپی لی ہے، نہیں اس موضوع پر دوسری صدی ہجری میں متعدد کتابچے قلم بند ہو گئے تھے جن کے بعض مشہور مصنفوں کے نام یہ ہیں: ابو مخنف، ابن اسحاق - عمر بن شبہ اور مدائنی یہ کتابچے کئی سو برس سے لاپتہ ہیں، البتہ تیسری اور چوتھی صدی کے اُن مؤلفوں نے جنہوں نے بڑی تاریخیں لکھیں ان کتابچوں سے کافی مواد لے لیا تھا جو ہمارے سامنے موجود ہے - طبری اور بلاذری نے جو اسلامی تاریخ اور فتوحات پر ہمارے سب سے پرانے اور جامع مورخ ہیں، ابو مخنف، ابن اسحاق عمر بن شبہ اور مدائنی سے فتوح شام کے سلسلہ میں کافی خوشہ چینی کی ہے، پر ان سے لئے ہوئے مواد میں ابو بکر صدیق کے خطوط نہیں ہیں - آپ دیکھیں گے کہ سیف کی روایات ازدی بصری کی روایتوں سے بہت مختلف ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ سیف کے شیوخ اور ہیں، ازدی بصری کے اور - کوئی کہہ سکتا ہے کہ شیوخ روایت کے مختلف ہونے سے روایات کا مختلف ہونا تو لازم نہیں آتا - یہ صحیح ہے، لیکن عربی تاریخ کے معاملہ میں اختلاف رواۃ سے روایت میں بڑا اختلاف پیدا ہو گیا ہے - اس کے بعض اسباب ہیں جن میں سے ایک خاص اور بنیادی سبب

یہ ہے کہ قرن اول کے واقعات و حوادث رونما ہونے کے سو یا زیادہ سال بعد قلمبند ہوئے اور اس عرصہ میں سیکڑوں ہزاروں افراد کے حافظوں اور زبانوں سے گذرتے رہے اور چونکہ ان افراد کی معلومات، ذہنی قوت اور اخلاقی حالت ایک دوسرے سے مختلف تھی اس لئے ان کے بیان کردہ واقعات کی نوعیت اور تفصیل میں بھی فرق پیدا ہو گیا۔

۳۶۔ یمن کے مسلمانوں کے نام

یہ مراسلہ فتوح الشام ازدی سے ماخوذ ہے۔ اس کا سیاق و سباق یہ ہے کہ شام پر چڑھائی کا ارادہ جب ابو بکر صدیق نے پکا کر لیا تو بڑے صحابہ کی مجلس منعقد کی، چڑھائی کا منصوبہ ان کے سامنے رکھا اور رائے مانگی۔ سب نے منصوبہ کی تائید کی۔ اس کے بعد ایک عام جلسہ کیا گیا جس میں خلیفہ نے لوگوں سے شام کے محاذ پر جانے کی اپیل کی، رومی حکومت کی عربوں کے دلوں میں ایسی دھاک تھی کہ اپیل کا کچھ اثر نہ ہوا اور کسی نے سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا نہیں کہا۔ یہ جمود دیکھ کر حضرت عمر کھڑے ہوئے اور لوگوں کو غیرت دلائی، اس کے زیر اثر ایک قریشی لیڈر خالد بن سعید کھڑے ہوئے اور کہا کہ میں، میرے بھائی، غلام اور متبعین سب خلیفہ کی دعوت کو لبیک کہتے ہیں۔ مدینہ کے باہر ایک کیمپ کھولا گیا، جہاں خالد کے کنبہ کے بہت سے لوگ اور غلام و موالی جمع ہو گئے، دوسرے لوگ بھی کیمپ میں آنے لگے، خلیفہ نے کئی سالار نامزد کئے یزید بن ابی سفیان، ابو عُبیدہ بن جرّاح اور شرحبیل بن حسنہ۔ بھرتی کی رفتار سست تھی، اور کئی ہفتے گذرنے کے بعد بھی جب تعداد میں خاطر خواہ اضافہ نہ ہوا تو صحابہ کے مشورہ سے یہ طے پایا کہ یمن کے مسلمانوں کو شام میں جہاد کی دعوت دی جائے اور جب فوج کی تعداد بڑھ جائے تو چڑھائی کی جائے، چنانچہ ابو بکر صدیق نے یمن کے مسلمانوں کو یہ مراسلہ بھیجا:-

بسم اللہ الرحمن الرحیم - خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف

سے ان یمنی مومنوں اور مسلموں کے نام جن کو میرا یہ خط سنایا جائے،
سلام علیکم، میں اس معبود کا سپاس گذار ہوں جس کے سوا کوئی عبادت
کے لائق نہیں، واضح ہو کہ اللہ نے مومنوں پر جہاد لازم کیا ہے اور ان
کو حکم دیا ہے کہ جہاد کے لئے جائیں پیادہ ہوں تو، سوار ہوں تو، اس نے
فرمایا ہے: جہاد کرو اللہ کی خاطر اپنے مال اور جان سے۔ اس سے ظاہر ہوا
کہ جہاد ایک ضروری فریضہ ہے اور اللہ کی نظر میں اس کا ثواب بہت
ہے۔ یہاں کے مسلمانوں کو ہم نے شام جاکر رومیوں سے جہاد کرنے کی
دعوت دی، انھوں نے اس دعوت کو گرم جوشی سے مانا، کیمپ میں
جمع ہوئے اور لڑنے چلے گئے، جہاد کے لئے ان کے دل میں سچی لگن تھی
ثواب اور دنیوی خوش حالی کی آرزو ان کے سینوں کو گرمائے تھی۔ عباد اللہ!
جس جہاد کے لئے انھوں نے پیش قدمی کی آپ بھی کیجئے، ضروری ہے
کہ آپ کے دل میں اس کی سچی لگن ہو، کیوں کہ دو نعمتوں میں ایک سے
آپ ضرور بہرہ مند ہوں گے: شہادت یا مالِ غنیمت۔ اللہ تبارک
و تعالیٰ اپنے بندوں سے اس پر راضی نہیں کہ اطاعت کا زبانی اقرار
کریں، وہ عملی اطاعت چاہتا ہے۔ وہ اپنے اہلِ عداوت کو اس وقت
تک نہیں چھوڑے گا جب تک وہ "دینِ حق" کو اختیار نہ کرلیں اور
قانونِ قرآن کو صحیح نہ مانیں، یا مسلمانوں کے منقاد بن کر جزیہ ادا کریں۔
اللہ آپ کے دین کی حفاظت کرے، آپ کے دلوں کو ہدایت دے، اور آپ کے
اعمال کو برائیوں سے پاک فرمائے اور مجاہدین صابرین کا آپ کو اجر
عطا کرے۔　والسلام علیکم"۔

۳۷ خالد بن سعید کے نام

یہ خط اور اس کا سیاق و سباق سیف بن عمر کی روایت پر مبنی ہے۔ آپ نے ابھی پڑھا کہ شام کی مہم پر جانے کے لئے خالد بن سعید نے ابوبکر صدیق اور عمر فاروق کی اپیل پر سب سے پہلے آمادگی ظاہر کی تھی۔ یہ خالد عمرو بن عاص کے بھتیجے تھے اور رسول اللہ کے یمن میں افسر رہے تھے۔ آپ کی وفات پر جب وہاں بدامنی پھیلی تو یہ لوٹ آئے، مدینہ میں داخل ہوتے وقت ریشمی کپڑوں میں ملبوس تھے، ان کا گذر حضرت علی اور عمر فاروق کے پاس سے ہوا تو آخر الذکر ریشم کا لباس دیکھ کر بہت برہم ہوئے اور دونوں میں اس موضوع پر سخت کلامی ہوئی۔ حضرت علی نے نہ لباس پر تنقید کی اور نہ عمر فاروق کا پارٹ لیا۔ غالباً اس واقعہ کے زیر اثر خالد نے اس موقع پر ایسی باتیں کیں جن سے حضرت علی کی خلافت کی تائید اور ابوبکر صدیق کی خلافت سے بددلی ظاہر ہوتی تھی، یہ بھی کہا گیا ہے کہ دو ماہ تک خالد، صدیق کی بیعت سے منحرف رہے۔ بہت ممکن ہے خالد نے شام جانے کے لئے سب سے پہلے جو آمادگی ظاہر کی اس کے پیچھے خلیفہ پر اپنی وفاداری اور صاف دلی ظاہر کرنے کا جذبہ کار فرما ہو۔ ابوبکر صدیق نے خالد کے اقدام کی قدر کی اور پچھلی باتوں سے ایک وسیع قلب انسان کی طرح چشم پوشی کرتے ہوئے ان کو سپہ سالار فوج بنا کر شام بھیجنے کا ارادہ کر لیا۔ لیکن حضرت عمر آڑے آئے، کچھ تو پچھلی باتوں کی بنا پر اور کچھ خالد کی فوجی کم لیاقتی کی وجہ سے۔ ابوبکر صدیق نے پچھلی باتوں کی طرف تو دھیان نہ دیا، پر فوجی تجربہ اور لیاقت کی بات کو نظر انداز نہ کر سکے، طے ہوا کہ خالد کو سپہ سالار نہیں بلکہ ایک مددگار اور معاون سالار کا عہدہ دیا جائے، چنانچہ ان کو تیماء[1] نامی نخلستان بھیج دیا گیا، یہ نخلستان مدینہ سے دمشق جانے والی سڑک پر واقع تھا اور یہاں اور اس کے آس پاس بہت سے قبیلے آباد تھے، خالد کی ڈیوٹی یہ تھی کہ ان قبائل کو اسلام اور شام پر

---

[1] دیکھئے نقشہ

چڑھائی کی دعوت دیں اور جب خلیفہ ان کو شام میں داخل ہونے یا کسی سالار کی مدد کو جانے کا حکم دیں تو اس کی تعمیل کریں، بالفاظِ دیگر خالد اس بات پر مامور تھے کہ تیمار میں عرب فوجوں کی چھاؤنی قائم کریں اور آس پاس کے قبائل سے بھرتی کر کے اس چھاؤنی کی تعداد بڑھائیں تاکہ مرکز کے مامور کردہ دوسرے سالاروں کو جب شام میں مدد کی ضرورت ہو تو جلد جلد رسد پہنچا سکیں۔ اس چھاؤنی اور اس کی روز افزوں ترقی کی خبر جب شامی سرحد کے عرب۔ عیسائی رئیسوں اور ان کی معرفت شام کی مرکزی سرکار کو ہوئی تو ان سرحدی رئیسوں کو حکم ہوا کہ ایک فوج لے کر خالد اور ان کی چھاؤنی کا ستھراؤ کرنے نکلیں، آنے والے خطرہ سے خالد نے خلیفہ کو مطلع کیا تو حکم آیا کہ بجائے اس کے کہ دشمن تیمار آکر تم پر حملہ آور ہو تم خود آگے بڑھ کر اس سے لڑو" خالد نے ایسا ہی کیا، اس اثناء میں خالد کی پشت پناہی کے لئے کچھ دستے بھی مدینہ سے آگئے۔ وہ دھاوے مارتے سرحدِ شام کے مضافات میں پہنچ گئے۔ وہاں کے رئیسوں کی قبائلی فوجیں جو غالباً اپنے رومی آقاؤں سے ناخوش تھیں، خالد کے قریب آتے ہی تتر بتر ہو گئیں اور ان میں سے بیشتر نے اسلام قبول کر لیا اور مدینہ کی وفاداری اختیار کی۔ یہ خوش خبری خالد نے خلیفہ کو دی تو انھوں نے لکھا کہ احتیاط سے پیش قدمی جاری رکھو لیکن شام کی سرحد پار زیادہ نہ گھس جانا مبادا دشمن پشتی حملہ کر کے نقصان پہنچا دے۔ ادھر شام کی سرحد پر یہ واقعات ہو رہے تھے، اُدھر ابو بکر صدیق شام کے مختلف محاذوں کے لئے فوجیں جمع کرنے میں مشغول تھے اور ایک روایت یہ ہے کہ دو فوجیں فلسطین اور اُردن کی سمت روانہ ہو چکی تھیں۔ خالد بن سعید جہاد کے شوق اور سرحدی قبائل کی وفاداری اور رہنمائی سے حوصلہ پاکر احتیاط کے جادہ سے ہٹ گئے اور سرحد پار زیادہ اندر داخل ہو گئے، ایک رومی سالار تاک میں تھا، اس نے خالد سے تعرض نہ کیا اور جب یہ خوب آگے بڑھ گئے تو پیچھے سے آکر ان کی واپسی کے راستے گھیر لئے اور حملہ کر دیا اس وقت خالد مرج الصُفّر قصبہ[1] کے نزدیک تھے جو دمشق اور دریائے اُردن کے لگ

[1] دیکھئے نقشہ

بھگ وسط میں واقع تھا۔ صورتِ حال نازک ہو گئی، سوار دستے بدحواس ہو کر عربی سرحد کی طرف بھاگ نکلے، خالد کے صاحبزادے مع اپنی کافی فوج کے کام آئے، خود خالد کو میدان چھوڑنا پڑا، چند رسالوں کے ساتھ شامی سرحد پار کر کے عربی حدود میں داخل ہوئے اور ذو مروہ کے نخلستان میں پڑاؤ ڈالا، ابو بکر صدیق کو حادثہ کی خبر بھیجی اور مدد طلب کی۔ خالد کی بے احتیاط کارروائی نے خلیفہ کو مشتعل کیا، عمر فاروق کی رائے کی توثیق بھی ہو گئی، اب انھوں نے خالد کو مزید فوجی خدمت کے لئے نااہل سمجھ کر یہ پُر ملامت خط لکھا:۔

"جہاں ہو وہیں ٹھہرے رہو، (یعنی مدینہ نہ آؤ ورنہ تمھاری شکست کی خبر سے لوگوں کی حوصلہ شکنی ہوگی) میری جان کی قسم تم بہادر بھی بڑے ہو، بزدل بھی بڑے، مصیبتیں جب آتی ہیں تو بھاگ نکلتے ہو، فتح یا شہادت تک ڈٹ کر ان کا مقابلہ نہیں کرتے۔" (سیف بن عمر۔ طبری ۴/۲۸-۳۱)

۳۸ عمرو بن عاص کے نام

خالد بن سعید کے حادثہ کی خبر نے ابو بکر صدیق کے عزم و عمل میں جیسے برقی رَو دوڑا دی۔ مدینہ کے باہر کیمپ میں جو قبیلے یمن اور مکہ کے درمیانی دیہاتوں سے آتے رہے تھے، ابو بکر صدیق ان کو خالد بن سعید کی تقویت کے لئے بھیجتے رہے تھے۔ اب انھوں نے فوجی فراہمی کی مہم شد و مد سے شروع کر دی اور جہاں جہاں اس کا امکان تھا وہاں ارجنٹ مراسلے بھیجے۔ فوج کے لئے مناسب سالاروں کی بھی بڑی ضرورت تھی۔ یزید بن ابی سفیان، ابو عبیدہ، شرحبیل بن حسنہ، ولید بن عقبہ اور عکرمہ نامزد ہو چکے تھے، اور آخر الذکر دو کو تو خالد بن سعید کی پشت پناہی کے لئے بھیجا بھی جا چکا تھا۔ اس وقت وہ شام کی سرحد پر ٹھہرے کے رسد کا انتظار کر رہے تھے۔ باقی سالار منتظر تھے کہ کافی فوج فراہم ہو جائے تو شام کا رُخ کریں، خلیفہ کی نظرِ انتخاب قریش کے حوصلہ مند بہادر عمرو بن عاص پر پڑی۔ ۱۵ھ اس

وقت بعض عرب دیہاتوں میں محصّل زکاۃ کے فرائض انجام دے رہے تھے، سب سے پہلے رسول اللہ نے ان کو اس عہدہ پر مقرر کیا تھا، پھر ان کو عُمان میں جب اپنا نمایندہ بنا کر بھیجا تو یہ وعدہ کیا کہ جب لوٹو گے تو اس عہدہ پر بحال کر دئے جاؤ گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ عمرو کو ان دیہاتوں میں محصل زکاۃ کی خدمت عزیز تھی اور وہ اس کو چھوڑ کر عُمان جیسے دور دراز علاقہ کو جاتے ہوئے گھبرا رہے تھے۔ رسول اللہ کی وفات پر عُمان میں جب بغاوت ہوئی تو عمرو خود کو کمزور پا کر مدینہ آگئے اور ابوبکر صدیق سے رسول اللہ کا وعدہ پورا کرنے کی درخواست کی جو انھوں نے بے چون وچرا مان لی۔ عمرو پھر عرب دیہاتوں کے محصّل زکاۃ مقرر ہو گئے۔ شام کی مہم کے لئے جب سالار مقرر کرنے کا سوال اٹھا تو عمرو کا نام لیا گیا۔ وہ خوش تدبیر ہونے کے علاوہ شام کا سفر بھی کر چکے تھے اور وہاں کے حالات اور جغرافیہ سے واقف تھے۔ ابوبکر صدیق کے سامنے سوال یہ تھا کہ عمرو کو اس عہدہ سے کیسے الگ کریں جس پر رسول اللہ نے ان کو مقرر کیا تھا، حکماً وہ ایسا کرتے ہوئے گھبراتے تھے، اس لئے انھوں نے یہ خط لکھا جس میں التجا کا پہلو غالب ہے:۔

"میں نے رسول اللہ کا وعدہ پورا کرتے ہوئے تم کو اُس عہدہ پر واپس کر دیا تھا جس پر ایک بار انھوں نے تم کو مقرر کیا تھا اور عُمان بھیجتے وقت جس پر دوبارہ بحال کرنے کا انھوں نے تم سے وعدہ کیا تھا۔ تم ایک بار اس پر فائز رہے اور اب پھر ہو۔ ابوعبداللہ میں چاہتا ہوں کہ تم کو ایسے کام پر لگاؤں جو تمھاری دنیا اور آخرت دونوں میں موجودہ منصب کی نسبت تمھارے لئے زیادہ مفید ہو، اِلّا یہ کہ موجودہ عہدہ تم کو اتنا پسند ہو کہ تم چھوڑنا نہ چاہو۔" (سیف بن عمر۔ طبری ۴/۲۹)

۳۹ فوجی سالاروں کے نام

خالد بن سعید کے حادثہ کے بعد ابوبکر صدیق نے چار لشکر تیار کئے، شام کو چار محاذوں

میں بانٹا اور ہر محاذ پر ایک لشکر روانہ کیا: حمص پر ابو عبیدہ بن جراح کو، دمشق پر یزید بن ابی سفیان کو، اردن پر شرحبیل بن حسنہ کو، فلسطین پر عمرو بن عاص کو (طبری ۴/۳۱) عمرو بن عاص نے بحر قلزم کی ساحلی سڑک سے فلسطین کا رخ کیا، دوسرے سالاروں نے مدینہ سے دمشق جانے والی شاہراہ سے، یہ بھی کہا گیا ہے کہ دوسرے سالاروں کے راستے مختلف تھے اور یہ کہ صرف یزید بن ابی سفیان مدینہ سے دمشق جانے والی راہ سے روانہ ہوئے تھے۔ اس چہار طرفہ یورش کی خبر جب قیصر روم (اور سلطان شام) کو ہوئی تو وہ پوری سنجیدگی سے فوجی تنظیم و ترتیب میں لگ گیا کئی ہفتہ کی بلیغ کوشش کے بعد ایک بڑا لشکر تیار ہوا جس کی تعداد عرب مورخ دو لاکھ سے زیادہ بتاتے ہیں۔ اس لشکر کو کئی حصوں میں بانٹا گیا اور ہر حصہ کو ایک تجربہ کار سالار کی قیادت میں مسلمان فوجوں سے جہاں جہاں وہ تھیں نمٹنے کے لئے مقرر کیا گیا۔ مسلمانوں کی تعداد ایک روایت میں ستائیس اٹھائیس ہزار اور دوسری میں چھیالیس ہزار بتائی گئی ہے۔ رومیوں کی اتنی بڑی فوج، اس کے دم خم اور سامان کی خبروں نے مسلمانوں کے حوصلے پست کر دئے۔ سالاروں نے صورتِ حال کا جائزہ لیا اور طے ہوا کہ الگ الگ محاذوں پر لڑنا مصلحت کے خلاف ہے، سب کو متحدہ مقابلہ کرنا چاہیئے، یہ تجویز عمرو بن عاص نے پیش کی تھی، مرکز سے بھی مشورہ کیا گیا، خلیفہ نے قرارداد کی تائید کرتے ہوئے یہ حوصلہ انگیز مراسلہ بھیجا:۔

"آپ سب جمع ہو کر ایک لشکر ہو جائیے اور مشرکوں کی بڑی فوجوں کا مقابلہ اپنی متحدہ فوج سے کیجئے۔ آپ خدا کے جاں نثار ہیں، خدا اپنے جاں نثاروں کی مدد کرتا ہے اور اپنے باغیوں کو چھوڑ کر الگ ہو جاتا ہے آپ قلتِ تعداد کی وجہ سے ہرگز شکست نہیں کھائیں گے، دس ہزار فوجوں کی دس ہزار یا زیادہ سے ہارنے کی وجہ ان کی بداعمالی ہوتی ہے، لہذا بداعمالی سے بچتے رہیئے۔ سب سالار اپنی اپنی فوج اور پرچموں کے ساتھ

"یرموک[1]" میں جمع ہو جائیے اور ہر سالار اپنی فوج کے ساتھ الگ نماز ادا کرے۔" (سیف بن عمر۔ طبری ۴/۳۱)

۴۔ خالد بن ولید کے نام

سب سالار دریائے یرموک کی وادی کے قریب ایک میدان میں جمع ہوئے۔ دوسری طرف رومی فوجوں نے بزعمِ خود ایک ڈھب کی جگہ (جو ان کی ہلاکت کا سبب بنی) منتخب کی، ان کے عقب میں ایک گہری گھاٹی (واقوصہ) تھی، اس سے متصل دریا، اور سامنے خندق، آنے جانے کے لئے ایک راہ کھلی تھی۔ یرموک میں خیمہ زن ہونے کے بعد عرب سالاروں نے خلیفہ کو مطلع کیا کہ ہم سب اپنی اور آپ کی تجویز کے بموجب "یرموک" میں جمع ہو گئے ہیں، ہمارے سامنے دشمن کا لشکرِ جرار کیل کانٹے سے لیس حملہ کا منتظر ہے، اور گو ہمارا بھروسا خدا اور اس کے کرم پر ہے، پھر بھی ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہماری فوج کم اور ہمارے ہتیار نارسا ہیں، ہمیں رسد کی سخت ضرورت ہے۔ خلیفہ نے محسوس کیا کہ مسلمان رسد سے زیادہ ایک ایسے سالار کے محتاج ہیں جو ان کے دلوں کو گرما دے اور ان میں خود اعتمادی کا شعور پیدا کر سکے۔ ایسا سالار ان کو خالد بن ولید میں نظر آیا، جو اس وقت حیرہ کے شمال مغرب میں مشرقی فرات کے قصبوں اور فوجی نقطوں کو رام کرتے دریا کے کنارہ کنارہ شام اور جزیرہ (میسوپوٹامیہ) کی سرحد تک پہنچ کر حیرہ واپس ہو رہے تھے۔ ابو بکر صدیق نے ان کو یہ ارجنٹ مراسلہ بھیجا (صفر ۱۳ھ) :-

"تم چل دو اور مسلمان فوجوں سے "یرموک" میں جا ملو۔ رومیوں نے ان کو غمگین کر رکھا ہے جس طرح انھوں نے رومیوں کو۔ خبردار! پھر تم وہ حرکت نہ کرنا جو تم نے کی۔ خدا کے فضل سے کوئی دوسرا دشمن

[1] دیکھئے نقشہ

کو (زک دے کر) ایسا غمگین نہیں کر سکتا جیسا کہ تم کر سکتے ہو، نہ کوئی دوسرا مسلمانوں کے دلوں کی کلی کھلا سکتا ہے جیسا تم کھلا سکتے ہو۔ اے ابو سلیمان! دعا، ہے کہ جہاد کی لگن اور خدا کے انعام سے تم ہمیشہ بہرہ ور رہو، اِس لگن کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دو، خدا انعام بھی پورا پورا دے گا، تمکنت تمھارے دل میں ہرگز حاصل نہ ہو ورنہ تمھارا سارا کیا دھرا مٹی میں مل جائے گا اور خدا تمھاری مدد سے ہاتھ اُٹھالے گا۔ اپنے کسی کام پر بھروسہ بھی نہ کرو، کیوں کہ کامیابی کا مواد (انسانی کوشش پر نہیں) اللہ عزوجل کے لطف و احسان پر ہے۔ اچھے بُرے عمل کی جزار بھی اس کے ہاتھ میں ہے۔" (طبری ۴/۴۰ و ۴۶)

"خبردار پھر تم وہ حرکت نہ کرنا جو تم نے کی"، اس کا اشارہ خالد کے خُفیہ حج کی طرف ہے ذوالقعدہ ۱۲ھ میں خالد نے فراض (جزیرہ۔ شام کی سرحد) پر رومی و فارسی فوجوں کو شکست دی اور اُبلّہ سے لے کر فراض تک مشرقی و مغربی فرات کے سارے گاؤں دیہات اسلام کے ماتحت آگئے اس وقت ان کے دل میں خفیہ حج کا شوق پیدا ہوا، حج کو خفیہ رکھنے کا صحیح سبب ہم کو نہیں معلوم، وہ فوج کے پشتی دستوں کے ساتھ تھے، چند منتخب ساتھیوں کو لے کر چوبیس یا پچیس ذوالقعدہ کو فراض سے مکہ کو روانہ ہوئے، اور ایک دشوار گذار مگر چھوٹے راستہ سے بھیس بدل کر مکہ میں داخل ہوئے، حج کر کے دہاوے مارتے لوٹے اور ابھی فوج کے پشتی دستے حیرہ پہنچے بھی نہ تھے کہ اُن سے آملے۔ خلیفہ کو خبر ہوئی تو انھوں نے خالد کا یہ فعل ناپسند کیا اور خط میں وہ جملہ لکھا جو آپ پڑھ آئے ہیں۔ اکثر مورخ اس خفیہ حج کے منکر ہیں، اس کی روایت اور تائید بس سیف بن عمر نے کی ہے۔

(باقی آئندہ)

انبیاء کرام اسلام کی نظر میں

از

(جناب مولانا محمد ظفیر الدین صاحب دار الافتار - دار العلوم - دیوبند)

(۲)

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، مامنکم من احد الا وقد وکل بہ قرینہ من الجن وقرینہ من الملائکۃ قالوا ایاک یارسول اللہ قال وایای الا ان اللہ اعاننی علیہ فلا یامرنی الا بخیر رواہ مسلم (خازن ۱۶۱/ج۲)

یعنی اس حیثیت سے کہ رسول بھی انسان ہے، شیطان کو تصرف کا اختیار ہو سکتا تھا، مگر اس حیثیت سے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے برگزیدہ بنایا ہے، اور بندوں تک احکام پہونچانا اس کے ذمہ ہے، اس لئے اپنے ان برگزیدہ بندوں کی اس نے مدد فرمائی، اور اسے شیطان کے تصرف سے محفوظ کر دیا۔

یہاں حضرت خزیمہ بن ثابت انصاری رضؓ کی وہ بات یاد کیجئے، کہ جب انھوں نے ایک موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں گواہی دی، تو آنحضرت صلعمؐ نے دریافت فرمایا۔

ماحملک علی الشہادۃ ولم تکن معناحاضراً — تم کو کس چیز نے گواہی پر آمادہ کر دیا، حالانکہ تم ہمارے ساتھ موجود نہ تھے

حضرت خزیمہؓ نے کتنا اچھا اور صحیح جواب دیا، اور کہا

صدقتک بماجئت بہ وعلمت انک لا تقول الا حقا — میں نے آپ کی ان تمام چیزوں میں تصدیق کی جو کچھ آپ لائے اور مجھے یقین ہے کہ آپ حق کے سوا کچھ نہیں فرماتے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس جواب سے خوش ہوئے اور فرمایا خزیمہ جس چیز کی گواہی

ردیں وہ کافی ہے۔

اس واقعہ کے نقل کرنے کا منشاء یہ ہے کہ صحابۂ کرام کو یقین تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ فرماتے ہیں وہ بالکل حق ہوتا ہے، گو یہ واقعہ آپ سے متعلق ہے مگر اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کا یہی حال ہوتا ہے، خازن نے اپنی تفسیر میں قاضی عیاض کا یہ قول نقل کیا ہے واعلم ان الامۃ مجتمعۃ علی عصمۃ الانبیاء من الشیطان فی جسمہ وخاطرہ ولسانہ (خازن ۱۶۱/ج ۳)

عصمت انبیاء پر امام رازی نے مستقل ایک رسالہ لکھا ہے، اور متعدد دلیلیں قرآن سے قائم کی ہیں، تفصیل وہاں ملاحظہ کی جا سکتی ہے، مولانا دوست محمد کابلی نے بھی تحفۃ الاخلار میں اچھی بحث کی ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ رح لکھتے ہیں۔

"انبیاء علیہم السلام ممتاز ہوتے ہیں، کچھ ایسی چیزیں ان میں مابہ الامتیاز پائی جاتی ہیں جو اجتماعی طور پر دوسروں میں نہیں پائی جاتیں"

آگے لکھتے ہیں

"انبیاء علیہم السلام معصوم ہوتے ہیں، . . . . اور اللہ تعالیٰ ان کی تین طریقوں سے حفاظت کرتا ہے،

(۱) رب العزت ان کو سلامتیٔ فطرت پر پیدا فرماتا ہے اور معتدل کمالاتِ اخلاق سے نوازتا ہے، یہ صفات ان میں اس طرح رچی ہوئی ہوتی ہیں کہ ان میں معصیت کی کھٹک تک پیدا نہیں ہوتی بلکہ معصیت سے یہ حضرات (انبیاء علیہم السلام) متنفر ہوتے ہیں (یہ محض اللہ کا فضل وکرم ہوتا ہے کہ ان کو دینی امور کے سلسلہ میں فرشتوں سی طبیعت دی جاتی ہے جس کا ثمرہ یہ ہوتا ہے کہ طاعت کی رغبت اور معصیت سے نفرت طبیعت میں مرکوز ہو جاتی ہے)

(۲) دوسری چیز یہ کہ بذریعہ وحی یقین دلا دیا جاتا ہے کہ معصیت باعثِ عقاب ہے، اور طاعت باعثِ ثواب، یہ چیز انبیاء علیہم السلام کے لئے معصیت سے روکنے والی ہوتی ہے، (یعنی

اختیار کے بقار کے باوجود ان میں طاعت کی خواہش اور معصیت سے فرار ہوتا ہے)

(۳) تیسرا طریقہ عصمتِ انبیار کا یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انبیار اور معصیت کے درمیان حائل ہو جاتا ہے، جس کی کوئی غیبی لطیف صورت ہوتی ہے، جس طرح یوسف علیہ السلام کے سامنے یعقوب علیہ السلام کو اس طرح کھڑا کر دیا کہ وہ حیرت سے انگلی دانتوں میں دبائے کھڑے ہیں"[1]

قاضی ثنار اللہ پانی پتیؒ مالابد منہ میں تحریر فرماتے ہیں

"عصمت انبیار کے لئے مخصوص ہے، اولیار کے متعلق عصمت کا اعتقاد کفر ہے، عصمت اس کا نام ہے کہ انبیار گناہ کی جرأت نہ کر سکیں، یعنی نہ وہ عمداً ایسا کر سکیں، اور نہ خطأً، یہ حضرات ہر حالت میں اختلالِ عقل سے محفوظ ہوتے ہیں، بیداری یا خواب کسی حال میں بھی غافل نہیں ہوتے اسی طرح وہ ہذیان اور مدہوشی سے بھی پاک ہوتے ہیں"[2]

انبیار علیہم السلام ہر طرح کی معصیت سے پاک ہوتے ہیں، کبیرہ، صغیرہ، عمداً، سہواً ہر ایک سے، وحی کے پہلے بھی، اور وحی کے بعد بھی، وحی سے پہلے کی دلیل کے سلسلہ میں حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق وہ آیت ہے کہ آپ نے بچپن میں فرمایا، قرآن میں ہے

قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا — اس نے کہا بلاشبہ میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب دی اور مجھے نبی بنایا

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جب پوچھا گیا، آپ نبی کب ہوئے، تو آپ نے فرمایا

کنت نبیا وادم بین الروح والجسد، اخرجہ احمد والبخاری فی تاریخہ — میں اس وقت نبی تھا کہ آدم ابھی روح اور جسد کے درمیان تھے۔

(مقاصد حسنہ ص۱۵۳)

صغائر کا ارتکاب انبیار سے سہواً ہونے نہ ہونے میں اختلاف ہے، صغیرہ کے سہواً ارتکاب کو بعض محققین نے جائز کہا ہے، لیکن بعد نبوت اس سلسلہ میں مجھے نواب صدیق حسن خاں صاحب

---

[1] الانتقاد الرجیح ص۴۹ و ص۵۰ [2] ایضاً

کی یہ رائے پسند ہے، تحریر فرماتے ہیں۔

والیق بعظمتِ منصب وعلو منزلت ایشاں عصمت از صغائر وکبائر ہر دو است، عمداً وسہواً وبایں رفتہ اند جمہور واگر لغزشے از ایشاں بوجود می آید، زود براں متنبہ کردہ می شوند وایں ہمہ بعد وحی است (نبتۃ الرائد فی شرح العقائد ص۵)

ان کے عظمت منصب اور علو منزلت کے لائق تر یہی ہے کہ یہ انبیاء علیہم السلام صغائر وکبائر دونوں سے معصوم ہیں، عمداً سے بھی اور سہواً بھی اور جمہور کا یہی مسلک ہے، اگر ان سے کوئی لغزش سرزد ہوتی ہے تو فوراً ان کو متنبہ کیا جاتا ہے، اور یہ اہتمام بعد نبوت ہوتا ہے۔

تورپشتی لکھتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام حق تعالے کے حکم کی پیروی اور اسی کی طاعت کے درپے ہوتے ہیں، اور کبھی بھی قصد وارادہ سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے، ان کے الفاظ یہ ہیں

وازیں وجہ ایشاں از نافرمانی خدا بقصد معصوم ماندند، وایشاں واجب العصمت اند ومخالفت امر خدا تعالیٰ بر ایشاں روا نیست زیرا کہ حق تعالیٰ خلق را فرمودہ کہ پیروی ایشاں بکنند، واگر عصیاں بقصد ایشاں یافت شدی خدا تعالیٰ خلق را متابعت ایشاں نہ فرمودی (معتمد ص۶۳)

یہی وجہ ہے کہ یہ (انبیاء علیہم السلام) خدا کی قصداً نافرمانی سے معصوم رہتے ہیں اور یہ واجب العصمت ہیں بھی، خدا کے حکم کی نافرمانی ان کے لئے جائز نہیں ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو حکم دیا ہے کہ ان کی پیروی کریں، اگر ان سے قصداً نافرمانی ہوتی، تو اللہ تعالیٰ کبھی ان کی پیروی کا مخلوق کو حکم نہ فرماتے۔

امام ابو منصور ماتریدی فرماتے ہیں

نظر اقتضاء آں میکند کہ تاکید وجوب عصمت در حق انبیاء علیہم السلام افزوں ازاں است کہ در حق ملائکہ زیرا کہ خلق بمتابعت انبیاء ماموراند، بہ متابعت ملائکہ مامور نیستند (معتمد ص۶۳)

جس طرح انبیاء علیہم السلام معصوم ہوتے ہیں ایسے ہی عقل کی طرف سے بھی محفوظ ہوتے ہیں کہ ان کی عقل میں کوئی معمولی سے معمولی خامی بھی نہیں ہوتی، ان کی رائے، ان کا فہم، ان کی

بصیرت، ان کی دور اندیشی اور ان کی قوتِ حافظہ سب کی سب ممتاز ہوتی ہیں، اخلاق بدرجۂ کمال کو پہنچے ہوتے ہیں اسی طرح ان کو خلقت میں بھی دلربا موزونیت عطا کی جاتی ہے، قد و قامت میں بھی اور صورت و شکل میں بھی، سنجیدگی و وقار میں بھی اور خوش آوازی میں بھی،

نبی میں امانت اعلیٰ درجہ کی پائی جاتی ہے، گویا صداقت و امانت کا پیکر اور خلق و وفا کا مجسمہ ہوتا ہے، ان تمام ظاہری و باطنی عوارض سے منزّہ ہوتا ہے، جو منصبِ رسالت و نبوت کے لئے کسی درجہ میں بھی خلل انداز ہو سکتے ہیں۔

انبیاء جس وقت بظاہر نیند میں ہوتے ہیں، اس وقت بھی ان کا قلب بیدار رہی ہوتا ہے آنحضرت کا ارشاد ہے تنام عینی ولا ینام قلبی، (بخاری ص۵)

ایک اور حدیث میں فرشتوں کی حکایت نقل کی ہے والنبی صلی اللہ علیہ وسلم نائمۃ عیناہ ولا ینام قلبہ وکذالک الانبیاء تنام اعینھم ولا تنام قلوبھم (ایضاً)

ابلاغی امور میں ان سے بھول نہیں ہوتی ہے، خواہ وہ قولی ہوں، یا فعلی، اسی طرح احکام میں سہو نہیں ہوتا، خواہ یہ تبلیغی ہوں، خواہ غیر تبلیغی، ہاں ذاتی عمل (افعال) میں نبی سے بھول ممکن ہے، مثلاً نماز پڑھنے کھڑا ہو، اور چار کی جگہ دو ہی پر سلام پھیر دے، اور یہ بھی غالباً اس لئے ان انبیاء سے ہوتا ہے کہ مسائل لوگوں کو معلوم ہو جائیں۔

مختصر یہ کہ انبیاء علیہم السلام احکامِ الٰہی پہونچانے میں کوئی کمی نہیں کرتے، انبیاء کے واقعات کا سرسری مطالعہ کر جائیں کہ ان کو کیسی کیسی اذیتیں پہونچائی گئیں، مگر کہیں سے آپ کو یہ نہیں معلوم ہوگا کہ انھوں نے اعلان میں ذرا بھی کوتاہی کی، انبیاء و رسل کے اوصاف میں یہ بھی ہے کہ وہ کسی سے مطلقاً نہیں ڈرتے، صرف خدا کا خوف ان کے دل میں ہوتا ہے، اور بس، ارشادِ ربانی ہے

الَّذِينَ يُبَلِّغُونَ رِسَالَاتِ اللَّهِ وَيَخْشَوْنَهُ وَلَا يَخْشَوْنَ أَحَدًا إِلَّا اللَّهَ (احزاب - ۵)

یہ سب ایسے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام پہونچایا کرتے تھے، اور اللہ ہی سے ڈرتے تھے اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تھے۔

پھر جو پیغامِ الٰہی ہوتا ہے انبیاء اپنی قوم کی زبان میں اسے قوم کے سامنے پیش کر دیتے ہیں تاکہ قوم کو کسی عذر کا موقع نہ رہ جائے، ارشادِ خداوندی ہے

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ — اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر بولی بولنے والا اپنی قوم کی تاکہ اُن کو سمجھائے۔

اللہ تعالیٰ نے نبی کو تیار کھا ہے کہ جو حکم ہو، تم اسے پہونچادو، خدانخواستہ اگر ذرا بھی کوتاہی ہوئی، تو پھر یاد رکھو کہ تم نے اپنا منصب پورے طور پر ادا نہیں کیا، ارشاد ربانی ہے

يَآ اَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ — اے رسول پہنچا دیجے جو آپ پر اترا آپ کے رب کی طرف سے اور اگر ایسا نہ کیا تو آپ نے کچھ نہ پہنچایا اُس کا پیغام

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ اگر کوئی تم سے کہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیغام الٰہی نہ پہونچایا، تو ہرگز اس کی تصدیق نہ کرو، وہ جھوٹا ہے[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق قرآن نے اعلان کیا

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى، وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (النجم-۱) — یہ تمھارے ساتھ رہنے والے (پیغمبر) نہ راہ سے بھٹکے اور نہ غلط راستہ ہوئے اور نہ اپنی نفسانی خواہش سے باتیں بناتے ہیں، ان کا ارشاد نری وحی ہے جو ان پر بھیجی جاتی ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کا بیان ہے کہ میں آنحضرت صلعم سے جو کچھ سنتا تھا، لکھ لیا کرتا تھا، ایک دفعہ قریش نے مجھے اس سے روکنا چاہا، اور انھوں نے کہا کہ آنحضرت صلعم بشر ہیں، کبھی خوشی کا موقع ہوتا ہے، کبھی غم و غصہ کا، یعنی ممکن ہے کبھی غصہ میں آپ ایسی بات کہہ جاتے ہوں، جو کہنے کے لایق نہ ہو، لہذا تم جو کچھ سنو اسے لکھنے کی سعی نہ کرو، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے یہ سارا قصہ آپ سے بیان کر دیا، یہ سن کر آپ نے فرمایا

اُكتب فوالذی نفس محمد بیدہ ما — تم لکھتے رہو، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ

---

[1] الفاظ یہ ہیں عن عائشۃ رضی قالت من حدثک ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کتم شیئا من الوحی فلا تصدقہ (بخاری ج ۲ ص ۱۱۲۳)

خرج منه الا الحق واشار الی فیه
(مسند ص۳)

میں محمدؐ کی جان ہے اس (منہ) بجز حق اور کچھ نہیں نکلتا اور آپ نے اپنے منہ کی طرف اشارہ کیا۔

اللہ تعالیٰ نے اسے کھول کر بیان کر دیا ہے کہ انبیاء کو اس کی خصوصی رہنمائی حاصل ہوتی ہے اس لئے وہ بالکل وہی کرتا ہے، جس کا اسے حکم ہوتا ہے، اور جو اسے بحیثیت نبی کرنا چاہئے، ارشاد باری تعالیٰ ہے

اُولٰئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ (الانعام - ۱۰)

یہ حضرات ایسے تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی تھی، سو آپ بھی انھی کے طریقہ پر چلئے۔

یہ اقتدائے انبیاء کا حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہو رہا ہے، اس آیت سے انبیاء کی سیرت کی پختگی پر جو روشنی پڑتی ہے وہ کسی اہلِ علم سے مخفی نہیں۔

اس مسئلہ کو بھی سامنے رکھئے تو بات اور واضح ہو کر آپ کی سمجھ میں آجائے گی، کہ انبیاء علیہم السلام کو نبوت من جانب اللہ تفویض ہوتی ہے، نبوت و رسالت میں کسب و محنت کو قطعاً دخل نہیں ہے جو لوگ اس کے خلاف رائے رکھتے ہیں وہ سراسر غلطی اور گمراہی میں ہیں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ،
رَفِيْعُ الدَّرَجَاتِ ذُو الْعَرْشِ يُلْقِي الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَاۤءُ مِنْ عِبَادِهٖ لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ يَوْمَ هُمْ بَارِزُوْنَ۔

اللہ خوب جانتا ہے اُس موقع کو جہاں وہ اپنے پیغام بھیجے، وہی ہے اونچے درجوں والا، عرش کا مالک، اُتارتا ہے بھید کی بات اپنے حکم سے جس پر چاہے اپنے بندوں میں تاکہ وہ ڈرائے ملاقات کے دن سے جس دن وہ لوگ نکل کھڑے ہوں گے

ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا

يُنَزِّلُ الْمَلٰۤئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَاۤءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ اَنْ

اُتارتا ہے فرشتوں کو بھید دے کر اپنے حکم سے جس پر چاہے اپنے بندوں میں کہ خبردار کر دو کہ کسی کی بندگی

اَنْذِرُوْٓا اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ (نحل) — نہیں میرے سوا سو مجھ سے ڈرو۔

ایک اور جگہ کافروں، مشرکوں اور اہلِ کتاب کی دلی تمنا کو واشگاف کیا اور فرمایا

مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ	دل نہیں چاہتا اُن لوگوں کا جو کافر ہیں اہلِ کتاب
الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ	میں اور نہ مشرکوں میں اس بات کو کہ اُترے
يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ	آپ پر کوئی نیک بات آپ کے رب کی طرف
رَّبِّكُمْ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ	اور اللہ خاص کر لیتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ
مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ	جس کو چاہتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے
الْعَظِيْمِ (بقرہ)	

انھی آیتوں اور دوسری دلیلوں کے پیشِ نظر علامہ تورپشتی لکھتے ہیں

حق تعالیٰ آں کساں را کہ خواست	اللہ تعالیٰ جن کو چاہتا ہے نبوت کے لئے چن لیتا
بداں برگزید نہ باختیار ایشاں بود، و	ہے، انبیاء کے اختیار و کسب سے نبوت نہیں ملتی
نہ بکسب ایشاں، و بداند کہ اعتقاد	یہ واضح رہے کہ بذریعہ کسب نبوت کے ملنے کا
داشتن کہ نبوۃ بکسب حاصل شود	اعتقاد رکھنا یعنی یہ کہ کسب سے نبوت حاصل ہو سکتی
کفر است (معتمد صہ ۶۱)	ہے کفر ہے،

ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں

والنبوۃ نعمۃ یمن بہا علی من	اور نبوۃ ایک نعمت ہے جس کے ذریعہ خدا تعالیٰ
یشاء ولا یبلغہا احد بعلمہ و کشفہ	جس پر چاہتا ہے احسان کرتا ہے۔ اور کوئی شخص
ولا یستحقہا باستعداد ولایتہ	اس درجہ تک اپنے علم اور کشف کے ذریعہ نہیں پہنچ سکتا اور
(فتح الباری ۲۲)	اور کوئی شخص استعداد ولایت کی وجہ سے اس درجہ کا مستحق نہیں

یہ بھی واضح رہے کہ انبیاء و مرسلین سے نبوت و رسالت واپس نہیں لی جاتی ہے، اور نہ اُنھیں معزول کیا جاتا ہے، حد یہ ہے کہ جس طرح زندگی میں نبی ہوتے ہیں، وفات کے بعد بھی نبی

ورسول باقی رہتے ہیں، ظاہری موت کے بعد پھر روح ان کے جسم میں لوٹا دی جاتی ہے

وعلی ھذا فلا تبطل (النبوۃ) بالموت کما لا تبطل بالنوم والغفلۃ

نبوت موت سے باطل نہیں ہوتی جس طرح نیند اور غفلت سے باطل نہیں ہوتی۔

(فتح جلد ۲۲ ص ۲)

ہاں شریعت بلاشبہ منسوخ ہو جایا کرتی ہے، یعنی اصول تو باقی رہتے ہیں، فروعات میں دوسرے نبی کے بعد تبدیلی ہو جاتی ہے، تاآنکہ سب کے اخیر میں رسول الثقلین صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، اور آپ کی شریعت کبھی منسوخ نہ ہوگی، قیامت تک یہی شریعت جاری رہے گی، اس وجہ سے قرآن نے آپ کو خاتم النبیین کہا ہے نیز اعلان کیا

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔

آج میں پورا کر چکا تمھارے لئے تمھارا دین اور پورا کیا تم پر اپنا احسان اور پسند کیا تمھارے لئے اسلام کو دین

ایک اور بات یہیں کہہ دینے کی ہے کہ انبیاء و مرسلین میں قوتِ نظری و قوتِ عملی دونوں کامل ہوتی ہیں، عوام میں یہ دونوں قوتیں ناقص ہوتی ہیں، لہٰذا نہ یہ خود کامل ہوتے ہیں، نہ دوسروں کو کامل کر سکتے ہیں، اولیاء و صلحا خود تو کامل ہوتے ہیں، اور دوسروں کو فائدہ بھی پہنچاتے ہیں مگر دوسروں کو کامل نہیں کر سکتے، بخلاف ان دونوں گروہوں کے انبیاء و مرسلین خود بھی کامل ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی کامل کر سکتے ہیں اور اس طرح یہ ساری کائنات انسانی میں امتیازی حیثیت کے مالک ہوتے ہیں۔

اور یہ حیرت کی چیز نہیں، کون نہیں جانتا مختلف مخلوقات میں حیوان افضل ہے اور حیوانوں کی انواع میں انسان اشرف ہے، اسی طرح انسانوں کی صنف میں سب سے افضل انبیاء و مرسلین ہوتے ہیں، یہ انسانیت کی اس سرحد پر ہوتے ہیں، جہاں جا کر اس کی بلند سطح ختم ہوتی ہے۔

انبیاء و مرسلین روحانی امراض کا علاج کرتے ہیں، کیوں کہ یہی بیماری انسان کو خدا سے اعراض کرنا، اور دنیا میں انہماک پیدا کرنا سکھاتی ہے، جو سب سے بڑا انسانی عیب ہے، انبیاء و مرسلین ان روگوں کو دور کرتے ہیں، اور انسانوں کو خدا کے راستہ پر لگا دیتے ہیں، دنیا میں انہماک سے بچاتے ہیں اور نجات کی فکر پیدا کرتے ہیں۔

علامہ شبلی نعمانی نے الکلام حصہ دوم میں بڑے اچھے انداز میں ثابت کیا ہے کہ انبیاء و مرسلین خود کامل ہوتے ہیں اور دوسروں کی بھی تکمیل کرتے ہیں، سورہ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى میں الٰہیات کا بیان ختم کرکے نبوت کا بیان شروع کرتے ہوئے ارشاد ہے سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى ہم آپ کو قرآن پڑھا دیا کریں گے پھر آپ نہیں بھولیں گے۔

اس آیت میں انبیاء و مرسلین کی قوتِ نظری کے کمال کا بیان ہے یعنی ان کو نفسِ قدسی عطا کیا گیا ہے، جو غلطی و نسیان سے محفوظ ہوتا ہے، البتہ اقتضائے بشریت اس سے مستثنیٰ ہے

وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى — اور ہم آپ کو شریعت کے لئے سہولت دیں گے

اس میں قوتِ عملی کے کمال کی طرف لطیف اشارہ ہے، یعنی ان میں یہ ایک ایسا ملکہ ودیعت ہوتا ہے، جس کی وجہ سے ان سے وہی کام سرزد ہوتے ہیں جو موجبِ سعادت و راحت ہیں۔

فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى — سو آپ نصیحت کیا کیجئے اگر نصیحت کرنا مفید ہوتا ہو

اس میں ناقصوں کی اصلاح کی طرف اشارہ ہے، باقی ناقصوں میں دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔

سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى — وہی شخص نصیحت مانتا ہے جو ڈرتا ہے

یہ حق قبول کرنے والوں کا گروہ ہے۔

وَيَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى الَّذِيْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى — اور جو سخت بدنصیب ہو وہ اس سے گریز کرتا ہے جو بڑی آگ میں داخل ہوگا۔

یہ وہ گروہ ہے، جس میں حق قبول کرنے کی استعداد نہیں ہوتی، اسی وجہ سے کہا گیا

ثُمَّ لَا یَمُوتُ فِیہَا وَلَا یَحْیٰی
پھر نہ اس میں مرہی جائے گا اور نہ جئے گا۔

نہ مرنا اس وجہ سے کہ ان میں روح زندہ ہوتی ہے، اور نہ زندہ رہنا اس لئے کہ ایسا جینا جینا نہیں ہے، بلکہ موت سے بھی بدتر ہے،

انبیار و مرسلین کا بنیادی کام یہ ہوتا ہے کہ شر مٹ جائے، اور خیر کی تعلیم ہو۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی
بامراد ہوا جو شخص پاک ہوگیا۔

اس میں شر مٹانے کی طرف اشارہ ہے

وَذَکَرَ اسْمَ رَبِّہٖ فَصَلّٰی
اور اپنے رب کا نام لیتا اور نماز پڑھتا رہا

اس میں خیر کی تعلیم کی طرف اشارہ ہے

جس طرح کوئی نبی اللہ تعالیٰ کے درجہ کو کسی حال میں نہیں پہونچ سکتا، اور ہر حال میں وہ خدا کا بندہ ہی ہوتا ہے، اسی طرح کوئی بڑے سے بڑا ولی اور صالح، نبی کے درجہ کو کبھی نہیں پا سکتا کیونکہ نبی معصوم ہوتا ہے، وحی سے نوازا جاتا ہے، ملائکہ کا مشاہدہ کرتا ہے، احکام کی تبلیغ کرتا ہے اور بڑے بڑے اولیار کے کمالات سے متصف ہو کر مخلوق کی رہنمائی کے فرائض انجام دیتا ہے، اسی کو امام ربانی مجدد الف ثانی نے مکتوبات میں کہا ہے، کہ جہاں جا کر ولایت ختم ہوتی ہے، وہاں سے نبوت کی ابتدا ہوتی ہے، اس لئے اولیار کمالاتِ نبی میں سے کسی کمال تک نہیں پہنچ سکتے ہیں۔

انبیار و مرسلین میں رسولوں کا درجہ انبیار سے بڑھا ہوا ہوتا ہے، پھر رسولوں میں بھی درجات و کمالات کے اعتبار سے بعض بعض سے افضل ہوتے ہیں، اور تمام انبیار و مرسلین میں سب سے افضل سید الکونین رسول الثقلین، رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

انبیار و مرسلین کی تعداد کے متعلق اختلاف ہے صحیح ابن حبان میں ابوذر رضؓ سے روایت ہے کہ پوچھنے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک لاکھ چوبیس ہزار، پوچھا گیا ان میں رسول کتنے ہیں ارشاد ہوا، تین سو تیرہ، بعض روایات میں انبیار کی تعداد دو لاکھ چوبیس ہزار بتائی گئی ہے مگر اس روایت کا پتہ نہیں چلتا کہ کیسی ہے[1] اس سلسلہ میں امام شوکانی نے حضرت ابو امامہ باہلیؓ

[1] بغیۃ الرائد ص۲۷ مسند احمد میں بھی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار منقول ہے شرح فقہ اکبر ص۶۹

سے روایت نقل کی ہے کہ ایک شخص نے آپ سے پوچھا

یارسول اللہ کم الانبیاء قال مائة الف واربعة وعشرون الفا قال یارسول اللہ کم کانت الرسل من ذالک قال ثلثمائة وخمسة عشر جما غفیرا اخرجه ابن حبان وابن ابی حاتم والطبرانی والحاکم وصححه والبیهقی .... وصرح بان السائل ابوذر	یارسول اللہ کتنے انبیاء ہوئے فرمایا ایک لاکھ چوبیس ہزار عرض کیا گیا ان میں کس قدر رسل تھے۔ فرمایا تین سو پندرہ کی ایک کثیر جماعت۔

(فتح القدیر للشوکانی ج۱ ص۵۶)

اولیٰ یہ ہے کہ انبیاء کی تعداد کے سلسلہ میں کسی معین تعداد پر اختصار نہ کیا جائے، قرآن نے بھی اجمالی تذکرہ کیا ہے ارشادِ ربانی ہے

مِنْهُمْ مَنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَنْ لَمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ (پ۲۴)	بعض اُن میں وہ (پیغمبر) ہیں کہ سنائے ہم نے آپ کو اُن کے احوال اور بعض وہ ہیں کہ اُن کے احوال نہیں سنائے۔

احتیاط بھی تعداد کے باب میں ابہام و اجمال ہی ہے، تمام پیغمبروں پر ایمان لانا چاہیے تعداد کا لحاظ نہ کرنا چاہیئے، جن کا تفصیلی حال معلوم ہو سکا ہے، ان پر تفصیلی ایمان رکھنا چاہیئے قرآن مجید میں انبیاء کے پچیس نام آئے ہیں، وہ یہ ہیں

ھم آدم، ادریس، نوح، ھود، یونس، الیاس، الیسع، داؤد
اسحاق، ابراہیم، لوط، موسیٰ، ذوالکفل، یحییٰ، زکریا، عیسیٰ
شعیب، ثم صالح، ایوب، ہارون، ثم یوسف، یعقوب
ثم سلیمان و اسماعیل محمد ختمھم الجلیل

ابن خلدون اور اس کا مقدمہ

از
جناب ڈاکٹر محمد احمد صاحب صدیقی پروفیسر یونیورسٹی (الہ آباد)

(۴)

(۷) (فتح (عطائی علم) اللہ کی جانب سے ہے) ابن خلدون کا اعتقاد ہے کہ کل تعلیم کا حاصل ہونا نہ استعداد سے ہوتا ہے نہ کوشش سے۔ بلکہ اس میں ایک طبیعی جزء کی ضرورت ہوتی ہے جو اللہ کی طرف سے عطا ہوتا ہے، اس لئے جب تمہیں کوئی دشواری سمجھنے میں پیش آئے یا شبہات کا زور شور ہو تو تم اس کو الگ کردو اور اس فکر طبعی کی فضا میں پہونچ جاؤ جس پر تمہاری فطرت ہے اور اپنے ذہن کو اسی فضا میں اپنا مقصد حاصل ہونے کے لئے مشغول کردو۔

نیز کئی چیزیں ایسی ہیں جو تعلیم سے مانع ہیں مثلاً (۱) تالیفات کی کثرت۔ جن میں سے چند کا پڑھنا بھی طالب علم کی استطاعت سے باہر ہوتا ہے سب کے پڑھنے کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ (۲) فنی رایوں اور مسلکوں کی کثرت۔ جس سے طالب علم کا وقت فلاں اور فلاں کے جھگڑے میں ضائع ہو جاتا ہے۔ ابن خلدون طالب علم کو نصیحت کرتا ہے کہ وہ اختلاف کرنے والوں کی رایوں کے سمجھنے سے زیادہ فن کے نفس مسائل سمجھنے کا قصد کرے (۳) داخل نصاب تعلیم کتابوں کا ایسا اختصار کہ علم کے مسائل چیستاں اور پہیلی بن کر رہ گئے۔ جن کا سمجھنا مبتدی طالب علم کی عقل پر نہایت دشوار ہو گیا ہے۔ پھر ابن خلدون کہتا ہے کہ علوم دو قسم پر ہیں۔

(۱) علوم مقصود بالذات جیسے تفسیر قرآن کریم اور حدیث اور فقہ اور علم کلام اور طبعیات والٰہیات۔ ان علوم کو وسیع پیمانہ پر حاصل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے (۲) وہ علوم جو علوم مذکورہ کے وسیلے اور بمنزلہ آلہ کے ہیں جیسے علوم عربیہ (نحو و بلاغت) اور حساب و منطق۔ ان علوم کی طرف ان کے آلہ ہونے کی حیثیت ہی سے نظر کرنی چاہئے ورنہ اُن میں مشغول ہونا بے کار ہوگا کیوں کہ ان پر بلکہ حاصل ہونا دشوار امر ہے اور بسا اوقات یہ شغل علوم مقصودہ بالذات کے حاصل کرنے سے مانع ہو جاتا ہے۔ پس جب طلبہ اپنی زندگی

وسائل کے حاصل کرنے میں صرف کر دیں گے تو مقاصد میں کب کامیابی حاصل کریں گے؟ اس لئے ان علوم آلیہ کے معلموں کو چاہئے کہ ان میں زیادہ پھیلاؤ نہ کریں اور طالب علم کو ان علوم کے غرض سے خبردار کریں اور بس اتنے ہی پر ٹھہر جائیں۔ اس کے بعد جس متعلم کی ہمت کا یہ تقاضا ہو کہ وہ علوم آلیہ میں سے کسی علم میں کمال اور تبحّر پیدا کرے تو وہ بقدرِ حوصلہ جس قدر چاہے ترقی کرے۔

۸۔ ابن خلدون کی ادبی رائیں۔ مورخین ابن خلدون کی ادبی رایوں کی طرف کم توجہ کرتے ہیں اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اس لئے کہ اس کی اجتماعی رائیں ذہنوں پر ایسی چھاگئیں کہ مقدمہ میں اور ذکر کی ہوئی چیزوں کی طرف تبصرہ نگاروں کی نگاہیں نہ اٹھیں اور خود ابن خلدون کا مقصد بھی صرف احوالِ اجتماعیہ کا بیان کرنا ہے جس کے ضمن میں دوسرے امور مذکور ہو گئے ہیں اور انہیں میں سے عوارضِ ادبیہ ہیں ابن خلدون کا یہ اعتقاد ہے کہ عربِ اولین کے پاس فصیح لغت مع فصاحتِ لفظ و متانتِ ترکیب وصحتِ اعراب کے بمنزلہ ملکہ کے زبان میں تھی جسے چھوٹا بڑے سے بذریعہ نقل ومحاکاۃ صحیح و درست روایت کرتا تھا جیسا کہ اب ہمارا حال اپنی عام بولی کے نقل کرنے میں ہے پھر جب عرب فتوحات کی وجہ سے دوسرے ممالک میں منتشر ہوئے اور عجمیوں سے ملے جلے تو ان کے کان میں وہ غلط الفاظ پڑے جنھیں مستعربین (دوسرے ملک کے لوگ جو عرب میں آگئے۔ دخیل غیر خالص) استعمال کرنے لگے تھے تو اس ملکہ میں تغیر پیدا ہو گیا "کیوں کہ کان ہی سے ملکاتِ لسانیہ پیدا ہوتے ہیں" اور لغت کا ملکہ لغت کے مفردات میں اور ان کے تراکیب میں زمانہ کے ساتھ متغیر نہیں ہوتا بلکہ نحو کے ملکہ کے فاسد ہونے سے فاسد ہوتا ہے اور اسی لئے قرآن کریم اور حدیث کے سمجھنے کے لئے نحو کی طرف توجہ کرنا لغت کی طرف توجہ کرنے سے زیادہ ضروری ہے لیکن آپس کی بات چیت میں اعراب کا نہ پایا جانا کچھ بھی مضر نہیں ہے جب کہ ہر بولنے والا اپنی بولی سے اپنے مقصود کو ادا کرتا اور اپنے مافی الضمیر کو ظاہر کرتا ہے اور یہی زبان و لغت کا معنی ہے۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے کہ موجودہ زمانہ کی عربی بولیاں لغت مُضر (فصیح عربی) کی مخالف ہیں۔ جو شخص لسانِ مُضر کے ملکہ کو حاصل کرنا چاہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ عربی کے کلام قدیم کو جو ان کے اسلوبوں کے مطابق ہیں مثلاً قرآن وحدیث وکلام سلف اور ماہرین عرب کے

اشعار و اسجاع کو حفظ کرے پھر اس کے بعد اپنے دلی خیالات کو عربی عبارت میں ان ماہرین کی عبارت اور ان کی ترکیب کلمات کے مطابق ادا کرنے کی مشق کرے۔ اس کو اس حفظ و استعمال سے وہ ملکہ حاصل ہو جائے گا۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ زبان کے قوانین کے احاطہ کے باوجود اس زبان میں ملکہ حاصل نہیں ہوتا۔ بہت سے قوانینِ نحو کے عالم ایک خط نحوی غلطی سے خالی نہیں لکھ سکتے۔ اور بہت سے قادر الکلام شاعر شعر کے بحور اور جوازات سے ناواقف ہوتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ ذوق پر موقوف ہے کہ مثلاً انسان اپنے ملکۂ راسخہ سے اپنے دلی خیالات کو اسالیبِ عرب پر ادا کرنے کے طریقوں کی طرف راہ پالے۔ اندریں حالت جب اُس پر کوئی ایسا کلام پیش کیا جائے گا جو اسلوبِ عرب سے اور ان کی بلاغتِ کلام سے ہٹا ہوا ہوگا تو وہ اس کلام سے روگردانی اور نفرت کرے گا اور سمجھ لے گا کہ یہ ان عرب کے کلام میں سے نہیں ہے جس کے کلام میں اس نے محنت کی ہے اور بسا اوقات وہ اس پر حجت لانے سے عاجز رہے گا کیوں کہ یہ ایک وجدانی امر ہے جو کلام عرب کی ممارست سے حاصل ہوتا ہے یہاں تک کہ ممارست کرنے والا بھی انھیں میں سے ایک فرد کی مشابہ ہو جاتا ہے۔

ابن خلدون نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ دو صناعتوں میں کسی انسان کو کمال نہیں حاصل ہوتا مثلاً بڑھئی کے کام میں اور سلائی کے کام میں۔ اس لئے کہ صنعتیں اور ان کے ملکات ایک محل میں سمو نہیں سکتے اور جیسے ایک صنعت میں پہلے کمال حاصل ہو گیا تو اسے دوسری صنعت میں کامل ہونا یا منتہی ہونا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے اس نے اس قاعدہ کو نثر اور شعر پر منطبق کیا ہے اور یہ طے کر لیا ہے کہ ان دونوں میں پورا جید ہونا بہت ہی کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک شعر اور نثر کے درمیان میں فارق اور امتیاز پیدا کرنے والے الفاظ ہیں معانی نہیں۔ معانی تو الفاظ کے تابع ہیں کیوں کہ ہر شخص کے پاس معانی موجود ہیں اور اس میں ہر فکر کی استطاعت ہے جیسے وہ چاہے اور پسند کرے اس لئے اس میں صناعت کی طرف حاجت واقع نہیں ہوتی اور کلام کی ترکیب ان معانی کو بیان کرنے کے لئے صناعت کی محتاج ہے کلام معانی کے لئے بمنزلہ قالب کے ہے۔ تو جس طرح وہ برتن جس میں دریا سے پانی لیا جاتا ہے کوئی سونے کا کوئی چاندی کا کوئی سیپ کا کوئی شیشے کوئی مٹی کا ہوتا ہے اور پانی ایک ہی ہوتا ہے۔ پانی سے بھرے

ہوئے برتنوں میں ان کی جنس کے اختلاف سے بڑھیا گھٹیا ہونے کا فرق ہوتا ہے پانی کے مختلف ہونے کی وجہ سے نہیں۔ اسی طرح لغت کی خوبی اور بلاغت استعمال میں تالیف میں طبقاتِ کلام کے مختلف ہونے کے سبب سے ہے اور یہ مقاصد پر منطبق ہونے کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے۔ معانی ایک ہی ہوتے ہیں اور اسی لئے نظم یا نثر کی خوبی نظم یا نثر محفوظ یا مسموع کی خوبی کے تابع ہوتی ہے۔ اسلامی شعراء مثلاً حسان و عمرو جریر و بشار کے اشعار بلاغت میں نابغہ و عنترہ و ابن کلثوم و زہیر کے اشعار سے بڑے درجے میں ہیں کیونکہ ان لوگوں نے قرآن کریم اور حدیث سے اپنے کلام میں استفادہ کیا ہے اور قرآن و حدیث وہ کلام ہے جس کے مثل تمام انسان لانے سے عاجز رہے اس لئے اسلامی شعرا کی طبیعتیں بلند اور ان کے ملکات بلاغت میں اہلِ جاہلیت کے ملکات پر فائق ہوئے۔

ابن خلدون کی باقی رائیں۔ جب کہ ابن خلدون نے جمیع علوم کو جو آبادی میں ہوتے ہیں "علم العمران یا علم الاجتماع" کے تحت درج کر دیا ہے تو ہمارے لئے ضروری ہے کہ اس کے طریقے کے موافق اس کو ذکر کریں۔ تفصیل سے قطع نظر ہم یہ کر سکتے ہیں کہ ان علوم پر کلام کریں جن کا ذکر آرہا ہے (جو درحقیقت ابن خلدون کے نزدیک علم الاجتماع میں داخل ہیں) مثلاً اقتصاد و سیاست اور تربیت و تعلیم، منطق اور جغرافیہ و فلک و علم النفس۔ لیکن اس سے ابن خلدون کی رایوں کے سمجھنے میں پریشانی ہوگی۔ ابن خلدون نے مقدمہ اس غرض سے نہیں لکھا کہ اس میں علم الاقتصاد و سیاست و جغرافیہ وغیرہ کے مباحث بیان کئے جائیں اس نے تو مقدمہ اس غرض سے تالیف کیا ہے کہ اس سے یہ معلوم ہو جائے۔ یہ سب علوم علم الاجتماع کے مظاہر اور اس کے تابع ہیں۔ اور ان کل مظاہر کی غایت تاریخ کی حقیقی سمجھ تک پہنچنا ہے۔ اسی وجہ سے ان چند اوراق میں کم ازکم یہ ضروری ہے کہ اجتماع کے فنون مختلفہ میں ابن خلدون کی رایوں کی ایسی مزاولت پر توجہ دی جائے جس سے معلوم ہو کہ یہ فنون موضوعِ واحد کے مظاہر ہیں یہ نہیں کہ وہ مستقل موضوع ہیں۔

(ابن خلدون کی کچھ نئی پسندیدہ باتیں اور اس کے اسلوب کا بیان)

۱۔ برامکہ کی مصیبت کا سبب۔ برمکیوں پر مصیبت نازل ہونے کا سبب یہ ہوا کہ وہ امورِ سلطنت

میں خود مختار اور مستقل ہو گئے تھے اور ٹیکس کا مال خود وصول کر لیتے تھے یہاں تک کہ ہارون رشید کو تھوڑا مال طلب کرنے پر بھی نہ ملتا تھا، وہ لوگ اس کے امر پر غالب تھے اور حکومت میں اس کے حصہ دار بنے ہوئے تھے، رشید کو ان کے ہوتے ہوئے ملکی امور میں کچھ دخل نہ تھا ان کے اثرات عظیم ہو گئے تھے اور ان کا شہرہ دور تک پہنچ گیا تھا۔ ان لوگوں نے حکومت کے عہدوں کو اور اس کی زمینوں کو اپنی اولاد کے رئیسوں سے بھر دیا تھا۔ مثلاً وزارت، کتابت، قیادت، حجابت اور سیف و قلم۔ کہا جاتا ہے کہ رشید کے دربار میں یحییٰ بن خالد کی اولاد میں سے پچیس سردار تھے بعض صاحب سیف بعض صاحب قلم، برمکیوں نے ان عہدوں اور جائدادوں کے حاصل کرنے میں ارا کین حکومت کو اپنی طاقت سے مغلوب کر دیا تھا کیونکہ برامکہ کا باپ یحییٰ بن خالد ہارون کا ولی عہد ہونے کی حالت میں اور خلیفہ ہونے کی حالت میں پرورش کنندہ اور اتالیق تھا اسی کے گود میں وہ جوان ہوا اور بادشاہ ہوا۔ رشید اسے یا ابت (اے ابا) کہہ کر پکارتا تھا اس وجہ سے خلیفہ کی عنایت اُن کی طرف بہت ہوئی۔ برمکیوں میں ناز و تمکنت بڑھی اور جاہ عظیم حاصل ہوئی، لوگوں کے رُخ ان کی طرف پھر گئے۔ گردنیں ان کے سامنے جُھک گئیں اور ان پر امیدیں جم کر رہ گئیں۔ دور دراز مقامات سے بادشاہوں کے ہدایا اور اُمراء کے تحفے ان کے پاس پہنچنے لگے۔ اور ان کا تقرّب حاصل ہونے اور ان کو مائل کرنے کے لئے ٹیکس کے اموال ان کے پاس دھڑا دھڑ آنے لگے۔ انھوں نے شیعہ اشخاص کو اور قرابت کے بڑے لوگوں کو عطایا سے مالا مال کر دیا، احسانات کا طوق انھیں پہنا دیا، شریف خاندانوں کے ناداروں کے لئے کمانے کی صورت پیدا کر دی، قیدیوں کو آزاد کیا اور ان کی ایسی مدح کی گئی کہ خلیفہ کی بھی نہیں کی گئی انھوں نے سائلین کو عطایا اور انعامات دیئے اور پورے ملک میں دیہات اور شہروں کی بستیوں اور زمینوں پر قابض ہو گئے۔ یہاں تک کہ خاندان کے لوگوں کو بھرپور کر دیا اور معززین کو ناخوش اور ارکان حکومت کو ناراض کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مقابلہ اور حسد کے راستے کُھل گئے اور ان کے نرم بستروں پر چغلخوری کے بچھو رینگنے لگے۔۔۔ یہاں تک کہ ان کی بلندی گر گئی، آسمان ان پر ٹوٹ پڑا اور وہ مع اپنے گھروں کے زمین میں دھنس گئے اور ان کے حالات آئندہ آنے والوں کے لئے عبرت بن گئے۔

۲۔ جائے قیام کا اثر انسان کے رنگ اور اخلاق پر۔ کچھ علمائے نسب کا جنھیں کائنات کے طبائع کا کچھ علم نہیں ہے، یہ خیال ہے کہ حبشی لوگ حام بن نوح کی اولاد ہیں، ان کا رنگ اس وجہ سے سیاہ ہوا کہ حام کے باپ نے اس پر بددعا کی تھی اس کا اثر اس کے رنگ پر ظاہر ہوا ... اور اس کے متعلق ایک قصہ بیان کرتے ہیں جو واعظین کی واہیات باتوں میں سے ہے ... اس قول میں گرمی اور سردی کی طبیعت سے اور ہواؤں اور ان حیوانات میں جو اس میں ہوتے ہیں گرمی اور سردی کے اثر سے غفلت کی گئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ رنگ (کالا) اقلیم اول اور اقلیم ثانی والوں کو شامل ہے، ان کی ہوا کے مزاج سے بہ سبب شدید حرارت کے جو جنوب میں ہے۔ اس لئے کہ ہر سال آفتاب دو دفعہ ان کے سروں کے برابر ہو جاتا ہے اور یہ دونوں قریبی زمانہ میں ہوتے ہیں اس لئے دھوپ زیادہ ہوتی ہے اور ان پر گرمی کی شدت بڑھ جاتی ہے اور گرمی کی زیادتی کی وجہ سے ان کے چمڑے سیاہ ہو جاتے ہیں ان دونوں اقلیموں کے مقابلے میں شمال میں اقلیم سادس و سابع کا حال ہے کہ گورا (سفید) رنگ وہاں کے رہنے والوں کو ان کے ہوا کے مزاج سے بہ سبب سخت سردی کے شامل ہے۔

۳۔ مغلوب و غالب۔ ... نفس ہمیشہ اس شخص میں کمال کا معتقد ہوتا ہے جو اس پر غالب ہوتا ہے اور نفس جس کا مطیع ہو جاتا ہے ... اسی وجہ سے مغلوب ہمیشہ غالب کے ساتھ اس کے لباس، سواری، ہتھیار اور تمام احوال میں تشبہ اختیار کرتا ہے۔ کسی ملک میں دیکھ لو کہ وہاں کے رہنے والوں پر حکام اور فوج کی پوشاک و ہیئت زیادہ تر غالب رہتی ہے کیوں کہ وہ لوگ ان پر غالب ہوتے ہیں۔ بلکہ وہ جماعت جو دوسری ایسی جماعت کی پڑوسی ہوتی ہے جو غالب ہے۔ مغلوب میں غالب کے تشبہ اور پیروی کا بڑا حصہ آجاتا ہے یہی اس قولِ مشہور کی وجہ ہے۔ العامۃ علی دین الملک یعنی عوام لوگ بادشاہ کے طریقہ پر ہوتے ہیں۔ کیوں کہ بادشاہ اپنے ماتحتوں پر غالب ہوتا ہے اور رعایا اس میں کمال کے اعتقاد کی وجہ سے اس کی پیروی کرتی ہے اور کوئی قوم جب مغلوب ہوتی ہے اور دوسرے کی ملک ہو جاتی ہے تو سمجھ لو کہ اس کی فنا قریب ہے۔ اس کا

سبب یہ ہے کہ اس کے نفوس میں کاہلی اور سُستی آجاتی ہے جب کہ اس کے اختیار کا غیر مالک ہوگیا
اور وہ غلامی کی وجہ سے دوسروں کا آلۂ کار بن گیا اور عملاً دوسروں کا لے پالک ہوگیا تو اس کی امید کوتاہ
اور اس کی نسل کم زور ہوجاتی ہے۔ دراصل آباد کاری امید کی عظمت اور اس امنگ سے جو قوائے
حیوانیہ میں امید سے پیدا ہوتی ہے اور اسی وجہ سے سوڈان کی قوموں میں غلامی کی زیادتی ہے۔
کیونکہ ان میں انسانیت کی کمی ہے اور وہ تقریباً چوپایوں کے درجہ میں ہیں یا غلامی ان لوگوں میں
ہے جو رشتۂ غلامی میں منسلک ہونے سے کسی عہدہ یا مال یا اعزاز حاصل ہونے کی امید رکھتے ہیں۔
جیسا کہ مشرق میں ترک ممالک کے لئے اور جلالقہ اور فرنگ کے کفار کے لئے ہوتا ہے کہ وہاں کے
لوگوں کی عادت ہے کہ اُن لوگوں کے لئے حکومت قائم کرتے ہیں اور غلام بننے سے عار نہیں کرتے کیونکہ
ان کو ان لوگوں کی حکومت ہوجانے سے جاہ و رتبہ ملنے کی امید ہوتی ہے۔
۴۔ کسٹم اور گورنمنٹ کی تجارت۔ حکومت ابتداء میں بدوی طرز (سادگی) کی ہوتی ہے، اس
لئے اس کی ضرورتیں کم ہوتی ہیں تو اس کی آمدنی اور خرچ دونوں کم ہوتے ہیں۔ کچھ ہی عرصہ کے بعد یہ
شہریت کا ڈھنگ، آسائش اور اس کے اسباب میں اختیار کرنے لگتی ہے اور اپنے سے پہلی حکومتوں
کے طریقہ پر چلتی ہے اس وجہ سے اراکینِ دولت اور بادشاہ کے اخراجات بڑھ جاتے ہیں اور ملک کا
خراج ان کے لئے ناکافی ہوجاتا ہے اس لئے گورنمنٹ کو خراج بڑھانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور اس
طرح وظیفوں اور تنخواہوں کی مقداریں زیادتی ہوجاتی ہے، حکومت میں ضعف پیدا ہوجاتا ہے
اور اس کی جماعت اطرافِ بعیدہ سے کم زور ہوجاتی ہے اس طرح خراج کم پڑجاتا ہے تب گورنمنٹ
طرح طرح کے نئے ٹیکس نکالتی ہے جس کو مال بیچنے والوں پر مقرر کرتی ہے اور اس کی ایک مقدار
مقررہ قیمتوں پر بازاروں میں اور شہر کے مالوں میں خود اموالِ تجارت پر لگادیتی ہے۔ بسا اوقات
یہ زیادتی حکومت کے آخری زمانہ میں بہت ہی بڑھ جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بازار عام مایوسی
کی وجہ سے کاسد ہوجاتے ہیں اور یہ چیز آبادی کے بگڑ جانے کی نشان دہی کرتی ہے۔ پھر جب حکومت
کی حاجت بڑھتی ہے تو کبھی وہ ٹیکسوں کے نئے نئے ناموں اور عنوانوں کے لئے مجبور ہوتی ہے اگر

ٹیکس پہلے سے جاری ہو چکے ہیں، کبھی بادشاہ کے لئے تجارت اور کاشتکاری خراج کے نام سے تجویز کی جاتی ہے کیوں کہ وہ تاجروں اور کاشتکاروں کو دیکھتے ہیں کہ گو ان کے پاس مال کی تھوڑی پونجی ہوتی ہے مگر وہ فوائد و منافع زیادہ حاصل کرتے ہیں اور کامیاب ہوتے ہیں اور چوں کہ نفع راس المال کی نسبت سے ہوتا ہے اس لئے کارکنانِ حکومت حیوانات اور نباتات حاصل کرنے میں لگ جاتے ہیں کیوں کہ ان اشیاء کے خریدنے میں فوائد زیادہ ہیں اور ان کے اسباب کا حصول نسبتاً سہل اور آسان ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رعایا تو آسانی اور ذرائع سہولت میں تقریباً مساوی ہوتی ہے اور اس میں ایک کی دوسرے سے مزاحمت ختم یا قریب ختم کے ہو جاتی ہے مگر جب رعایا کا بادشاہ اس میں شریک ہو جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس کا مال ان لوگوں سے بہت زیادہ ہوتا ہے تو یہ بات مستبعد ہوتی ہے کہ ان میں سے کوئی کسی شئے میں اپنی حاجات میں سے اپنی غرض حاصل کر سکے۔ انجام کار اس سے دلوں پر غم اور پریشانی چھا جاتی ہے۔ پھر بادشاہ کبھی اس میں سے بہت سا مال بہ طریقِ غصب یا تھوڑے داموں پر نکال لیتا ہے کیوں کہ اس سے جھگڑا کرنے والا کوئی نہیں ہوتا تو وہ بائع پر دام گھٹا دیتا ہے۔
پھر جب کاشتکاری وغیرہ کے فوائد غلہ ریشم شہد اور شکر وغیرہ اور سوداگروں کے اموال ہر قسم کے حاصل ہوتے ہیں تو اہلِ حکومت بازاروں کے نرخ کا انتظار نہیں کرتے اور نہ اشیا کے چلن کا۔ کیوں کہ حکومت کی ضرورتیں اس کو متحمل نہیں ہوتیں۔ بالآخر تاجر یا کاشتکار کو ان چیزوں کے خریدنے پر مجبور کرتے ہیں اور ان کے دام قیمت کے برابر بلکہ اس سے زیادہ لئے بغیر رضامند نہیں ہوتے اور کبھی یہ امرا اور شہر کے غالب و قاہر لوگ جو زراعت یا تجارت کے کاموں پر گورنمنٹ کی طرف سے مقرر کئے گئے ہیں یہاں تک کر بیٹھتے ہیں کہ غلوں اور اسبابِ تجارت کو ان کے مالکوں سے جو ان کے شہروں میں وارد ہوئے ہیں خریدنے پر آمادہ ہوتے ہیں اور دام جو کچھ چاہتے ہیں مقرر کر دیتے ہیں اور ان اشیا کو اسی وقت اپنی ماتحت رعایا کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں۔ اور دام حسب منشار مقرر کرتے ہیں۔ یہ صورت پہلی صورت سے بھی زیادہ سخت ہے، رعایا کو زیادہ برباد کرنے والی اور ان کی حالت کو زیادہ خراب کرنے والی۔
۵۔ شہروں کے نرخ۔ جب شہر زیادہ وسیع ہو جاتا ہے اور اس کے رہنے والے بہت ہو جاتے ہیں۔

توضروری اشیا مثلاً غذا وغیرہ کا نرخ ارزاں ہوجاتا ہے اور کمالی اشیا مثلاً ترکاری اور میوہ جات وغیرہ کا نرخ گراں ہوجاتا ہے، جب شہر کے رہنے والے کم ہوجاتے ہیں اور آبادی کم زور ہوجاتی ہے تو اس کے برعکس ہوتا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ اناج غذا کی ضروریات میں سے ہے اس لئے اناج حاصل کرنے کے دواعی اور وجوہ کثیر ہوتے ہیں کیوں کہ ہر شخص اپنے اور اپنے متعلقین کے لئے ایک مہینہ یا ایک سال کی غذا کا مہیا کرنا ضروری جانتا ہے اس لئے کل اہل شہر یا ان میں سے زیادہ تر اس شہر میں یا شہر سے قریبی مقام میں غلہ لیتے ہیں اور ہر غلہ لینے والے کے پاس اس کی اور اس کے گھر والوں کی خوراک سے بہت کچھ بچ جاتا ہے جس سے بلاشک اس شہر کے بہت سے رہنے والوں کی ضرورت پوری ہوجاتی ہے اس وجہ سے اکثر غلوں کا نرخ ارزاں ہوجاتا ہے۔ رہے دوسرے سامان ترکاری و میوہ جات وغیرہ تو ان کی اتنی زیادہ عام حاجت نہیں پڑتی۔ پھر جب شہر وسیع اور کثیر آبادی والا ہوجاتا ہے اور اس میں راحت و آسائش کی ضرورتیں بڑھ جاتی ہیں، تو ان اشیاء کمالیہ کو طلب کرنے کے دواعی اور رجحانات بھی زیادہ ہوجاتے ہیں اور ہر ایک شئی کی اس کی حالت کے مناسب مانگ ہوتی ہے تو ان اشیاء کا موجودہ اسٹاک حاجات کے اعتبار سے بہت کم رہ جاتا ہے اور خریدار زیادہ ہوجاتے ہیں، اس طرح سامان فروخت کرنے والوں کا ہجوم ہوجاتا ہے۔ اور راحت طلب اور آسائش پسند روسا زیادہ قیمت دے کر انھیں خریدتے ہیں کیوں کہ اوروں کی بہ نسبت ان کو ان اشیاء کی زیادہ حاجت ہوتی ہے اس لئے ان چیزوں کا نرخ گراں ہوجاتا ہے۔

۶۔ بادشاہ کو حکومت میں تصرف کرنے سے باز رکھنا۔ جب ملک ایک خاص حالت میں اور ایک خاندان میں جو حکومت قائم کرنے والے ہیں مستحکم ہوجاتا ہے اور یہ اس پر تنہا مستقل ہوکر جم جاتے ہیں اور باقی جماعتوں کو مغلوب کر دیتے ہیں اور پھر ان کی اولاد یکے بعد دیگرے دوسروں کی مدد اور حمایت سے حکومت کرتی ہے۔ تب اکثر وزیروں اور مصاحبوں کی طرف سے حکومت کے منصب پر غالب ہونے کی کارروائی ظاہر ہوتی ہے اور اس کا سبب زیادہ تر یہ ہوتا ہے کہ کوئی نابالغ لڑکا اپنے باپ کا ولی عہد ہونے کی وجہ سے یا کوئی کم زور شخص اپنے قرابتمندوں، رشتہ داروں

اور خادموں کی حمایت اور طرف داری سے بادشاہ بنا دیا جاتا ہے مگر وہ ملک کے انتظام سے عاجز نظر آتا ہے تب اس کے باپ کے وزیروں اور اس کے مصاحبوں اور غلاموں میں سے یا اس کی جماعت میں سے کوئی شخص اس کا کفیل ہو کر کام انجام دیتا ہے اور اگرچہ بہ ظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس کے اختیارات کی حفاظت کر رہا ہے مگر فی الحقیقت اس کو اپنی حکومت کا ذریعہ بناتا ہے اور اس نا بالغ کو لوگوں سے الگ رکھتا ہے، اس کو راحت و آسائش کا خوگر بناتا ہے اور اس کے دل سے شاہی امور میں غور کرنے کی بات کو بھلا دیتا ہے تاکہ اس میں استقلال پیدا ہی نہ ہو اور یہ بچہ آسائش کا خوگر ہونے کی وجہ سے یہ سمجھتا ہے کہ ملک میں بادشاہ کا حصہ صرف تخت پر بیٹھنا، عطیے عطا کرنا ڈرانا دھمکانا اور حجاب کے پیچھے بیٹھنا ہے، امورِ سلطنت کا بست و کشاد اور لشکر و مال اور سرحدوں پر نظر کرنا وزیر کا کام ہے۔۔۔ یہ بات زیادہ تر آسائش کی حالتوں میں اور شاہزادوں کی ناز و نعمت کی پرورش میں پائی جاتی ہے، وہ جوانمردی کے زمانہ کے کارناموں کو بھول جاتے ہیں اور دایہ اور آیا کی عادتوں سے مالوف ہو جاتے ہیں اور انھیں طریقوں پر نشو و نما پاتے ہیں اس لئے نہ وہ سرداری کی طرف راغب ہوتے ہیں اور نہ غالب ہونے کے استقلال کو سمجھتے ہیں، ان کا اہم مقصد ظاہری شان و شوکت پر قناعت کرنا اور لذاتِ نفس اور آسائش و راحت کی صورتوں میں منہمک رہنے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

قائدین کی تربیت اور اوصاف و خصائص

از

مولانا محمد تقی صاحب امینی مدرسہ معینیہ درگاہ شریف اجمیر

(۲)

فنائیت کے چند اثرات جو قائدین کی داخلی و خارجی زندگی میں نمودار ہوتے ہیں

ذیل میں فنائیت کے چند اثرات ذکر کئے جاتے ہیں جو قائدین کی داخلی و خارجی زندگی میں نمودار ہوتے ہیں۔

(۱) ارادہ میں پختگی اور عزم میں مضبوطی۔

یہ وصف زندگی کا ایسا جوہر ہے کہ اس کے حاصل ہونے کے بعد کامیابی قدم چومنے پر مجبور ہو جاتی ہے، دنیا کے ہر انقلاب کی پشت پناہی اسی نے کی ہے، پہاڑوں کی چھاتیوں کو اس نے روندا سمندر کی سطحوں کو اس نے پاٹا، ہواؤں کے رُخ کو اس نے بدلا، سورج کی شعاعوں کو اس نے گرفتار کیا۔ ستاروں کی گذرگاہوں تک یہ پہونچا غرض دنیا کی کوئی کامیابی آپکو ایسی نہ ملے گی جو اس کے ذریعہ حاصل نہ ہوئی ہو۔

اسی بنا پر علما اخلاق کی رائے ہے کہ انسان کا مستقبل وراثت اور ماحول سے کہیں زیادہ اس کے ارادہ پر موقوف ہے[۱]

[۱] خواہش اور ارادہ میں فرق ہے ارادہ ایک فعلی اور کارکن کیفیت وحالت کا نام ہے اور خواہش ایک انفعالی اور کارپذیر حثیت ہے (افادیت صفحہ ۵ از جان اسٹوارٹ مل) ارادہ کے مختلف درجے ہیں کسی کا ارادہ فطرتاً قوی ہوتا ہے کسی کا کمزور اور کسی کا متوسط درجہ کا۔ جسم کی تربیت کی طرح ارادہ کی بھی تربیت ہوسکتی ہے یعنی وہ جس طرح ورزش وغیرہ سے ایک حد تک قوی اور سڈول ہو جاتا ہے اسی طرح کمزور ارادہ ایک حد تک قوی بن سکتا ہے اور قوی ارادہ قوی تر ہو سکتا ہے لیکن اس تربیت کے لئے بہترین زمانہ بچپن کا زمانہ ہے کیونکہ بچے ہر تربیت کو بآسانی قبول کرنے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں کچھ لوگ تیسرے چوتھے برس سے ہی حتی المقدور اس کی تعلیم و تربیت شروع کر دیتے ہیں۔

(۲) مقصد کے ساتھ والہانہ شغف (۳) محبتہ ایثار و قربانی (۴) ذاتی و شخصی حیثیت کو ختم کر کے ساری جد و جہد اور قوت کا مصرف نفع عام (۵) خلوص و بے غرضی (۶) اقتدار، عزت، شہرت، مال و جائداد کی ہوس غرض کسی فائدہ کا سامنے نہ ہونا۔ [۱]

قرآن حکیم میں جتنے انبیاء کا تذکرہ ہے اُن میں سے تقریباً سب نے بے غرضی اور قوم سے کسی قسم کے ذاتی فائدہ کی توقع نہ رکھنے کا اعلان کیا ہے چنانچہ ہر نبی کے ذکر میں مندرجہ ذیل آیت ملتی ہے

وما اسئلکم علیہ من اجر ان اجری الا علی رب العلمین

میں اپنی خدمتوں کا کوئی معاوضہ تم سے نہیں چاہتا میری مزدوری اللہ کے ذمہ ہے۔

یعنی میری حیثیت تاجر کی نہیں ہے بلکہ داعی و قائدگی ہے دونوں کی زندگیوں میں بنیادی فرق ہے، تاجر کی توقعات قوم سے وابستہ ہوتی ہیں اور محض دھوکا دینے کے لئے اللہ و مذہب اور خدمت وغیرہ کا نام لیتا ہے اور قائد کا سارا معاملہ اللہ کے سپرد ہوتا ہے اور قوم کی خدمت ادائے فرض جان کر کرتا ہے۔

فنائیت کا ایک اور اثر کہ مصیبت و تکلیف میں عیش و راحت کی لذت محسوس ہوتی ہے

فنائیت کے ایک اور اثر کا ثبوت انبیاء کرام کی زندگی میں ملتا ہے نہایت غور و فکر کا مستحق ہے اور غالباً فلسفیوں کی رسائی وہاں تک نہیں ہو سکی ہے وہ یہ کہ دعوت و تبلیغ کی راہ میں قائدین کو جو تکلیفیں پیش آتی ہیں مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے وہ اُن کے لئے عیش و راحت کی ایک نئی لذت بن جاتی ہے جس قدر اس راہ کی مصیبتیں بڑھتی جاتی ہیں اسی قدر ان کے دل کی خوشحالیوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ جو راحت و سرور

---

[۱] ہو سکتا ہے فنائیت کا یہ اثر ان فلسفیوں کی سمجھ میں نہ آئے جنھوں نے انسان کو بالطبع خود غرض قرار دیا ہے اور یہ کہا ہے کہ وہ جو کچھ کرتا ہے نفع ذات کے لئے کرتا ہے حتی کہ ماں باپ کی محبت بھی خود غرضی سے خالی نہیں ہوتی لیکن سوال یہ ہے کہ انسانی دنیا کے سارے احکام و مسائل کیا ان فلسفیوں کی تحقیقات پر ختم ہو گئے ہیں؟ کیا اس بات کی کوئی ضمانت ہے کہ جو کچھ انھوں نے کہا فطرتِ انسانی کی مطابقت میں سب کچھ یہی ہے۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں؟ اگر ہم فلسفیوں کے اس بیان کو تسلیم کر لیں جب بھی کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ کیونکہ قرآن حکیم نے قائدین کا جو نقشہ پیش کیا ہے اس کے لحاظ سے ان کے سامنے دنیوی اور مادی غرض نہیں ہوتی حقیقی اور معنوی غرض (اللہ کی رضا و محبت) بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے۔ اسی کو قرآن حکیم نے وجہ اللہ، سبیل اللہ، مرضات اللہ سے تعبیر کیا ہے۔

انھیں کانٹوں پر لوٹ کر اور آگ کے انگاروں سے کھیل کر حاصل ہوتا ہے وہ دوسروں کو پھولوں کی سیج پر لوٹ کر نہیں مل سکتا ہے۔

درج ذیل حدیث میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

والذی نفسی بیدہ لوددت	اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے میں یہ پسند کرتا ہوں
انی اقتل فی سبیل اللہ ثم احیی ثم اقتل	کہ اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں پھر زندہ ہوں اور قتل کیا جاؤں
ثم احیی ثم اقتل ثم احیی ثم اقتل[۱]	پھر زندہ ہوں اور قتل کیا جاؤں پھر زندہ ہوں اور قتل کیا جاؤں

فلسفی اس حقیقت کے ثابت کرنے میں بہت حد تک کامیاب ہوگئے ہیں کہ انسان کی ساری جد وجہد اور سارے اعمال و افعال کی غرض مسرت ہے یعنی فطرت انسانی کی جبلت میں یہ بات داخل ہے کہ وہ کسی ایسی چیز کی خواہش نہیں کرتی جو جزو مسرت ہے اور نہ اس کے حاصل ہونے کا وسیلہ۔[۲]

یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ قائدین کو مسرت کن چیزوں سے حاصل ہوتی ہے؟ سامان مسرت کس قسم کے ہیں؟ یہ حدیث قائدین کے مقام اور ان کی حیثیت متعین کرنے میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

(۴) چوتھی عملیت ہے

عملیت یہ ہے کہ نظریہ حیات کو بروئے کار لانے کے لئے سرتا پا عمل بن جائے۔	عملیت کا مطلب یہ ہے کہ قائدین نظریہ حیات کو بروئے کار لانے کے لئے سرتا پا عمل بن جائیں راہ کی مشکلات اور رکاوٹیں اس لئے نہ ہوں کہ ان کے پائے استقلال کو لغزش آجائے اور اٹھا ہوا قدم رک جائے بلکہ اس لئے

ہوں کہ وہ ان کے ذریعہ کام کی رفتار کو اور تیز کر سکیں، تحریک کو اور زیادہ بلندی کی طرف لے جاسکیں۔

اصل یہ ہے کہ قرآنی قائدین اور عام مفکرین کی راہوں میں فرق ہے قائدین میں تخیل کے ساتھ ساتھ عملیت ہونا ضروری ہے اور مفکرین کے لئے یہ ضروری نہیں ہے۔ قائدین کا کام خیالات و افکار کا پیدا کرنا اور ان کو بروئے کار لانے کے لئے سرتا پا عمل بن جانا ہے اور مفکرین کا کام صرف خیالات و افکار کا پیدا کردینا ہے۔

---

[۱] بخاری وغیرہ [۲] ملاحظہ ہو مقالہ افادیت ص۱۶ و ۴۹ از جان اسٹوارٹ مل۔

قائدین کا فرض یہ ہے کہ جس نظریۂ حیات کو اپنایا ہے اُس کو پھیلانے اور ساری دنیا کو یقین کرانے میں پُوری قوت صرف کر دیں اور مال و دولت، اہل و عیال غرض جو چیز بھی اس میں سنگِ راہ ہے اس کو ہٹا دیں اور مفکرین کا فرض یہ ہے کہ وہ خود سمجھ لیں اور زیادہ سے زیادہ دوسروں تک پہنچا دیں۔ قائدین تخیل کو عملی طور پر حقیقت اور واقعیت کا پابند بناتے ہیں اور مفکرین حقیقت و واقعیت کو تخیل کی روشنی میں دیکھتے ہیں ظاہر ہے کہ ایک کا مقام دوسرے سے کتنا بلند ہے؟ اور ایک کا کام دوسرے سے کس قدر بڑھا ہوا ہے؟

عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ غور و فکر کی طاقت اور عملیت دونوں ایک ساتھ بہت کم جمع ہوتے ہیں اسی بنا پر اجتماعیین کو یہ کہنا پڑا کہ "لیڈر عموماً ایسے افراد نکلتے ہیں جن کے اعصاب مریض اور جن کے قوائے عقلی مختل اور قریب بجنون ہوتے ہیں اعصاب کی بے حسی اُن کے جذبات کو مردہ کر دیتی ہے اور قوائے عقلی کا اختلال ان کو غور و فکر کی اجازت نہیں دیتا ہے[1]۔ اور اسی بنا پر ہم دیکھتے ہیں کہ غور و فکر کی طاقت والے عملی لحاظ سے کمزور ہوتے ہیں اور جو عملی لحاظ سے مضبوط ہوتے ہیں ان میں غور و فکر کی طاقت کم ہوتی ہے۔

قائدین میں غور و فکر کی طاقت اور عملیت دونوں کا پایا جانا ضروری ہے

لیکن انبیاء کرام کی زندگی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ان بزرگوں نے دونوں کا یکساں ثبوت پیش کیا۔ ایک طرف دماغی لحاظ سے وہ اتنے زیادہ بلند تھے کہ حالات اور وقت کی نزاکتوں کو سامنے رکھ کر دنیا کے مسائل کو جس طرح حل کیا تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی اور دوسری طرف عمل کے ہر میدان میں وہ پیش پیش دکھائی دیتے ہیں اب بھی بہت کمی کے ساتھ جامعیت کی مثالیں ملتی ہیں لیکن حالات کی ناسازگاری کی بنا پر میدان میں آنے والے ان سے بھی کم ہیں۔ بعض اجتماعیین کا خیال ہے کہ ذہن و ذکاوت فہم و فراست میں انبیاء کرام کا بڑھا ہوا ہونا ضروری نہیں ہے صرف مضبوط عزم کی بنا پر دنیا ان کے قدموں پر گرنے کے لئے مجبور ہوئی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ان لوگوں نے زندگی کے صرف ایک رُخ کا مطالعہ کیا ہے اس میں شک نہیں کہ مضبوط عزم پہاڑ جیسی طاقت کو ہٹا سکتا ہے۔ نمرود و فرعون جیسی سرکش گردن کو موڑ سکتا ہے لیکن کسی انقلاب کو بقاء اور دوام کی سعادت سے بہرہ یاب نہیں کر سکتا ہے اس کے لئے انقلاب کے رگ و ریشہ اور ہر بن و مو

---

[1] روح الاجتماع صفحہ ۱۳۵

میں فہم و فراست کا پایا جانا ضروری ہے آج جوان کے مذہب کو بقاء دوام کی سعادت حاصل ہے اس کی بنیاد فہم و تدبر ہے جو ان کی شخصیتوں پر حاوی تھا جس نے آن کے آن میں جدید دنیا کے بڑے سے بڑے نفسیاتی و اجتماعی مسائل حل کر کے رکھدئے تھے۔ ورنہ نہ معلوم مضبوط عزم کی بنا پر دنیا میں کتنے انقلاب آئے اور ختم ہو کر رہ گئے۔

عملیت کا ثبوت قرآن حکیم میں | عملیت کا ثبوت درج ذیل آیات میں ہے۔

الذین یبلغون رسالات اللہ و یخشونہ ولا یخشون احدا الا اللہ ۳۳/۳۹ — جو لوگ اللہ کے پیغاموں کو پہونچاتے ہیں وہ صرف اللہ سے ڈرتے ہیں اس کے سوا کسی اور سے نہیں ڈرتے

حضرت موسیٰ کو فرعون کے پاس جانے کا حکم ہوا تھا۔

اذھب الی فرعون انہ طغی ۲/۲۰ — فرعون کے پاس جاؤ وہ سرکش ہو گیا ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بے دھڑک پیغام ربانی پہونچانے کا حکم اس آیت میں ہے

یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلغت رسلتہ — اے پیغمبر آپکے رب کے پاس سے جو کچھ آپ پر اُترا ہے اُسکو آپ پہونچا دیجئے اگر آپنے ایسا نہ کیا تو اسکے پیغام پہنچانیکا فرض ادا نہیں کیا

تبلیغ میں جس قدر عملیت کی ضرورت ہوتی ہے وہ انبیاء کرام کی زندگی سے ظاہر ہے زندگی کا کوئی موڑ اور کوئی موقف ایسا نہیں ہے جو ان بزرگوں کو پیش نہ آیا ہو اور کوئی قربانی ایسی نہیں ہے جس کا ان سے مطالبہ نہ ہوا ہو اور کوئی میدان ایسا نہیں ہے جس میں یہ موجود نہ رہے ہوں۔

بدقسمتی سے لوگوں کے پاس ان کی اتباع و پیروی کے نام پر صرف وہی باتیں باقی رہ گئی ہیں جن سے جذبات اور ہوا و ہوس کی تسکین ہوتی ہے اور شیطان نے "زین لھم الشیطن اعمالھم" کے بموجب اس پرستش کا لیبل لگا دیا ہے جس کی بنا پر ان کی زندگیاں ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی ہیں اس کے علاوہ آج زندگی کچھ اس طرح تقسیم ہو کر رہ گئی ہے کہ انسان کسی کے بارے میں سوائے ایک حالت کے اور دوسری حالت کے متعلق سوچ ہی نہیں سکتا ہے اس لئے جب کبھی ان بزرگوں کی زندگیاں

ہمارے سامنے آتی ہیں تو ہماری خود غرضی میں مبتلا نگاہیں ان کو اصلی شکل میں دیکھنے سے قاصر رہتی ہیں۔

(۵) پانچویں اخلاقیت ہے۔ ۵

قائدین میں افکار عالیہ و اخلاق عالیہ کا پایا جانا ضروری ہے

اخلاقیت کا مطلب یہ ہے کہ قائدین ہر لحاظ سے بلند ہوں یعنی ان کے اندر افکارِ عالیہ پرورش پاتے ہوں اور زندگی کے ہر گوشہ میں انہیں افکار کا ثبوت بہم پہنچاتے ہوں، عالی حوصلگی، فراخ دلی، اولو العزمی، بلند ظرفی، مستقل مزاجی وغیرہ جیسی صفتیں ان کی زندگی میں نمایاں ہوں، دیانت داری، امانت شعاری، حق پرستی، حق گوئی، وفا کیشی وغیرہ جیسی صفتیں اُن کی زندگی کا شیوہ بنی ہوئی ہوں۔ سخاوت ہو تو ایسی کہ سب حسب لیاقت مستفیض ہو سکیں، شفقت و رأفت ہو تو ایسی کہ شاہ و گدا امیر و غریب، قریب و بعید کسی کی تخصیص نہ کرے، تواضع ہو تو ایسی کہ ہر ایک کو اپنی گود میں جگہ دینے کے لیے تیار ہو۔ سموائی ہو تو اس قدر کہ ہر مکتب خیال کے لوگوں میں قدر مشترک کو تلاش کر کے اپنا کام کر جائے۔ جذبات پر اتنا قابو ہو کہ اس کی کشش اور اس کا ابھار مغلوب نہ کر سکے۔

غرض قائدین میں ہمہ قسم کے اخلاق کا پایا جانا ضروری ہے (۱) وہ بھی جن کا تعلق ادراک سے ہے (۲) وہ بھی جن کا تعلق جذبات سے ہے اور (۳) وہ بھی جن کا تعلق ارادہ سے ہے۔

اخلاق میں تسخیری صلاحیت ہوتی ہے

انبیاء کرام کی زندگی میں یہ ساری باتیں نہایت بلند پیمانہ پر پائی جاتی تھیں اُن کا اخلاق بذاتِ خود معجزہ اور نبوت کی سب سے بڑی دلیل تھا۔ اخلاق میں تسخیرِ قلوب کی کتنی صلاحیت ہے اس کا صحیح اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھوں نے انبیاء کی زندگی کا مطالعہ کرنے میں حالات کا ٹھیک ٹھیک جائزہ لیا ہے۔

قرآن حکیم کی درج ذیل آیت میں اسی تسخیری صلاحیت کی طرف اشارہ ہے:

فبما رحمۃ من اللہ لنت لھم ولو — اے پیغمبر یہ خدا کی بڑی ہی رحمت ہے کہ آپ لوگوں کے

---

۵ قائدین کے لئے ہر ایک کے مقام اور حیثیت کی تصدیق ضروری ہے۔ انبیاء کا سب سے بڑا وصف یہ رہا ہے کہ انھوں نے ہر نبی کی تصدیق کی اور ابتدا میں قدر مشترک پر جمع ہو جانے کی دعوت دی۔ جیسا کہ "مصدقا لما معکم" اور "یا اھل الکتاب تعالوا الخ" وغیرہ آیتوں سے ظاہر ہے۔

کنت فظاً غلیظ القلب لانفضوا من حولک ۲/۱۵۴ — لئے نرم دل واقع ہوئے اور اگر سخت دل ہوتے تو لوگ آپ کے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے۔

قرآن حکیم میں حضرت یوسف علیہ السلام کی سیرت کا جو مرقع پیش کیا گیا ہے اس میں دراصل سیرت و کردار کی فضیلت اور اس کی اٹل کامرانیاں و فتحمندیاں بتانا مقصود ہے نیز یہ بات کہ انسانی زندگی کی سب سے بڑی قوت اس کی سیرت کی فضیلت ہے اور لوگوں کے قلوب کو مسخر کرنے کی اس میں سب سے زیادہ صلاحیت ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ مکہ والوں نے رسول اللہ اور آپ کے ساتھیوں کو تکلیفیں پہونچانے اور آپ کے مشن کو ناکام بنانے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا لیکن جب آپ مدینہ تشریف لے آئے اور مکہ کے لوگ قحط میں مبتلا ہوئے تو آپ نے حسب ذیل طریقوں پر اُن کی مدد فرمائی

(۱) یمامہ سے جو رسد جاتی تھی آپ نے اس کو حسب سابق جاری کر دیا۔

(۲) غرباء و فقراء کی امداد کے لئے پانچ سو اشرفیاں روانہ کیں۔

(۳) مختلف سامانِ ضرورت کھجور وغیرہ ابوسفیان کو بھیج کر اس کے معاوضہ میں جانوروں کی کھالیں طلب کیں تاکہ درآمد برآمد کا صحیح توازن قائم رہ سکے [۱]

قائدین کو ہر وقت جذبات قابو میں رکھنا چاہیئے

درج ذیل آیت سے یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ کتنے ہی مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹیں اور کیسی ہی مخالفتوں کی آندھیاں چلیں قائدین کو نہ تو مایوس ہونا چاہیئے اور نہ ہی دل میں طلب بھلائی کے سوا کسی اور جذبہ کو جگہ دینا چاہیئے۔

لیس لک من الامر شئ او یتوب علیھم او یعذبھم فانھم ظلمون ۳/۱۲۸ — اے پیغمبر آپ کو دشمنوں کے معاملہ میں کوئی دخل نہیں آپ کا کام راہِ حق کی دعوت دینا ہے اللہ چاہے تو ان سے درگذر کرے اور چاہے تو عذاب دے۔ عذاب اس لئے کہ وہ ظالم ہیں

اس آیت کا اندازِ تخاطب قابلِ غور ہے یہ اس صورتِ حال کی بات ہے کہ دشمنوں نے جنگ اُحد میں رسول اللہ کے دانت توڑ دیئے اور چہرہ اور سر کو زخمی کر دیا تھا اور شہید کر دینے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی

---

[۱] اسلام کا زرعی نظام ص۸۳

اتفاق سے رسول اللہ کی زبان پر یہ الفاظ آ گئے "کیف یفلح قوم خضبوا وجہ نبیھم بالدم"[1]
وہ قوم کیسے فلاح پائے گی جس نے اپنے نبی کے چہرہ کو لہولہان کیا" بات کوئی ایسی قابل اعتراض نہ تھی
بلکہ حقیقتِ حال کا اظہار تھا لیکن یہ اظہار چونکہ ایسے حادثہ کے بعد جو رسول اللہ کی ذات کو پیش آیا تھا
اور ذاتیات کی آمیزش کا شبہ تھا اس بنا پر ایک خاص انداز میں تادیب کر دی گئی اس سے قائدین کی
زندگی کا پتہ چلتا ہے کہ انہیں کس قدر اپنی ذات سے بیگانگی اختیار کرنی پڑتی ہے؟ اور مخلوق کے لئے
وہ کس قدر رؤف ہوتے ہیں؟

حاصل یہ کہ قائدین کی اخلاقی زندگی اتنی منظم اور بلند ہو کہ کسی کو کسی گوشہ میں اس لحاظ سے لب
کشائی کا موقع نہ مل سکے. قرآن حکیم نے خصوصیت سے بعض انبیاء کی زندگی کے اُن پہلوؤں کو اُجاگر کیا ہے
جن کے بارے میں بعض اُن کے مخالفین غلط فہمی میں مبتلا ہو کر مشتبہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے کیونکہ
اگر اخلاقی زندگی ہی غیر واضح اور پردہ اخفا میں رہی تو اور کون سی بنیاد ہوگی جس پر نبوت و قیادت
کی تعمیر ہوگی۔ [2]

(۶) چھٹی قوت استدلال و بیان ہے۔

قوتِ استدلال و بیان یہ ہے کہ قائدین میں ایسی صلاحیت ہو کہ حالات و نفسیات کو سمجھ کر مخاطب کو سمجھا سکیں	قوتِ استدلال و بیان کا مطلب یہ ہے کہ قائدین میں بیان کی ایسی صلاحیت ہو کہ اپنے خیالات کو موثر انداز میں اہل زمانہ کی اصطلاح و زبان میں مخاطب کی طرف منتقل کر سکیں۔

چونکہ ہر زمانہ میں خیالات کی ادائیگی۔ طرز گفتار اسلوب تحریر اور طریقہ
استدلال وغیرہ میں فرق ہوتا ہے اسی طرح سب مخاطب یکساں نہیں ہوتے اس بنا پر قائدین کے لئے زمانہ کی

---

[2] چونکہ لیڈروں کی زندگی ہمارے موضوع بحث سے خارج ہے اس لئے ان کی زندگی پر کسی قسم کا تبصرہ کرنا مناسب
نہیں پھر واقعات و مشاہدات کی بنا پر ہو سکتا ہے کہ تبصرہ اس قدر سخت ہو جائے جو مضمون کی حیثیت کے لحاظ سے
ناقابل برداشت ہو البتہ یہ بات کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس دنیا میں قدرت کا عذاب دو شکلوں میں نمودار ہے
(۱) پارٹی بازی اور (۲) لیڈری" او یلبسکم شیعا و یذیق بعضکم باس بعض ۶/۶۵

[1] جلالین ص۵۸۔

رعایت اور مخاطب کا لحاظ ضروری ہے بسا اوقات ان دونوں باتوں کے نہ پائے جانے کی وجہ سے اس سلسلہ کی ساری جدوجہد اور ساری محنت بیکار جاتی ہے۔

انداز بیان اور طریق فہمائش خود اپنے اندر جادو جیسا اثر رکھتا ہے بشرطیکہ حالات و نفسیات کے مطالعہ کے ساتھ ہو "ان من البیان لسحرا" (بعض بیان جادو جیسی تاثیر رکھتے ہیں)

حالات، موقع اور محل کے لحاظ سے کبھی حاکمانہ انداز اختیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور کبھی حکیمانہ، کبھی تاکید سے کام چل جاتا ہے اور اکثر تکرار کی ضرورت پڑتی ہے[۵] کبھی صرف دعویٰ کافی ہوتا ہے اور کبھی دعویٰ کے ساتھ دلیل لازمی بن جاتی ہے اور کبھی اس بات کی کوشش ہوتی ہے کہ غیر شعوری طور پر ایک اثر دوسرے کی طرف منتقل ہو جائے۔ بہرحال یہ ایک مستقل فن ہے اس میں کامیابی کے لئے نفسیات کے جاننے اور مزاج کے رُخ کو سمجھنے کی بہت ضرورت ہے ان کے علاوہ اس سلسلہ میں دو اور باتیں بڑی جاندار حیثیت رکھتی ہیں۔

(۱) قائدین میں اتنی جاذبیت اور کشش ہو کہ مخالفین مخالفتوں کے باوجود اس کے بارے میں سوچنے کے لئے مجبور ہو جائیں۔

(۲) قائدین قوم وجماعت پر جس بات کا اثر ڈالنا چاہتے ہوں یا جو فعل ان سے کرانا چاہتے ہوں وہ خود اس کا زندہ نمونہ ہوں۔

یہ دونوں باتیں اپنی جگہ بڑی اہم ہیں اور بسا اوقات دعویٰ ودلیل وغیرہ سے کہیں زیادہ کام کرتی ہیں

انبیاء کرام کی زندگی اور قرآن حکیم سے اس کا ثبوت

انبیاء کرام کی زندگی میں مذکورہ تمام باتوں کی مثالیں موجود ہیں تحقیق وتفصیل کے لئے اس نظر سے ان کی زندگی کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

ذیل میں ہم قرآن حکیم کی چند آیتیں اور چند واقعات ذکر کرتے ہیں۔

---

۵ تاکید سے مراد کسی بات کو زور دار طریقے پر تحکم کے ساتھ ادا کرنا اور تکرار سے مراد کسی خیال کا بار بار تکرار کرنا رسول اللہ کے [یہاں] اس کا ثبوت ملتا ہے" اذا تکلم بکلمۃ اعادھا ثلثا" (بخاری ومشکوٰۃ) یہ تاکید وتکرار صرف سمجھانے کے لئے [ہی] ہوتے ہیں بلکہ نفسیاتی لحاظ سے اثر اندازی میں خاص مقام رکھتے ہیں۔

موسیٰ علیہ السّلام نے قوت استدلال وبیان کے لئے اس طرح دعا کی تھی

واحلل عقدۃ من لسانی — اے اللہ میری زبان کی گرہ کھول دے اس طرح کہ

یفقھوا قولی ۲/۲۰ — میری بات لوگوں کے دلوں میں اُتر جائے۔

گرہ کھلنے کی درخواست اور "یفقھوا قولی" کے ذریعہ اس کی شکل کی تعیین اور بیان کی یہ تعبیر کہ لوگ میری بات کو سمجھ لیں نہ کہ "میں انہیں سمجھا سکوں۔ یہ ساری باتیں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ یہاں بیان کی وہی صلاحیت مراد ہے جو قیادت کے فرائض انجام دینے کے لئے درکار ہوتی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے نمرود کو دعوت پہونچانے میں جو طریقہ اختیار کیا اس سے[1] ثابت ہوتا ہے کہ موقع کے لحاظ سے فہمائش کا جو طریقہ مناسب ہو وہ اختیار کیا جائے اور جہاں تک ہوسکے سادگی ملحوظ رکھی جائے۔ نیز یہ بات کہ قائدین کے سامنے مقصد مخاطب کے دل میں مفہوم کا اتار دینا ہے جس طرح بھی ہو مخاطب کو دلیلوں کے الجھاؤ میں پھنسانا یا کسی خاص دلیل پر اڑکر بولتے بولتے اس کا ناطقہ بند کردینا قیادت و دعوت کی راہ کے خلاف ہے۔

فرعون کے دربار میں جب حضرت موسیٰ علیہ السّلام دعوت لیکر پہونچے تو فرعون نے انہیں نہایت نازک مقام پر کھڑا کر دیا اس نے کہا فما بال القرون الاولیٰ ۲/۱۶ جو پچھلے زمانہ میں گذر چکے ان کا کیا حال ہوتا ہے۔

یہ ایسا نازک مقام ہے کہ مذہب کی تاریخ میں فتنہ وفساد اور اختلاف کی بُنیاد ہمیشہ یہی مسئلہ رہا ہے اور شیطان نے ہمیشہ اپنی دسیسہ کاریوں کا جال اسی روپ میں پھیلایا ہے اور اسی کے ذریعہ دین وایمان کی غارتگری کی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر موسیٰ علیہ السّلام اس سوال کے ادھیڑبن میں لگ جاتے تو نہ صرف اس وقت بلکہ ہمیشہ کے لئے اپنی شخصیت ختم کردیتے کیونکہ تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی حق پرستوں نے "قرون الاولیٰ" کی صحیح پوزیشن جواب میں واضح کی ہے وہ عوامی رجحان کے خلاف رہی ہے اور پھر عوام نے ابتدا ہی میں انتہا کی ساری منزلیں طے کرلی ہیں۔

---

[1] ملاحظہ ہو پ۳ رکوع ۳

تزکِ بابری

از

(جناب محمد رحیم صاحب دہلوی)

۱۵

(سلسلہ کے لئے ملاحظہ فرمایئے برہان بابت ماہ جون ۵۶ء)

شیبانی سے آمنا سامنا | شیبانی خاں نے جو خبر سنی تو وہ سورج نکلتے ہی گھبرا کر چل پڑا اور سوڈیڑھ سو آدمیوں کو ساتھ لئے آہنی دروازہ پر نمودار ہوا وہ میرے قابو میں آہی چکا تھا لیکن میرے ساتھ بہت تھوڑے سے آدمی تھے۔ وہ جان گیا کہ کامیابی نہ ہوگی۔ اس لئے وہ دم بھر بھی نہ ٹھیرا اور الٹے پاؤں واپس چلا گیا۔

ہمارا سمرقند | وہاں سے پلٹ کر میں بستان سرائے میں جا اُترا۔ شہر کے معززین اور اکابر اور بڑے بڑے لوگ مجھ سے ملنے آئے۔ اور سب نے مجھے مبارک باد دی۔

سمرقند تقریباً ایک سو چالیس برس تک ہمارے خاندان کا دارالحکومت رہ چکا ہے خدا جانے یہ اجنبی لٹیرا کہاں سے آمرا اور مالک بن بیٹھا۔

اللہ نے چھنا ہوا ملک پھر دے دیا۔ اور ہمارا لٹا کھٹا شہر ہمیں پھر مل گیا۔

انصاف شرط ہے | سلطان حسین مرزا نے بھی ہرات کو اسی طرح چپ چپاتے فتح کیا تھا۔ جس طرح میں نے اب سمرقند جھپٹا ہے۔ لیکن اندازہ شناس اور اہلِ انصاف جانتے ہیں کہ اُس کارنامے میں اور اس معرکے میں بڑا فرق ہے۔ اُسے حاصل کرنا اور تھا۔ اس پر قابو پانا اور ہے۔

پہلی بات تو یہ کہ سلطان حسین مرزا نہایت طاقت ور، بے انتہا تجربے کار اور جہاندیدہ بادشاہ تھا۔

دوسرے یہ کہ اس کا دشمن یادگار مرزا سترہ اٹھارہ برس کا ناتجربے کار لڑکا تھا۔

تیسرے یہ کہ دشمن کے ہاں سے میر علی میرآخور[1] نے جو سارے رازوں سے واقف تھا مرزا کے پاس خبر بھیجی اور چپ چپاتے اس کو بلالیا۔

چوتھے یہ کہ مرزا کا دشمن قلعے میں نہ تھا۔ اس کی بجائے باغ زاغان[2] میں پڑا تھا۔ پھر یہ کہ جس وقت سلطان حسین مرزا نے ہرات لیا ہے اس وقت یادگار مرزا اور اس کے ساتھی شراب کے ایسے دھتی تھے کہ اس رات بھی یادگار مرزا کے دروازے پر جو تین پہرے دار تھے وہ تک مرزا کی طرح نشے میں چور چور تھے۔

پانچویں یہ کہ حملہ آور نے چپ چپاتے جو حملہ کیا اس میں پہلی ہی دفعہ فتح پالی۔

میں نے جب سمرقند لیا ہے اس وقت کل انیس برس کی میری عمر تھی۔ نہ ایسی گھاتوں کو اتنا جانتا تھا اور نہ مجھے تجربہ تھا۔

دوسرے یہ کہ میرا دشمن شیبانی خاں جیسا ترقی یافتہ، تجربے کار اور نہایت عقل مند آدمی تھا۔

تیسرے یہ کہ سمرقند میں سے کسی نے مجھ سے ساز باز نہیں کی گو یہ تسلیم ہے کہ شہر والے دل وجان سے میرے ساتھ تھے۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ شیبانی خاں کا ڈر اتنا غالب تھا کہ کوئی چوں بھی نہ کر سکتا تھا۔

چوتھے یہ کہ میرا دشمن قلعے میں محفوظ تھا۔ میں نے قلعہ بھی چھینا اور دشمن کو بھاگنے پر مجبور بھی کیا۔

پانچویں یہ کہ سمرقند پر پہلی دفعہ جو حملہ کیا تو دشمن چوکنا ہو چکا تھا۔ اس پر بھی اب جو دوسری دفعہ آیا تو خدا کے حکم سے شہر چھین لیا۔

یہ سب کچھ میں نے کسی کو ذلیل وحقیر کرنے کے لئے نہیں کہا۔ بلکہ جو واقعہ تھا وہ بیان کیا ہے اس سے اپنی تعریف بگھارنی مقصود نہیں۔ جو سچ تھا وہ لکھ دیا۔

---

[1] اصطبل کا داروغہ [2] کوؤں کا باغ

شعرا کی مبارکباد | شعرا نے اس فتح کی خوشی میں بہت سی تاریخیں لکھی تھیں ان میں سے یہ ایک بیت یاد رہ گئی ہے ۔

یار گفتہ خرد کہ تاریخش فتح[1] بابر بہادر است بدان

فتح آپ ہی آپ چل کر آئی | سمرقند فتح ہوا تو میرے پاس شادوار اور سغد کے ضلعے اور ان ہی کے ساتھ ساتھ دیگر تحصیلوں کے قلعوں سے لوگوں کے آنے کا تانتا بندھ گیا ۔

بعض قلعوں سے ازبکوں کے آدمی ڈر کے مارے خود بخود نکل بھاگے اور بعض قلعے ایسے تھے جہاں کے لوگوں نے ازبکوں کو مار مار کے نکال دیا ۔ اور ہمارے طرف دار بن گئے ۔ بعض قلعوں میں لوگوں نے اپنے اپنے قلعہ داروں کو قید کر کے قلعوں کو ہمارے لئے محفوظ کر لیا ۔

شیبانی بخارا گیا | اسی زمانے میں شیبانی خاں اور ازبکوں کے بال بچے اور مال و اسباب[2] ترکستان سے آ گئے ۔ شیبانی خاں، خواجہ دیدار اور علی آباد کے آس پاس پڑا تھا ۔ اس نے جو سنا کہ قلعے والوں نے قلعے حوالے کر دئے اور لوگ یوں میری طرف داری کر رہے ہیں تو وہ بخارا چلا گیا ۔

باقی ترخان | خدا کے فضل سے تین چار مہینے میں سغد اور میان کالر[3] کے قلعے میرے قبضے میں آ گئے باقی ترخان کو جو موقع ملا تو وہ قرشی کے قلعے میں آ گیا اور قرشی اور خزار[4] دونوں کے دونوں ازبکوں کے ہاتھ سے نکل گئے ۔

ابو الحسن | ابو الحسن مرزا کی فوج نے مرو سے آ کر قراکول[5] کو دبا لیا ۔ اس وقت خوش نصیبی میرا ساتھ دے رہی تھی ۔ اور میں کامیاب ہو رہا تھا ۔

عزیزوں کو سمرقند بلا لیا | اندجان سے میرے چلے آنے کے بعد میری مائیں[6]، بال بچے مال و اسباب لے کر بڑی دقت اور مصیبت سے اوراتیپہ چلے گئے تھے ۔ میں نے آدمی بھیج کر سب کو سمرقند بلا لیا

---

[1] یہ واقعہ ۹۰۶ھ کے تحت لکھا ہے لیکن اس مادہ سے ۹۰۵ھ نکلتے ہیں۔ [2] نہایت اعلیٰ درجہ کے ساز و سامان کے ساتھ ۔ [3] میاں کار یا میاں کال یہ آبادی دیوسی کے قریب کوہک کے دونوں طرف آباد ہے [4] لیڈن نے خزار لکھا ہے ۔ خزار اور قرشی شہر سبز کے جنوب و مغرب میں ہیں ۔ [5] قراکول بخارا کے جنوب و مغرب میں ہے ۔ [6] سگی اور سوتیلی مائیں ۔

پہلوٹھی کی اولاد | ان ہی دنوں میں سلطان احمد مرزا کی بیٹی عائشہ سلطان بیگم (میری پہلی بیوی) کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی ۔ اس کا نام فخر النسا بیگم رکھا ۔ میری پہلوٹھی کی اولاد وہی تھی ۔ اس وقت میری عمر ۱۹ سال تھی ۔ وہ چلّے کے اندر ہی خدا کو پیاری ہوئی ۔

کمک کی ضرورت | سمرقند فتح ہونے کے بعد بادشاہوں، سرداروں اور امیروں سے مدد مانگنے کے لئے میرے ایلچی اور ہرکارے متواتر آئے گئے ۔ بعض نے تجربے کار ہونے کے باوجود آنکھیں چرالیں اور بعض نے اس ڈر کے مارے جان کر آنا کانی کی کہ انھوں نے ہمارے خاندان سے بے ادبیاں کیں تھیں اور آپس کے تعلقات خراب کرلئے تھے ۔ بعض نے کمک بھیجی بھی تو وہ کچھ ایسی زیادہ نہ تھی ۔ ان میں سے ہر ایک کا حال بعد میں آئے گا ۔

علی شیر بیگ کا خط | سمرقند جو دوبارہ ہاتھ آیا ۔ اس وقت علی شیر بیگ زندہ تھا ۔ ایک دفعہ اس کا خط بھی آیا اس کے جواب میں میں نے بھی خط بھیجا اور اس کی پشت پر ترکی کا ایک شعر لکھ بھیجا ۔ جب تک اس کا جواب آئے یہاں معاملہ درہم برہم ہو چکا تھا ۔

ملا بنائی کے قصیدے | شیبانی خاں نے سمرقند فتح کرنے کے بعد ملا بنائی کو نوکر رکھ لیا تھا ۔ اس وقت سے وہ شیبانی خاں کے ساتھ ہی رہتا تھا مگر جب میں نے سمرقند فتح کیا تو چند روز بعد ملا سمرقند آگیا ۔

قاسم بیگ کو اس سے بدگمانی ہوئی ۔ اور اس نے اس کو شہر سبز بھیج دیا ۔ وہ قابل آدمی تھا اور بے خطا تھا اس لئے میں نے چند روز بعد اُسے پھر سمرقند بلا لیا ۔ وہ ہمیشہ غزلیں اور قصیدے لکھتا تھا ۔ اس نے نوائیں[1] ایک غزل مجھ سے منسوب کر کے پیش کی اور اسی زمانے میں یہ رباعی بھی نذر کی ۔

نہ غلہ مرا کز و توانم نوشید | نہ ہمل نمد تا توانم پوشید
آنرا کہ نہ خوردن است نے پوشیدن | در علم و ہنر کجا تواند کوشید

---

[1] نوا علم موسیقی کے مقامات میں سے ایک مقام ہے جو وہاں مستعمل ہے ۔

میں ان دنوں ایک آدھ بیت کہہ لیتا تھا۔ پوری غزل نہ ہوتی تھی۔ میں نے ترکی میں ایک رباعی لکھ کر اس کو بھیجی۔

ملا نے رباعی کے پہلے مصرعے کے قافیہ کو ردیف کر دیا اور دوسرے قافیہ میں ایک رباعی لکھ کر پیش کی۔

خواجہ ابوالبرکہ | اسی زمانے میں خواجہ ابوالبرکہ فراقی شہر سبز سے آیا۔ اور اس نے کہا کہ تم کو اسی قافیہ میں رباعی کہنی چاہیے تھی۔ پھر وہ رباعی خواجہ ابوالبرکہ نے لکھی۔

تقدیر بن کر بگڑ گئی | جاڑے میں مرے حالات سنورتے جا رہے تھے اور شیبانی خاں کے حالات بگڑ رہے تھے۔ لیکن اسی دوران میں دو ایک واقعات بہت بُرے گذرے۔

قراکول پر شیبانی کا قبضہ | جن لوگوں نے مرو سے آکر قراکول پر قبضہ کیا تھا۔ وہ اس کو نہ تھام سکے۔ قراکول پھر ازبکوں کے قبضے میں چلا گیا۔

شیبانی نے قتل عام کیا | دبوسی کے قلعے میں ابراہیم ترخان کا چھوٹا بھائی احمد ترخان تھا۔ شیبانی خاں نے دبوسی کو جا گھیرا۔ جب تک ہم لشکر جمع کر کے مقابلے کے قابل ہوئے شیبانی خاں نے حملہ کر کے قلعہ چھین لیا۔ اور خوب قتل عام کیا۔

آئندہ معرکہ | جب میں نے سمرقند فتح کیا اس وقت میرے ساتھ کل دو سو چالیس آدمی تھے۔ پانچ چھ مہینے میں خدا کے فضل سے اتنی فوج جمع ہو گئی کہ شیبانی خاں جیسے آدمی سے سرپل پر زبردست معرکہ ہوا۔ اس کی تفصیل آگے بیان کی جائے گی۔

ماموں اور بھائی نے مدد دی | آس پاس جو لوگ تھے۔ ان میں سے خان کے ہاں سے ایوب بیگ چیک اور قشقہ محمود بیگ چار پانچ سو آدمیوں کے ساتھ مدد کے لئے آیا اور جہانگیر مرزا کی طرف سے تنبل کا بھائی دو سو آدمی لے کر آیا۔

حسین اور بدیع نے آنکھیں پھیر لیں | سلطان حسین مرزا سے زیادہ شیبانی خاں کے کرتوت کوئی نہ جانتا تھا لیکن افسوس ہے کہ اس جیسے تجربے کار بادشاہ نے ایک آدمی بھی نہ بھیجا۔

بدیع الزماں مرزا نے بھی خبر نہ لی۔

خسرو کا ڈر | خسرو شاہ نے اس ڈر سے کسی کو نہ بھیجا کہ اس نے جیسا کہ بیان ہو چکا ہے ہمارے خاندان کے ساتھ بہت سی برائیاں کیں تھیں اور مجھ سے اس کا دم نکلتا تھا۔

شیبانی سے مقابلے کی تیاریاں | میں شوال[1] میں شیبانی خاں سے مقابلے کے لئے باغ نو گیا۔ پانچ چھ روز وہاں ٹھیرا۔ تاکہ لشکر جمع ہو جائے اور سامانِ جنگ تیار کر لیا جائے۔ پھر وہاں سے کوچ در کوچ چلا اور رَبِل کے مقام سے گذر کر ڈیرے ڈال دئے اور لشکر کے چاروں طرف خندق کھدوائی اور کٹھرے لگا کر حفاظت کا پورا انتظام کر لیا۔

شیبانی خاں بھی مقابلے کے لئے آ پہنچا اور خواجہ کاردُزون کے قریب پڑاؤ ڈالا دونوں لشکروں کے بیچ میں اندازاً تین میل کا فاصلہ تھا۔

مجھ بھیڑ | چار پانچ روز تک لشکر اپنی اپنی جگہ پڑے رہے۔ لیکن دونوں لشکروں کے آدمی اپنے اپنے ہاں سے نکل کر تھوڑا بہت الجھتے بھی رہے۔ ایک دن دشمن کا لشکر بڑھ کر بہت آگے آگیا۔ اس دن لڑائی بھی خوب ہوئی۔ لیکن کوئی کسی پر غالب نہ آیا۔

قرابیگ کی بزدلی | ہمارے لشکر میں سے ایک علمبردار نے یہ بزدلی کی کہ بھاگ کر خندق میں آ چھپا سنا ہے کہ وہ جھنڈا سیدی قرابیگ[2] کا تھا وہ اپنی ہوا تو بہت باندھتا تھا لیکن اصل میں تلوار کا ہیٹا تھا۔

شیبانی نے شبخون مارا | اسی عرصہ میں شیبانی خاں نے ایک رات شب خون مارنے کی کوشش کی ہمارے لشکر کے چاروں طرف خندق اور کٹھروں کا مضبوط انتظام تھا دشمن کا حملہ بیکار گیا۔ خندق کے کنارے سواروں نے خوب شور و غل مچایا اور تھوڑے سے تیر بھی مارے لیکن ناکام لوٹنا پڑا۔

کمک پر کمک آئی | اب میں نے جنگی امور میں دلچسپی لی۔ اور بڑی کوشش سے کام لیا۔

---

[1] مطابق ۲۰ اپریل ۱۵۰۱ء [2] قرابیگ۔

قنبر علی میرا مددگار تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ باقی ترخان ہزار دو ہزار آدمیوں کے ساتھ کیش پہنچا۔ پھر دو روز بعد ہم سے آملا۔ سید محمد دغلت مرزا[1] پہلے ہی ہزار یا پانچ سو آدمیوں کے ساتھ میرے ماموں کی طرف سے میری مدد کے لئے دیول آگیا تھا جو وہاں سے سولہ کوس ہے۔ دوسرے دن وہ بھی ہم سے آملا۔

وہ بڑا اچھا موقع ملا۔ لیکن میں نے لڑائی چھیڑنے میں ذرا جلدی کی۔

ستاروں کی چال بازی اور جلدی یوں کی کہ دونوں لشکروں کے بیچ میں آٹھ ستارے تھے۔ وہ دن گذر جاتا۔ تو پھر تیرہ چودہ دن تک وہ دشمن کے لئے مبارک ثابت ہوتے۔

یہ خیال بے حد لغو تھا۔ حقیقت میں بے موقع جلدی کی۔ صبح ہی صبح مقابلے کے لئے جنگی لباس پہنا۔ گھوڑوں پر ساز ڈالے گئے۔ دائیں بائیں۔ آگے اور درمیان میں لشکر کو مرتب کیا اور میدان کی طرف چل پڑا۔

لشکر کی ترتیب دائیں طرف ابراہیم سارو۔ ابراہیم جانی۔ ابوالقاسم کوہ بر اور بعض دیگر امراء تھے بائیں جانب محمد مزید ترخان۔ ابراہیم ترخان اور سمرقند کے امراء میں سے سلطان حسین ارغون۔ قرابرلاس۔ پیر احمد اور خواجہ حسین تھے۔

لشکر کے درمیان میں قاسم بیگ اور بعض خاص ملازمین تھے۔

لشکر کے آگے آگے قنبر علی سلاخ۔ بندہ علی۔ خواجہ علی۔ میر شاہ توچین۔ سید قاسم ایشک آغا۔ خال دار (بندے علی کا چھوٹا بھائی) توچ بیگ اور حیدر قاسم بیگ[2] (قاسم بیگ کا بیٹا) تھے اور جتنے جاں باز سپاہی اور مصاحب تھے وہ بھی ان کے ساتھ تھے۔

ادھر سے ہم تیار ہو کر چلے۔ ادھر سے دشمن کی صفیں بھی سامنے آگئیں

شیبانی کے لشکر کی ترتیب دشمن کے لشکر میں دائیں ہاتھ کو محمود سلطان۔ جانی بیگ سلطان اور تیمور سلطان تھے۔ اور بائیں طرف حمزہ سلطان مہدی سلطان اور بعض اور سلاطین تھے

---

[1] لیڈن نے اصلی عبارت میں سید محمد دغلت میر کا بیٹا اور نوٹ میں میرزاد لکھا ہے۔ [2] حیدر قاسم

دشمن کی چال | دونوں لشکروں کی مٹ بھیڑ ہوتے ہی دشمن کے دائیں ہاتھ کی صفیں ہمارے بائیں طرف سے چکر کھا کر ہماری پیٹھ کے پیچھے جانے لگیں۔ میں نے بھی اپنا منہ اسی طرف پھیر لیا۔ ہماری اگلی صفیں جن میں تمام ہوشیار تجربے کار۔ شمشیر زن اور چیندہ جوان اور سردار رکھے گئے تھے۔ سیدھے ہاتھ پر رہ گئیں۔ ہماری اگلی صفوں میں کوئی نہ رہا۔[1]

شیبانی کا استقلال | پھر بھی ہم نے ان لوگوں کو جو آگے بڑھ آئے تھے مارتے مارتے اور بھگاتے بھگاتے ان کی فوج کے بیچوں بیچ پہنچا دیا۔ اور حالت یہ ہو گئی کہ شیبانی خاں سے بعض بوڑھے بوڑھے سردار چلا۔ چلا کر کہنے لگے کہ شیبانی بھاگنا چاہیئے۔ اب ٹھیرنے کا موقع نہیں ہے۔ مگر وہ استقلال کے ساتھ جما رہا۔

دشمن کے دائیں پہلو نے ہماری دائیں صفوں کو شکست دے کر ہم پر پیچھے سے حملہ کیا۔ چوں کہ ہماری اگلی صفیں دائیں طرف رہ گئیں تھیں اس لئے ہمارا آگا کھل گیا۔ اس لئے دشمن کی فوج نے ہمارے آگے اور پیچھے حملے کئے اور تیر مارنے شروع کر دئے۔

مغلوں کی لوٹ مار | مغلوں کا جو لشکر ہماری مدد کے لئے آیا تھا۔ اس نے دشمن سے لڑنے کی بجائے ہماری فوج کو لوٹنا شروع کر دیا اور سواروں کو گھوڑوں سے گرانے لگے۔

ان کمبخت مغلوں کی عادت ہمیشہ سے یہی ہے کہ فتح پائیں تو جھٹ دشمنوں کو لوٹنے لگیں اور ہار جائیں تو اپنے ہی لشکر پر ہاتھ صاف کریں۔

زبردست شکست | دشمنوں کی اگلی صفوں کو جنہوں نے کئی دفعہ سخت حملے کئے تھے۔ مار کر بھگا دیا تھا۔ لیکن وہ سب پھر اکٹھے ہو کر آگئے۔ اس طرح آگے سے بھی حملہ ہوا اور دشمن کی فوج جو ہمارے لشکر کے پیچھے پہنچ گئی تھی اس نے پیچھے سے بھی حملہ کر کے جھنڈے پر تیر برسانے شروع کر دئے۔ اور اگلی پچھلی طرف سے حملے کر کے ہماری فوج کے پاؤں اکھیڑ دئے۔

ازبکوں کا طریقۂ جنگ | ازبکوں کا طریقہ جنگ یہ ہے کہ وہ لڑائی میں دشمن کے بازو کی طرف مڑ کر

---

[1] ان میں سے چند بڑی مشکل سے میرے ساتھ رہے۔

وار کرتے ہیں اور یہ بہت کارگر حربہ ہے[1]۔ ان کی کوئی لڑائی ایسی نہیں ہوتی۔ جس میں وہ اس طریقہ پر عمل نہ کرتے ہوں۔ اسی کے ساتھ ساتھ سب سردار اور سپاہی آگے پیچھے باگیں ڈھیلی کئے ہوئے گھوڑوں کو بہت تیز دوڑاتے ہوئے دھاوا کرتے ہیں۔ اور جب شکست ہوتی ہے تو اسی طرح واپس جاتے ہیں۔

جان بچا کر بھاگے میرے ساتھ دس پندرہ آدمی رہ گئے تھے۔ دریائے کوہک قریب تھا میری فوج کا دایاں بازو دریا کے پاس پہنچ گیا تھا۔ ہم سب بھی دریا کی طرف دوڑے اور آدمی اور گھوڑے بمعہ ساز و سامان کے دریا میں کود پڑے آدھے سے زیادہ دریا ایسا تھا جہاں پانی کم تھا لیکن اس کے بعد گہرا پانی ملا۔ ایک گز تک گھوڑوں اور ساز و سامان سمیت تیر کر پار ہوئے۔ دریا سے نکلے تو گھوڑوں کے جنگی ساز کاٹ ڈالے اور انھیں تیز دوڑایا جب دریا سے شمال کی جانب نکل گئے تو دشمن پیچھے رہ گیا۔

ابراہیم ترخان کا قتل مغل کم بختوں نے اکیلے دوکیلوں کو لوٹ لیا۔ ابراہیم ترخان اور بہت سے اچھے سپاہیوں کو مغلوں ہی نے لوٹ لیا۔ گھوڑوں سے گرایا اور مار ڈالا۔

بچا کچھا قافلہ سمرقند میں میں دریائے کوہک کے شمال کی طرف آگے بڑھا اور قلبہ کے پاس دریا پار کیا اور دو غاروں کے بیچ میں شیخ زادے دروازے میں سے ارک پہنچا۔

ابراہیم نام کے تینوں سردار مارے گئے اس لڑائی میں ہمارے نامور سردار چُنندہ جوان اور بہت سے آدمی مارے گئے۔ ابراہیم ترخان۔ ابراہیم سارو اور ابراہیم جانی بھی ان ہی میں تھے۔ بہت عجیب بات ہے کہ ابراہیم نام کے تینوں سردار ایک ہی لڑائی میں مارے گئے۔

مقتول سرداروں کی فہرست ابوالقاسم کوہ بر (حیدر قاسم بیگ کا بڑا بیٹا) خدا بیردی علم بردار خلیل (سلطان احمد تنبل کا چھوٹا بھائی جس کا ذکر کئی دفعہ آچکا ہے) اس لڑائی میں مارے گئے ان کے علاوہ بہت سے لوگ ادھر ادھر بھاگ گئے۔

---

[1] اس کو تولغہ کہتے ہیں

بھگوڑوں کی فہرست | بھگوڑوں میں سے محمد مزید ترخان[1] تو خسرو شاہ کے پاس حصار اور قندز چلا گیا۔ اور قنبر علی سلاخ مغل نے بھی جس کو میں نے اپنی مہربانی اور لطف و کرم سے بڑا سردار بنا دیا تھا۔ ان مہربانیوں کے باوجود ایسے نازک موقعہ پر میرا ساتھ نہ دیا۔ اور سمرقند پہنچتے ہی اپنے بال بچوں کو لے کر خسرو شاہ کے پاس چلا گیا۔

بعض اور سردار اور سپاہی جیسے کریم داد۔ خداداد ترکمان۔ جانکہ[2] کوکلتاش اور ملا بابا ساغرچی[3] اور اندیجان چلے گئے۔ ملا بابا اس زمانے میں مرا ملازم نہ تھا۔ بطور مہمان تھا۔

شیرم طغائی نے ساتھ دیا | البتہ شیرم طغائی وغیرہ۔ اپنے ساتھیوں سمیت مرے ساتھ سمرقند گئے اور ہم سب نے صلاح مشورے کے بعد یہ طے کر لیا کہ چاہے مریں یا جیئیں لیکن رہیں گے سمرقند کے قلعے ہی میں۔ چنانچہ ہم قلعے کو مضبوط بنانے میں مصروف ہو گئے۔

ماؤں اور بہنوں کی غیرت | ان لوگوں نے تو ساتھ دیا لیکن میری ماؤں اور بہنوں نے یہ کیا کہ قلعے میں پہنچتے ہی اپنے مال و اسباب اور نوکروں چاکروں کو اور اندیجان بھیج دیا۔ اور آپ تھوڑے سے آدمیوں کے ساتھ قلعے میں رہ گئیں۔

انھوں نے کچھ اس دفعہ ہی ایسا نہیں کیا بلکہ ہر مصیبت اور تکلیف کے وقت انھوں نے ایسا ہی ہلکا پن اور غیرت ہوتی ہے۔

بچاؤ کی تدبیریں | دوسرے روز خواجہ ابوالمکارم۔ قاسم بیگ اور دوسرے تمام صائب الرائے اور خاص الخاص سرداروں کی نشست میں صلاح و مشورے کے بعد طے پایا کہ مریں یا جیئیں قلعے ہی میں رہیں گے اور میں اور قاسم بیگ مخصوص فوج کے ساتھ کمک کے لئے مقرر کئے گئے۔ چنانچہ اس فیصلے کے پیش نظر ہم نے اپنا سفید خیمہ شہر کے بیچ میں الغ بیگ مرزا کے مدرسے کے دروازے کی بڑی محراب میں لگایا۔

اور دوسرے سرداروں اور سپاہیوں کو شہر کے دروازوں اور شہر کی فصیل پر مورچے تقسیم کئے گئے۔

---

[1] ایک نسخہ میں محمد درویش خاں لکھا [2] جانکہ کوکلتاش [3] بشاغری

ادبیات

"اخلاقِ رسالت"

از

(جناب بسمل سعیدی ٹونکی)

غزوۂ بدر، وہ اسلام کی اک فتحِ مُبیں — جس میں امداد کو افلاک سے فوجیں اُتریں

درحقیقت تھی یہی جنگ بنائے اسلام — تھی اسی جنگ، پہ موقوف بقائے اسلام

اک طرف آئے تھے مکّے سے ہزار آہن پوش — اک طرف تین سو تیرہ مدنی خانہ بدوش

دیکھ کر افسرِ اسلام نے میدان کا رنگ — اک نئے طور سے تیار کیا نقشۂ جنگ

ترکشِ دل سے دعاؤں کے نکالے کچھ تیر — جن کی پرواز کے آگے پرِ جبریل حقیر

پھر کماندارِ رسالت نے چڑھا کر چلّہ — تیر ایک ایک سوئے بابِ اجابت پھینکا

اشک آنکھوں میں، محمدؐ کی جبیں سجدے میں

تھے دو عالم زِ فلک تا بہ زمیں سجدے میں

آج مسجودِ ملائک کا ہے انداز نیا — آج اللہ کے محبوبؐ کا ہے ناز نیا

پھر خدا جانے کہا کیا نگہِ برہم سے — صرف اتنا ہی سُنا بادشہِ عالم سے

فتحیاب آج یہ لشکر جو نہ ہوگا میرا — کل کوئی پُوجنے والا نہ رہے گا تیرا

جب اُٹھا سجدہ گہِ ناز سے فرقِ اطہر — "لم تروھا" کا فلک سے اُتر آیا لشکر

دونوں جانب سے بہ صد جوش صفیں ٹوٹ پڑیں — حمزہ و حیدرِ کرار کی تیغیں چمکیں

عُتبہ و شیبہ، ولید اور ابوجہل، تمام — لشکرِ کُفر کے سرداروں کا تھا قتلِ عام

زیرِ شمشیرِ علیؓ سیکڑوں کُفّار آئے
بھاگنے سے جو بچے تھے وہ گرفتار آئے

قیدیوں میں تھے ابوالعاص بھی دامادِ حضورؐ
شمعِ اسلام سے ظُلمتکدۂ دل بے نُور

اِن اسیروں کی رہائی کے لئے تھا یہ قرار
درہم اِن میں سے ہر اک، فدیہ میں دے چار ہزار

ہوئی مکّے میں جو فدیہ پہ رہائی کی خبر
اپنے شوہر کے لئے ہو گئیں زینب مضطر

زوج کے فدیہ میں ہار اپنے گلے کا بھیجا
فاتحِ بدر نے اِس ہار کو پہچان لیا

تھا یہ وہ ہار جو بیٹی کو دیا تھا ماں نے
جان سے اپنی زیادہ وہ سمجھتی تھیں جسے

آپؐ نے جب یہ محبت کی نشانی دیکھی
دل پہ لکھّی ہوئی اک غم کی کہانی دیکھی

اشکِ غم ایسے بھر آئے تھے بہ چشمِ مخمور
مَے دیرینہ سے دو جام ہوں جیسے معمور

آگئیں یاد وہ شعبِ ابوطالب کی رفیق
آہ وہ قبلِ نبوّت سے مصائب کی رفیق

آپ وابستۂ محبوبِ خدا ہو جانا
جان سے مال سے قربانِ وفا ہو جانا

نرغۂ کفر میں وہ سابق الایماں ہونا
اک پریشاں کے لئے خود بھی پریشاں ہونا

یاد جس وقت یہ گزرے ہوئے حالات آئے
دیر تک اُن کی محبت کے خیالات آئے

پھر یہ ارشاد ہوا سب سے مُخاطب ہو کر
مصلحت بیں تھی ہر اک امر میں حضرتؐ کی نظر

ہار فدیہ میں جو زینب نے دیا شوہر کے
اُس نے رکھا تھا اُسے ماں کی نشانی کر کے

گر مناسب ہو تو اس ہار کو واپس کر دو
دامنِ دُخترِ مہجور کرم سے بھر دو

جب صحابہ نے یہ حضرتؐ کا اشارہ دیکھا
اوج پر بختِ ابوالعاص کا تارہ دیکھا

دی گئی قید سے بے فدیہ رہائی اُن کو
شانِ اخلاقِ رسالت نظر آئی اُن کو

کر دیا آپؐ نے واپس جب اس اکرام سے ہار
مان لی کُفرِ ابوالعاص نے اسلام سے ہار

تبصرے

اسوۂ حسنہ از جناب صفوۃ الرحمٰن صاحب صابر تقطیع کلاں ضخامت ۲۶۴ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت عہ دو روپیہ چار آنہ پتہ :۔ ادارۂ اہلِ سنت وجماعت کمان سلطان شاہی حیدر آباد دکن ۲

یہ کتاب سیرت میں ہے جس میں ولادت باسعادت سے لے کر وفات تک کے تمام اہم واقعات سنہ وار بیان کرنے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ملکی نظم ونسق اور فصلِ مقدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پھر آپ کے عادات وخصائل۔ معمولات ومعاملات، اخلاق ومکارم پر الگ الگ عنوان کے ماتحت گفتگو کی گئی ہے۔ شروع میں ضرورت انبیاء۔ بعثت کا مقصد۔ ایمان بالرسالت کی حقیقت اور حدیث کی حجیت پر بھی کلام لائق مصنف کا مقصد صرف تاریخی طور پر واقعات کا بیان کر دینا نہیں بلکہ اسوۂ حسنہ کو پیش کر کے مسلمانوں کو دعوتِ عمل بھی دینا ہے اس لئے جا بجا واقعات نقل کرنے کے بعد ان سے جو نتائج اخذ ہوتے ہیں ان کو بھی بیان کرتے چلے گئے ہیں۔ حوالہ اگرچہ کہیں نہیں ہے لیکن واقعات عموماً مستند اور صحیح ہیں۔ زبان صاف، شگفتہ اور موثر ہے ص ۱۵ پر حیات النبی اور ص ۵۰ پر اعمال واوراد اور معمولاتِ صوفیاء کی بحث اٹھا کر مصنف نے خواہ مخواہ ایک ایسے مسئلہ کو موضوع گفتگو بنایا ہے جس پر ہزاروں اوراق لکھے جا چکے ہیں محض دو ایک آیاتِ قرآنی یا حدیث لکھ دینے سے اس کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ پھر ص ۱۵ پر حضرت عبد اللہ بن مسعود کی جو روایت نقل کی ہے اُس کے آخری الفاظ "یبلغون عن امتی السلام" سے تو خود حیات النبی کا ثبوت ملتا ہے ص ۷۱ پر بیعت عقبہ ثانیہ کے ذکر کے سلسلہ میں عباس بن عبادہ نام غلط ہے۔ یہ تقریر حضرت سعد بن زرارہ نے کی تھی۔ اس

موقع پر حضرت عباس موجود ضرور تھے لیکن وہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے اور انھوں نے مدینہ کے لوگوں کو خطاب کر کے ایک دوسری تقریر کی تھی۔ اس کا مطالعہ نورِ ایمان میں اضافہ کا باعث ہوگا۔

اسلامی کتب خانوں کی سیر از جناب حاجی محمد زبیر صاحب تقطیع خورد ضخامت ۸۰ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت عہ رپتہ برائے ہند محمد عزیز صاحب فرحت منزل بدر باغ علی گڈھ اور پاکستان میں محمد حسین صاحب زبیری نشیمن ۱/C ۔ ۲/۵/ ناظم آباد کراچی نمبر ۱۸

اسلام نے مسلمانوں میں جو علمی ذوق اور تحقیق واکتشاف کا شوق پیدا کیا تھا اس کا اثر یہ تھا کہ قرونِ وسطیٰ میں جب کہ یورپ جہالت ونادانی کا صیدِ زبوں تھا اسلامی مملکت میں شہر بشہر لائبریریاں قائم تھیں اور تشنگانِ علم وفن اُن سے اپنی پیاس بجھاتے تھے لائق مؤلف نے جو مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں ایک عرصہ سے اسسٹنٹ لائبریرین کے عہدہ پر کام کر رہے ہیں اس کتاب میں انھیں لائبریریوں کی داستان سنائی ہے جو زبان کی شیرینی اور لطافت کی وجہ سے خواب آور بھی ہے اور معلومات کی افراط وتنوع کے باعث سبق آموز وعبرت انگیز بھی۔ شروع میں کتابوں کی گراں قیمتی۔ مختلف کتب خانوں میں کتابوں کی تعداد کا اجمالی بیان اُن کے نظم ونسق وغیرہ پر گفتگو کرنے کے بعد بغداد۔ قاہرہ۔ شیراز۔ طرابلس۔ بخارا۔ حلب مراغہ اور اندلس جو اسلامی تہذیب وتمدن کے خاص مراکز تھے اُن کے کتب خانوں کا تذکرہ مستند حوالوں کے ساتھ کیا گیا ہے۔ امید ہے کہ اہلِ ذوق اس کی قدر کر کے لائق مصنف کی محنت کی داد دیں گے۔

اسلامی عبادات اور اخلاقی تعلیمات از سعید احمد اکبرآبادی تقطیع خورد ضخامت ۶۰ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت عہ، پتہ:۔ دفتر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڈھ۔

یہ کتاب آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڈھ کی فرمائش پر مسلم یونیورسٹی کے

امتحان میٹریکولیشن کے نصاب دینیات کے لئے لکھی گئی تھی چنانچہ اُس کے نصاب میں شامل بھی ہے۔ اس میں عبادت کے مفہوم اور فقہ کی اصطلاح میں احکام کی تقسیم پر گفتگو کرنے کے بعد پہلے عبادات یعنی نماز۔ روزہ اور زکوٰۃ کے احکام و مسائل کا اور اُس کے بعد اسلامی اخلاق کا بیان ہے زبان اور انداز بیان ہائی سکول کے طلبار اور طالبات کی استعداد کے مطابق ہے۔ اگرچہ یہ نصاب کی کتاب ہے مگر عام مسلمان بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

(۱) ہماری دنیا حصہ اول ضخامت ۹۶ صفحات قیمت ۹ر } مرتبہ جناب افضل حسین صاحب
(۲) ہماری دنیا حصہ دوم ضخامت ۱۲۸ صفحات قیمت ۱۲ر } ایم۔ اے۔ ایل۔ ٹی تقطیع خورد

کتابت وطباعت بہتر ٹائیٹل پیج خوبصورت اور دیدہ زیب۔ پتہ:۔ مکتبۂ جماعت اسلامی (ہند) رام پور (یوپی) اسلامی جماعت (ہند) رام پور نے اسکول کے مضامین پر درسی کتابوں کا جو مفید سلسلہ شروع کر رکھا ہے یہ دونوں کتابیں اسی کی ایک کڑی ہیں ان کتابوں میں بچوں اور بچیوں کو چوتھے اور پانچویں درجہ کے نصاب کے مطابق نہایت سہل وآسان اور دلنشین زبان میں جغرافیہ کے مبادیات کی تعلیم اس طرح دی گئی ہے کہ اُس سے خاص موضوع کے علاوہ بچوں کے دلوں میں خالق کائنات کی عظمت۔ انسانیت کی محبت اور وطن کی قدر بھی پیدا ہو جاتی ہے شروع میں جغرافیہ کی تعلیم سے متعلق اساتذہ کو ہدایات بھی دی گئی ہیں۔ کم از کم اسلامی مدارس اور اسکولوں کو ان کتابوں سے فائدہ اُٹھانا چاہیئے۔

آسان ریاضی حصہ پنجم | از جناب شوکت علی صاحب بی۔ اے۔ ایل۔ ٹی تقطیع خورد ضخامت ۱۹۲ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت عمر پتہ:۔ مکتبۂ جماعت اسلامی (ہند) رام پور، یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے اس میں اسکولوں کی پانچویں جماعت کے لئے حساب اور علم ہندسہ کے اسباق نہایت سلیس اور آسان زبان میں جدید طریقۂ تعلیم کے مطابق دیئے گئے ہیں یہ واقعہ ہے کہ اگر کوئی ڈھنگ کا معلم لایق مولف کی ہدایات کی روشنی میں اس کتاب کو پڑھائے تو ریاضی جیسے خشک مضمون سے بھی بچہ کو مناسبت اور دلچسپی پیدا

ہو سکتی ہے۔ یہ کتاب بھی اس لائق ہے کہ اسلامی سکول اور مدارس اس سے فائدہ اٹھائیں۔

بوئے گل از جناب اکمل جالندھری تقطیع خورد ضخامت ۱۹۲ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد عہ پتہ:۔ قصر اردو اردو بازار دہلی۔ یہ کتاب اکمل صاحب کی غزلوں نظموں رباعیات اور قطعات کا مجموعہ ہے۔ اگرچہ اکمل صاحب کے نام اور ان کے کلام سے ہمارا تعارف پہلی مرتبہ اسی کتاب کے ذریعہ ہوا ہے لیکن اس مجموعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ غزل اور نظم دونوں کے کامیاب اور بلند پایہ شاعر ہیں ان کے کلام میں بڑی پختگی اور کامل درجہ کی فنکاری پائی جاتی ہے حسن و عشق کے واردات بڑے رکھ رکھاؤ سے بیان کئے ہیں خیالات صاف ستھرے اور بلند ہیں۔ زبان شگفتہ اور رواں ہے ترکیبوں میں اینچ پینچ نہیں۔ الفاظ کیا ہیں؟ کسی کی انگشت حنائی میں ہیرے کی انگوٹھی ہیں۔ شاعر کے اخلاقی کردار کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ہندو اوتاروں اور پیشواؤں کے ساتھ شاعر نے مستقل نظموں کے ذریعہ خراج عقیدت و محبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم۔ امام حسین۔ اور ڈاکٹر اقبال کی خدمت میں بھی پیش کیا ہے ارباب ذوق کو اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے

دین اور ادب از مولانا فضل الرحمٰن صدیقی حسن پوری تقطیع خورد ضخامت ۱۲۷ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ پتہ:۔ کتب خانہ سراج العلوم مولوی گنج دھولیہ (مغربی خاندیش)

یہ کتاب چند متفرق علمی مذہبی اور ادبی مضامین کا مجموعہ ہے جو مؤلف نے مختلف عنوانات پر لکھے ہیں ان میں سے ہر عنوان ایک مستقل کتاب کا موضوع بن سکتا ہے اور بعض پر تو بالفعل مستقل کتابیں موجود بھی ہیں مثلاً "فتنۂ انکار حدیث" "اسلامی عہد کی علمی خدمات" "فلسفۂ شہادت" "اردو ادب اور اہل مغرب" "اکبر اور اقبال ظرافت کے میدان میں" اس بنا پر اس مجموعہ کی حیثیت ان نوٹوں کی ہے جو استاد کسی موضوع پر لکچر دیتے وقت شاگردوں کو لکھوا دیتا ہے اور اس حیثیت سے جناب مؤلف کی یہ کوشش لائق قدر ہے۔

بُرہان

جلد ۳۹ شمارہ ۵

نومبر ۱۹۵۷ء مطابق ربیع الثانی ۱۳۷۷ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

گذشتہ ماہ کے نظرات میں اُردو کو علاقائی زبان بنانے کی تحریک سے متعلق جو اظہارِ خیال کیا گیا تھا اس پر اُردو کے متعدد وقیع اخبارات نے مقالات لکھے ہیں اور اس پر تبصرہ کیا ہے۔ مدینہ بجنور کی تحریر سے معلوم ہوا کہ مرکزی انجمن ترقی اُردو کے جنرل سکریٹری پروفیسر آل احمد سرورؔ نے بھی اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ لیکن خود ہماری نظر سے موصوف کی تحریر نہیں گذری۔ مدینہ نے اُس کا صرف ایک اقتباس نقل کیا ہے۔ بہر حال ان سب حضرات نے برہان کی رائے سے اختلاف کیا ہے اور اُس کو درست تسلیم نہیں کیا۔ اس سلسلہ میں خاکسار نے مدینہ کے فاضل مدیر کے نام ایک طویل خط لکھا ہے جس میں اپنے نقطۂ نظر کی کسی قدر توضیح و تشریح کر دی ہے اور موضوعِ گفتگو کے بعض پہلو جن کا تذکرہ نظرات میں نہیں ہو سکا تھا انھیں بیان کر دیا ہے ان صفحات میں اُس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے بلکہ عرض صرف اس قدر کرنا ہے کہ جہاں تک اُردو کے حق کے مطالبہ کا تعلق ہے وہ سرتاسر واجبی ہے اور ۲۲ لاکھ دستخطوں کے بعد یہ حق دستوری اور قانونی بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن اب سوال یہی ہے کہ اُردو تحریک کا قافلہ جس منزل پر آکر رُک گیا ہے اور اُس کی وجہ سے جمود و تعطل کی جو صورت پیدا ہو گئی ہے۔ آخر اس کو کس طرح دور کیا جائے ؟ یہ جمود و تعطل اردو تحریک کو ایک گھن کی طرح لگ گیا ہے اور اندر ہی اندر اسے کھائے جا رہا ہے۔ اس لئے لامحالہ آپ کو کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔ عوام کو زیادہ دنوں تک اس کشمکش اور گومگو کے عالم میں نہیں رکھا جا سکتا اس سلسلہ میں برہان کی رائے یہ تھی کہ اب نہ تو پیچھے ہٹنے یعنی مطالبہ واپس لینے کا سوال ہو سکتا ہے اور نہ زور و قوت کے ساتھ دیوار کھاند کر آگے بڑھنا یعنی ڈائرکٹ ایکشن شروع کرنا مقتضائے مصلحت و عقلمندی ہے۔ اس لئے بہتر یہی

ہے کہ قافلہ کا راستہ بدل دیجئے اور سفر شروع کیجئے۔

اگر چھن گیا اک نشیمن تو کیا غم مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

جن دوستوں کو اس سے اتفاق نہیں ہے وہ بتائیں کہ اگر یہ نہیں تو پھر اور کیا کیا جائے۔ اگر آپ نے راستہ نہیں بدلا تو بعض عجلت پسند حضرات عوام کے اس اضطراب کا ناجائز فائدہ اٹھا کر اردو تحریک کے موجودہ زعماء و قائدین کے خلاف کوئی محاذ بنالیں گے اور اس سے اردو تحریک کی اجتماعی قوت کو صدمہ پہنچنا یقینی ہے۔ دلی میں آئندہ مہینہ جو اُردو کانفرنس ہو رہی ہے اُس میں اس کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ ہونا چاہیئے۔

رہا یہ سوال کہ وہ اور دوسرا راستہ کون سا ہے؟ تو اس کے جواب میں عرض یہ ہے کہ اگر اردو کو سرکاری طور پر علاقائی زبان مان بھی لیا گیا لیکن اس کے لئے وہ تعمیری کوششیں نہ ہوئیں جو ایک زبان کو زندہ رکھنے اور اس کو ترقی دینے کے لئے ضروری ہیں تو محض علاقائی زبان بن جانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ اور اس کے برخلاف اگر یہ تمام تعمیری کوششیں ہوئیں مگر اُردو کو علاقائی زبان کی حیثیت حاصل نہ ہوئی تو زبان پھر بھی باقی رہے گی۔ پھولے پھلے گی، ترقی کرے گی اور آخر ایک وقت ایسا آجائے گا جب کہ "بقائے اصلح" کے قانون کے مطابق وہ کسی خاص ایک صوبہ میں نہیں بلکہ پورے ملک میں اپنا طبعی حق حاصل کرے گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصل ضرورت اُردو کی تعمیر و ترقی کے لئے ایک ہمہ جہتی پروگرام کی ہے۔ ایک اعلیٰ ترقی یافتہ زبان اپنے مخالفوں کے لئے بھی کیسی ناگزیر ہو جاتی ہے؟ اُس کا اندازہ ہندو پاک میں انگریزی اور مشرق وسطیٰ کے بعض ملکوں میں فرنچ کی حیثیت سے لگایا جا سکتا ہے ہماری تحریر کا مقصد اتنا ہی تھا کہ صرف ایک ہی لکیر کو پیٹتے رہنا کوئی عقلمندی اور اُردو کے ساتھ کمال خیر خواہی نہیں ہے کہ ع

ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

افسوس ہے پچھلے دنوں مولانا سید محمد ادریس صاحب سکروڈوی کا مظفر نگر میں انتقال

ہوگیا۔ مرحوم دار العلوم دیوبند کے قدیم اساتذہ میں سے تھے۔ یوں پڑھانے کو تو سب ہی کچھ پڑھا سکتے تھے لیکن ہیئت اُن کا خاص فن تھا۔ ہنسی ہنسی میں اس فن کے اہم نکات بیان کر جاتے تھے بظاہر بڑے بھولے بھالے اور سیدھے لیکن درحقیقت نہایت ذی فہم اور بڑی سوجھ بوجھ کے انسان تھے۔ درس کے شغل کے ساتھ تھوڑا بہت کوئی نہ کوئی تجارتی کاروبار بھی کرتے رہتے تھے ہم لوگوں کے ساتھ خصوصیت کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ حضرت الاستاذ مولانا سید محمد انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے خاص خادم تھے۔ دیرینہ تعلق وصحبت نے خادم و مخدوم میں بے تکلفی کی شان پیدا کردی تھی۔ اور مرحوم حضرت الاستاذ کے تمام اعزا و اقربا اور تلامذۂ خاص کو اور یہ سب لوگ مرحوم کو اپنا عزیز سمجھتے اور اُن کے ساتھ ایسا ہی معاملہ رکھتے تھے۔ انھیں دیکھ کر بے ساختہ حضرت الاستاذ یاد آجاتے تھے اور کوئی موضوع گفتگو ہو ہر پھر کے حضرت الاستاذ کا ذکر آہی جاتا تھا حق تعالیٰ رحمت و مغفرت کی نعمتوں سے سرفراز فرمائے۔ آمین

دار العلوم دیوبند کے دفتر اہتمام کی طرف سے اعلان ہوا ہے کہ ۵۸ء کے آخر میں دار العلوم کا ایک عظیم الشان جلسہ دستار بندی ہونا قرار پاچکا ہے جس میں مدرسہ کی یک صد سالہ دینی اور علمی خدمات کا جائزہ لیا جائے گا جلسہ کے انتظامات ابھی سے شروع ہوگئے ہیں۔ ایک مستقل دفتر اسی غرض کے لئے قائم کردیا گیا ہے۔ جو حضرات دار العلوم سے سندِ فراغ حاصل کرچکے ہیں وہ خود اور اُن کے قرب میں جو اور دیوبند کے فاضل ہوں اُن کے حالیہ پتے اپنے سنہ فراغ کے ساتھ دفتر اہتمام کو بھیج دیں اور حتی الوسع اس میں جلدی کریں اس میں شک نہیں کہ یہ جلسہ پورے عالم اسلام میں اپنی ایک خاص نوعیت کا جلسہ ہوگا علماء مشائخ اور اربابِ شریعت و طریقت کا اتنا بڑا اجتماع مشکل سے ہی کہیں دیکھنے میں آسکتا ہے اور اس بنا پر دینی اور مذہبی اعتبار سے اس کے اثرات و نتائج بہت گہرے۔ دور رس اور دیرپا ہوں گے عام مسلمانوں کو عموماً اور منتسبین دار العلوم کو خصوصاً چاہئے کہ اس جلسہ کو زیادہ سے زیادہ کامیاب بنانے میں مدرسہ کے ذمہ دار حضرات کے ساتھ مکمل تعاون و اشتراک کریں۔

آسیا صغریٰ
میسوپوٹامیہ
حمص
دمشق
جابیہ
بصریٰ
بحیرہ طبریہ
روم
فلسطین
اجنادین
موتہ
دریائے اردن
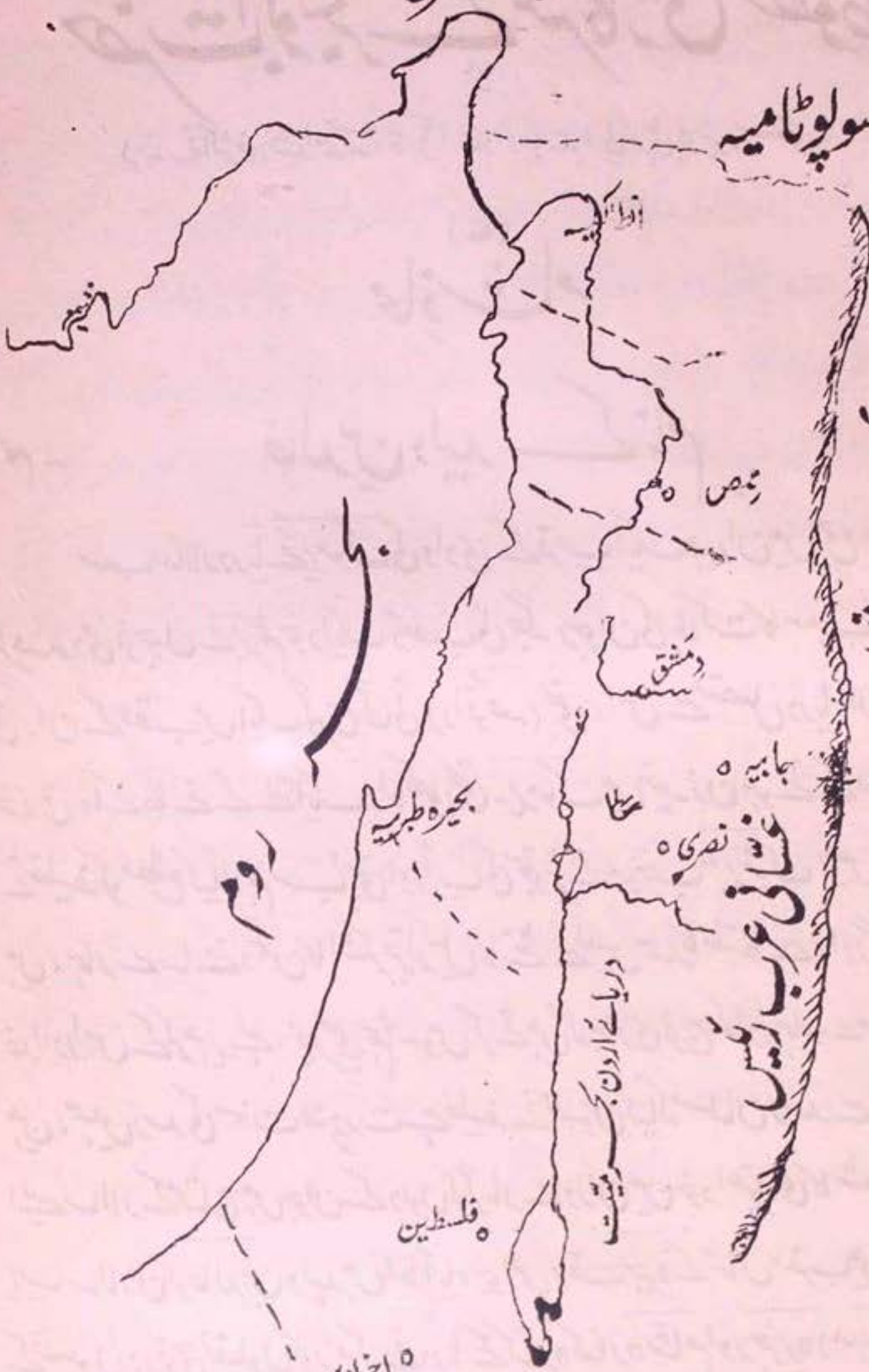
حضرت ابوبکرؓ کے سرکاری خطوط

از

(جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب فارق استاذ ادبیات عربی دہلی یونیورسٹی)

(۷)

محاذِ شام

۴۰۔ خالد بن ولید کے نام

سب سالار دریائے یرموک کی وادی کے قریب ایک میدان میں جمع ہوئے۔ دوسری طرف رومی فوجوں نے بزعمِ خود ایک ڈھب کی جگہ (جو ان کی ہلاکت کا سبب بنی) منتخب کی، ان کے عقب میں ایک گہری گھاٹی (واقوصہ) تھی، اس سے متصل دریا، اور سامنے خندق، آنے جانے کے لئے ایک راہ کھلی تھی۔ یرموک میں خیمہ زن ہونے کے بعد عرب سالاروں نے خلیفہ کو مطلع کیا کہ ہم سب اپنی اور آپ کی تجویز کے بموجب "یرموک" میں جمع ہو گئے ہیں، ہمارے سامنے دشمن کا لشکرِ جرار کیل کانٹے سے لیس حملہ کا منتظر ہے، اور گو ہمارا بھروسہ خدا اور اس کے کرم پر ہے، پھر بھی ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہماری فوج کم اور ہمارے ہتیار نارسا ہیں، ہمیں رسد کی سخت ضرورت ہے خلیفہ نے محسوس کیا کہ مسلمان رسد سے زیادہ ایک ایسے سالار کے محتاج ہیں جو ان کے دلوں کو گرما دے اور ان میں خود اعتمادی کا شعور پیدا کر سکے ایسا سالار ان کو خالد بن ولید میں نظر آیا، جو اس وقت حیرہ کے شمال مغرب میں مشرقی فرات کے قصبوں اور فوجی نقطوں کو رام کرتے دریا کے کنارہ کنارہ شام اور جزیرہ (میسوپوٹامیہ) کی سرحد تک پہنچ کر حیرہ واپس ہو رہے تھے۔ ابوبکر صدیق نے ان کو یہ رجسٹرڈ مراسلہ بھیجا (صفر ۱۳ھ):-

"تم چل دو اور مسلمان فوجوں سے "یرموک" میں جا ملو۔ رومیوں نے

ان کو غمگین کر رکھا ہے جس طرح انھوں نے رومیوں کو۔ خبردار! پھر تم وہ حرکت نہ کرنا جو تم نے کی۔ خدا کے فضل سے کوئی دوسرا دشمن کو (زک دے کر) ایسا غمگین نہیں کر سکتا جیسا کہ تم کر سکتے ہو، نہ کوئی دوسرا مسلمانوں کے دل کی کلی کھلا سکتا ہے جیسا تم کھلا سکتے ہو۔ اے ابو سلیمان! دعا ہے کہ جہاد کی لگن اور خدا کے انعام سے تم ہمیشہ بہرہ ور رہو، اس لگن کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دو، خدا انعام بھی پورا پورا دے گا، تمکنت تمھارے دل میں ہرگز داخل نہ ہو ورنہ تمھارا سارا کیا دھرا مٹی میں مل جائے گا اور خدا تمھاری مدد سے ہاتھ اُٹھالے گا۔ اپنے کسی کام پر بھروسہ بھی نہ کرو، کیوں کہ کامیابی کا مدار (انسانی کوشش پر نہیں) اللہ عزوجل کے لطف و احسان پر ہے۔ اچھے بُرے عمل کی جزا بھی اس کے ہاتھ میں ہے۔"

(طبری ۴/ ۴۰ و ۶۴)

"خبردار پھر تم وہ حرکت نہ کرنا جو تم نے کی" اس کا اشارہ خالد کے خفیہ حج کی طرف ہے ذوالقعدہ ۱۲ھ میں خالد نے فراض (جزیرہ۔ شام کی سرحد) پر رومی و فارسی فوجوں کو شکست دی اور اُبلّہ سے لے کر فراض تک مشرقی و مغربی فرات کے سارے گاؤں دیہات اسلام کے ماتحت آگئے اس وقت ان کے دل میں خفیہ حج کا شوق پیدا ہوا، حج کو خفیہ رکھنے کا صحیح سبب ہم کو نہیں معلوم، وہ فوج کے پشتی دستوں کے ساتھ تھے، چند منتخب ساتھیوں کو لے کر چوبیس یا پچیس ذوالقعدہ کو فراض سے مکہ کو روانہ ہوئے اور ایک دشوار گذار مگر چھوٹے راستہ سے بھیس بدل کر مکہ میں داخل ہوئے، حج کر کے دھاوے مارتے لوٹے اور ابھی فوج کے پشتی دستے حیرہ پہنچے بھی نہ تھے کہ ان سے آملے۔ خلیفہ کو خبر ہوئی تو انھوں نے خالد کا یہ فعل ناپسند کیا اور خط میں وہ جملہ لکھا جو آپ پڑھ آئے ہیں۔ اکثر مورخ اس خفیہ حج کے منکر ہیں۔ اس کی روایت اور تائید بس سیف بن عمر نے کی ہے۔

خط کی دوسری شکل: اس کو ابن مسکویہ نے تجارب الامم میں نقل کیا ہے:

"اپنی فوج لے کر چل دو اور مسلمانوں سے "یرموک" میں جا ملو۔ رومیوں نے ان کو غمگین بنا رکھا ہے۔ کوئی دوسرا دشمن کو (زک دے کر) ایسا غمگین نہیں کر سکتا جیسا تم کر سکتے ہو اور کوئی مسلمانوں کے دل کی کلی تمہاری طرح نہیں کھلا سکتا۔ ابو سلیمان! خدا سے دعا ہے کہ جہاد کی لگن اور خدا کے انعام سے تم ہمیشہ بہرہ ور رہو۔ اسی لگن کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دو، خدا انعام بھی پورا پورا دے گا۔ تمکنت ہرگز تمہارے دل میں داخل نہ ہو ورنہ تمہارا سارا کیا دھرا برباد ہو جائے گا، اور خدا تمہاری مدد سے ہاتھ اٹھا لے گا، اپنے کسی کام پر بھی بھروسہ نہ کرو، کیوں کہ کامیابی کا مدار (انسانی کوشش پر نہیں) اللہ عزوجل کے لطف و کرم پر ہوتا ہے، اچھے برے عمل کی جزا بھی اس کے ہاتھ میں ہے۔ مثنیٰ بن حارثہ کو عراق میں اپنا نائب بنا دو، اور جب خدا کے فضل سے مسلمان شام فتح کر لیں تو تم اپنے عہدہ پر عراق لوٹ جانا"۔ تجارب الامم مخطوط رقم ۴۴۶۴، ۱/۱۸۳-۱۸۴، دار الکتب قاہرہ۔

یہاں ایک تصریح ضروری ہے اور وہ یہ کہ قدیم عرب مورخوں میں صرف سیف بن عمر کی رائے ہے کہ "جنگ یرموک" ابوبکر صدیق کے عہد میں ہوئی جیسا کہ مذکورہ خط اور اس کے سیاق و سباق سے ظاہر ہوتا ہے، دوسرے مورخ مثلاً ابن اسحاق، مدائنی اور ازدی بصری اس رائے سے متفق نہیں، وہ کہتے ہیں کہ جنگ یرموک ۱۵ھ میں عمر فاروق کے عہد میں ہوئی اور یہ کہ ابوبکر صدیق کے عہد میں جو جنگ ہوئی اور جس کے لئے خالد کو محاذ عراق سے بدل کر محاذ شام بھیجا گیا فلسطین کے شہر اجنادین میں لڑی گئی، ابن اسحاق اور مدائنی نے جنگ اجنادین کی تاریخ آخر ربیع الاول ۱۳ھ اور ابوبکر صدیق کی تاریخ وفات آخر ربیع الثانی ۱۳ھ بیان کی ہے (طبری ۴/۲۶۴) یہی تاریخیں دنوں کے کچھ ہیر پھیر سے سیف بن عمر نے بھی پیش کی ہیں۔ (طبری ۴/۳۲)

خط کی تیسری شکل: اس کا مآخذ فتوح الشام ازدی ہے۔ ازدی نے "جنگ یرموک" کا ذکر ابن اسحاق اور مدائنی کی طرح عمر فاروق کے عہد میں کیا ہے اور خط زیر بحث "جنگ اجنادین" کے ضمن میں بیان کیا ہے:۔

"واضح ہو کہ جب تم کو میرا یہ خط ملے تو ان لوگوں کو چھوڑ کر جو تمھارے عراق پہنچنے سے پہلے وہاں موجود تھے، چل دو، اور اپنی فوج کے ان مردانِ کار کو ساتھ لے کر جو یمامہ میں تمھارے ہم رکاب تھے، یمامہ سے عراق کے سفر میں تم سے آملے تھے یا حجاز سے تمھارے پاس آگئے تھے، بعجلت تمام شام کا رُخ کرو۔ اور ابوعبیدہ[1] اور ان کی فوجوں سے مل جاؤ، وہاں پہنچ کر ساری فوج کے سالارِ اعلیٰ تم ہوگے، والسلام علیک۔" فتوح الشام ازدی بصری ص٥٥

ذیل کے سارے خط اور ان کے سیاق و سباق فتوح الشام ازدی سے لئے گئے ہیں۔ ازدی نے شام کی فتح جس خوبی سے بیان کی ہے، کسی دوسرے عربی مورخ نے نہیں کی۔ ان کے بیانات میں تفصیل ہی نہیں، خاصہ ربط اور تسلسل بھی موجود ہے، اس آخری صفت سے عربی کی اکثر تاریخیں عاری نظر آتی ہیں۔ ازدی نے مرکز اور محاذ کا کامیاب ذکر کیا ہے اور دونوں کے باہمی ربط کو بھی واضح کر دیا ہے جو خطوط کی صورت میں آپ ابھی ملاحظہ کریں گے۔ مرکز کے ذکر میں انھوں نے ایسی نئی تصریحات کی ہیں جن کو پڑھ کر ابوبکر صدیق کی سیرت میں بلندی اور جاذبیت پیدا ہوگئی ہے۔ ان تصریحات کے ضمن ابوبکر صدیق کی ان ہدایات کو خاص مرتبہ حاصل ہے جو محاذ پر بھیجتے وقت وہ اپنے سالاروں کو دیا کرتے تھے۔ چند مثالیں دلچسپی سے خالی نہیں ہوں گی۔

اپنے پہلے سالار شام یزید بن ابی سفیان کو مدینہ سے وداع کرتے وقت انھوں نے کہا:

"یزید! میری ہدایت ہے کہ خدا سے ڈرتے رہنا، اس کی اطاعت کرنا، اور اس کی رضا کو ہر دوسری رضا پر ترجیح دینا، دشمن سے جنگ میں خدا تم کو فتح

[1] خالد کے آنے سے پہلے ابوعبیدہ کمانڈران چیف تھے۔

نصیب کرے تو کسی کے گلے میں لوہے کا طوق (یا پیروں میں بیڑیاں) نہ ڈالنا، نہ کسی کا مُثلہ کرنا، نہ دشمن سے دھوکہ اور بے وفائی کرنا۔ (لڑائی میں) بُزدلی نہ دکھانا، بچوں کو مارنا، نہ بوڑھوں کو اور نہ عورتوں کو، کسی پھل دار درخت کو مت کاٹنا اور نہ کھجور کے درختوں کو برباد کرنا، کسی جانور کی کونچیں نہ کاٹنا الّا یہ کہ کھانے کے لئے ایسا کرنا پڑے۔ تمہارا گذرا ایسے لوگوں سے ہوگا جو خانقاہوں میں راہبانہ زندگی بسر کرتے ہیں، جو کہیں گے ہم نے اپنی زندگی خدا کی عبادت کے لئے وقف کردی ہے، ان سے بھی تعرض نہ کرنا...... تم (شام میں) میرے پہلے سالار ہو، میں نے تم کو بہت سے معزز مسلمانوں کا حاکم بنا دیا ہے ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنا، ان کے حقوق و آبرو کی حفاظت کرنا، ان کے ساتھ نرمی اور رواداری سے پیش آنا، اور اپنے معاملات میں ان سے مشورہ کرنا....."

(فتوح الشام ص۸)

جب دوسرے اور بڑے سالار ابو عُبیدہ بن جرّاح کوچ کی تیاری مکمل کر چکے تو ابوبکر صدیق ان سے ملنے آئے اور کہا: میری باتیں گوشِ ہوش سے سنو، تمہاری فوج میں بہت سے معزز، خاندانی اور صالح لوگ ہیں، اور ایسے شہسوار جو اسلام سے پہلے "ننگ و ناموس" کی خاطر لڑتے تھے اور آج سچی لگن سے انعامِ ایزدی کے لئے لڑنے جا رہے ہیں اپنے سب ساتھیوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا، حق و انصاف کے معاملہ میں سب لوگ تمہاری نظر میں برابر ہوں....." (فتوح شام ص۱۲)

ابو عبیدہ کی فوج میں یمن کی ایک معتدر شخصیت تھی : قیس بن ھُبیرہ مکشوح مُرادی، یہ اسود عَنسی کے کمانڈر ان چیف رہ چکے تھے اور کئی یمنی قبیلے ان کے زیرِ اثر تھے، جنگ کا بڑا تجربہ اور جنگی معاملات کی گہری سوجھ بوجھ رکھتے تھے۔ ایک بڑی جمعیت کے ساتھ ابوبکر صدیق کی دعوت پر شام میں لڑنے کی غرض سے مدینہ آگئے اور ابو عبیدہ بن جراح کے لشکر میں ضم کر دیئے گئے۔

ابوبکر صدیق ان الفاظ میں ابوعبیدہ سے اُن کی سفارش کرتے ہیں:

"تمھارے ساتھ ایک بڑا معزز آدمی ہے، عربوں کا ایک بڑا شہسوار، جس کی رائے اور بہادری سے مسلمان نہ جنگ نہ جنگی معاملات میں بے نیاز ہو سکتے ہیں، اس کو اپنا مقرب بنائے رکھنا، اور لطف و کرم سے اس کے ساتھ پیش آنا، اس پر ظاہر کرنا کہ وہ تمھارے لئے ضروری ہے، اور تم ہر طرح اس کے قدردان ہو، یہ رویہ رکھو گے تو وہ تمھارا خیر اندیش رہے گا، اور تمھارے دشمن سے پوری کوشش اور سنجیدگی سے لڑے گا۔" (فتوح الشام ص۲۱)

اب سُنئے قیس بن ھُبیرہ سے انھوں نے کیا کہا:

"تم کو ابوعبیدہ کے ساتھ جن کا لقب "امین" ہے، بھیج رہا ہوں، جن کی شان ہے کہ ظلم سہتے ہیں پر خود ظلم نہیں کرتے، ان سے کوئی برا سلوک کرتا ہے تو وہ معاف کر دیتے ہیں، اگر کوئی تعلق توڑتا ہے تو وہ جوڑ دیتے ہیں، مسلمانوں پر بڑے مہربان ہیں، کافروں کے ساتھ نہایت سخت، ان کے حکم سے سرتابی یا ان کی رائے سے انحراف نہ کرنا، وہ تم کو کبھی ایسا حکم نہ دیں گے جس میں خیر اور بھلائی نہ ہو میں نے ان کو تاکید کر دی ہے کہ تمھاری بات سنیں اور تمھارے مشورہ پر عمل کریں، تم ان کو جو رائے دو اس میں خدا کا خوف ضرور ملحوظ ہو، عہدِ جاہلیت میں جب گناہ کا دور دورہ تھا، ہم سنتے تھے کہ تم ایک معزز، بہادر اور تجربہ کار سردار ہو، اب تم اپنی شجاعت و لیاقت کو مسلمانوں کی سربلندی کے لئے مشرکوں کے خلاف صرف کر دو، خدا تم کو اس کا بڑا انعام دے گا۔۔۔۔"

فتوح الشام ازدی ص۲۱

خالد بن سعید بن عاص کو شام رخصت کرتے وقت ابوبکر صدیق نے نصیحت کی:

"تم نے میری رہنمائی کے لئے بہت اچھی نصیحتیں کیں جو میں نے گرہ میں باندھ

لی ہیں، اب میں تم کو کچھ ہدایتیں کرتا ہوں غور سے سنو اور اُن پر کاربند ہو، تم اسلام کے پُرانے شیدائی اور کارکن ہو اور اس حیثیت سے تمہارا رتبہ بہت بلند ہے، لوگ تمہاری طرف دیکھتے ہیں اور تمہارے مشورہ پر عمل کرتے ہیں، تم شام میں جہاد کرنے جس کا انعام خدا کی میزان میں بہت ہے، جارہے ہو، تمہاری سیرت ایسی ہونی چاہیئے کہ "عالم دین" دین پر ثابت قدم رہیں اور "جاہل" دین سے دلچسپی لے کر اس کے اچھے پیرو بن جائیں، اندھا دھند زندگی بسر کرنے والے نادانوں کو ڈانٹ ڈپٹ میں رکھنا، عام مسلمانوں کے خیرخواہ رہنا، سپہ سالار کو ایسے مشورے دینا جن سے حق کا بول بالا اور مسلمانوں کا بھلا ہو، تمہارا ہر کام "خوشنودیِ مولا" کے لئے ہو اور اس احساس سے گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو، خود کو مُردوں میں شمار کرلو! ہم سب عنقریب مرجائیں گے پھر دوبارہ جِلائے جائیں گے اور ہمارے اعمال کا محاسبہ ہوگا، خدا ہمیں اور تمھیں توفیق دے کہ اس کی نعمتوں کا گن گائیں اور اس کی سزا سے ڈرتے رہیں۔"

(فتوح الشام ازدی ص۱۵)

شام کی فتح میں مسلمانوں کی اچھی سیرت نے تو یاوری کی ہی، کچھ حالات نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ ہجرت سے کوئی چھ سال پہلے فارسیوں نے شام پر حملہ کرکے ملک کو پامال کر ڈالا تھا، کئی سال بعد رومی حکومت پھر شام میں لوٹ آئی، وہاں کے عوام دنیا کی دو سب سے بڑی (کسریٰ اور قیصری) بادشاہتوں کا تجربہ کرچکے تھے، اور یہ تجربہ بڑا تلخ تھا، دونوں کے نظام جابرانہ، حاکم ظالم اور فوجیں دست دراز تھیں، اس کے علاوہ شام میں عیسائی مذہبی تعصب نے ایک طبقہ کو غالب و فاتح اور دوسرے کو مغلوب و مفتوح بنا دیا تھا۔ رومی حکومت کا شام میں دوبارہ قبضہ ہوا تو لگان اور ٹیکس بڑھادئے گئے، فلسطین کے جنوب میں عربی شامی سرحد کے (غسانی) عرب رئیسوں کو جو سالانہ مدد دی جاتی تھی۔ بند کردی گئی (خلافت، کا عروج و زوال، تالیف ولیم میور

۱۹۲۴ء ص۶۵) ان سب باتوں کا اثر یہ ہوا تھا کہ شام کے بہت سے لوگ جن میں عوام، رئیس اور مذہبی پیشوا سب شامل تھے رومی حکومت سے بددل ہو گئے تھے۔ مسلمانوں کو انھوں نے اپنے آقاؤں سے بہتر پایا، مسلمانوں کا ٹیکس بہت ہلکا تھا، جس کو لے کر وہ نہ تو فوجی خدمت طلب کرتے، نہ بیگار اور نہ رعایا کے مذہبی معاملات میں مداخلت کرتے۔ ازدی نے لکھا ہے کہ جب مسلمان کئی طرف سے شام میں گھس پڑے تو وہاں کی حکومت نے شہر شہر گاؤں گاؤں مراسلے بھیجے اور رعایا کو حملہ آوروں سے لڑنے کی دعوت دی بہت سے لوگ اس دعوت پر فوج میں بھرتی ہو گئے لیکن ایک خاصی تعداد ایسے لوگوں کی بھی تھی جو فوجی خدمت سے گریزاں تھے، جن کی ہمدردیاں عربوں کے ساتھ تھیں، جو دل سے چاہتے تھے کہ عرب جیتیں اور رومی حکومت کا خاتمہ ہو۔ (فتوح الشام ازدی ص۳۶)

ایک رومی مورخ کا حوالہ دیتے ہوئے ہِتّی نے اپنی تاریخ عرب میں لکھا ہے: "رومی حکومت عربی۔ شامی سرحد کے قلعوں کی داشت و پرداخت سے غافل ہو گئی تھی۔ ستمبر ۶۲۹ء میں رومیوں نے جب رسول اللہؐ کے بھیجے رسالوں کو بمقام مُوتہ[1] شکست دی۔ تو ہرقل نے وہ سالانہ مدد بند کر دی جو بحر میّت کے جنوب اور مدینہ۔ غزّہ۔ جانے والی سڑک پر آباد قبائل کو دی جاتی تھی۔" (تاریخ عرب تالیف فیلپ ہِتّی ۱۹۳۷ء ص۱۴۳)

شام پر چڑھائی اوائل ۱۳ھ میں ہوئی لیکن سارے ملک پر قبضہ کرنے میں لگ بھگ چھ سال لگے اس عرصہ میں متعدد جنگیں ہوئیں جن میں ۲ دو بڑی سنگین تھیں: ایک جنگ اجنادین، دوسری جنگ یرموک۔ اجنادین کی جنگ۔ ابوبکر صدیقؓ کی وفات سے کچھ دن پہلے یعنی جمادی الاولیٰ ۱۳ھ میں واقع ہوئی اور جنگ یرموک ۱۵ھ میں جب عمر فاروقؓ خلیفہ تھے۔ اکثر مورخوں کی یہی رائے ہے۔

---

[1] دیکھیے نقشہ

۴۱۔ ابو عبیدہ بن جراح کے نام

جس وقت ابو بکر صدیق کے الگ الگ بھیجے تین لشکر سرحد شام پہنچے اس وقت قیصر روم عیسائیت کے بڑے مرکز فلسطین میں براجمان تھا۔ اس کو خبر ملی کہ عربوں کے کئی لشکر دھاوے مارتے چلے آ رہے ہیں ان کے نبی نے بشارت دی ہے کہ وہ شام فتح کریں گے، اس بشارت کو وہ شدنی امر سمجھتے ہیں، ان کو اس پر اتنا اعتماد ہے کہ انھوں نے بیوی بچوں کو بھی ساتھ لے لیا ہے۔ قیصر نے سارے ملک میں ہنگامی حالت کا اعلان کرا دیا، اس کی ساری دلچسپیاں سمٹ کر نئے خطرہ کا مقابلہ کرنے پر مرکوز ہو گئیں۔ علاقہ کے رومی حکام اور عیسائی عرب رئیسوں کا ایک ارجنٹ جلسہ بلایا اور یہ تقریر کی:

"اس دین کے ماننے والو! خدا تم پر بڑا مہربان تھا، اس نے تمھارے دین کو عزت و شرف بخشا اور اس کو فارسیوں، ترکوں بلکہ ساری اقوام پر غالب اور فاتح بنا دیا، اس کی وجہ یہ تھی کہ تم اپنے رب کی کتاب اور نبی کی اعلیٰ سنت پر عمل کرتے تھے۔ جب تم بدل گئے اور تمھاری سیرت خراب ہو گئی تو عربوں کو حوصلہ ہوا کہ تم پر حملہ کریں، بخدا میں نے کبھی ان کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا، اور نہ کبھی مجھے اس بات کا اندیشہ ہوا کہ ان کے حملہ کی آزمائش میں ڈالے جائیں گے وہ ننگے پیر، ننگے جسم اور بھوکے چلے آ رہے ہیں، بنجر زمین اور بارش کے قحط اور افلاس نے ان کو مجبور کر دیا ہے کہ تمھارے ملک پر حملہ کریں۔ ان کا مقابلہ کرنے نکل کھڑے ہو، اپنے دین، اپنے وطن، اپنی عورتوں اور بچوں کی خاطر ان سے لڑو، میں عازمِ سفر ہوں، تمھاری ضرورت بھر پیدل اور سوار فوج بھیجوں گا، میں نے تمھارے سالار مقرر کر دئیے ہیں، ان کا کہا ماننا۔" (فتوح الشام ازدی ص۲۲)

فلسطین میں تیاری مکمل کر کے قیصر شام کے صوبائی صدر مقاموں کے دورہ پر نکلا پہلے

دمشق[سلہ] آیا اور وہاں کے حکام و رؤسا کو بھرتی کے احکام دے کر (شمالی صوبہ کے صدر مقام) حمص[سلہ] پہنچا اور یہاں تقریر و تلقین سے لوگوں میں جنگی جوش پیدا کر کے انطاکیہ[سلہ] کا رُخ کیا۔ انطاکیہ شام کی شمالی سرحد کے خاتمہ پر پہاڑوں کی گود میں ایک اہم شہر تھا، اس کے کچھ دور بعد قیصر کی وہ قلمرو شروع ہو جاتی تھی جس پر اس کے آباء و اجداد کی پشت ہا پشت سے براہِ راست حکومت تھی انطاکیہ کو اس نے اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا، عربوں سے جنگ کی اعلیٰ نگرانی اپنے ہاتھ میں لی۔ میسوپوٹامیہ، آسیا صغریٰ، آرمینیہ اور سلطنت کے دوسرے صوبے داروں کو فوجوں اور ہتیاروں کے لئے تاکیدی فرمان بھیجے۔

[سلہ] اس اثنا میں ابو بکر صدیق کے مامور کردہ سالار سرحد پار کر کے شام میں داخل ہو چکے تھے کئی چھوٹی لڑائیاں بھی ہوئیں جن میں حملہ آور جیتے، اور کئی قلعوں کا محاصرہ ہوا، جن کے حاکموں نے صلح کرلی۔ قیصر کے انطاکیہ پہنچنے کے کچھ دن بعد ابو عبیدہ نے جابیہ[سلہ] پر قبضہ کرلیا، جابیہ صوبہ دمشق کی مشرقی عمل داری میں سرحد شام کے مضافات میں ایک گاؤں تھا، اس کے آس پاس مزروعہ بستیاں تھیں جہاں سے غلّہ اور چارہ کی فراہمی آسان تھی۔ ابو عبیدہ کے پاس باقی دونوں سالاروں سے زیادہ فوج تھی، اور وہ مرتبہ میں بھی دونوں سے بڑے تھے یوں تو یزید اور شرحبیل اپنے اپنے میدانِ عمل میں خود مختار تھے لیکن ان کو حکم تھا کہ اگر تینوں کسی ایک جگہ جنگ میں شریک ہوں تو سالارِ اعلیٰ ابو عبیدہ ہوں گے۔ جابیہ بہت بڑی چھاؤنی بن گئی، جہاں مرکز سے برابر دستے اور رسالے آکر جمع ہوتے پھر وہاں سے دوسرے سالاروں کو حسب ضرورت بھیج دئے جاتے

ابو عبیدہ کے مقامی جاسوسوں نے خبر دی کہ قیصر روم شام کا دورہ کرتا، شامیوں میں جنگی حرارت پیدا کرتا اور بھرتی کے احکام دیتا، انطاکیہ چلا گیا ہے، جہاں اس نے اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا ہے اس نے "ا یسے لشکر تیار کئے ہیں جو اس کے باپ دادا یا کسی اور بادشاہ نے کبھی نہیں کئے۔" عنقریب یہ لشکر مسلمانوں سے متصادم ہونے آنے والے ہیں۔ ابو عبیدہ نے صورت حال سے مطلع کرنے کے لئے ابو بکر صدیق کو ایک خط لکھا جس میں تھا:

"مجھے خبر ملی ہے کہ شاہ روم ہرقل انطاکیہ میں فروکش ہوا ہے، اس نے اپنی بیرونِ شام قلمرو سے فوجیں بلائی ہیں، یہ فوجیں اس کے پاس روانہ بھی ہو چکی ہیں، میں نے مناسب سمجھا کہ آپ کو صورتِ حال سے مطلع کروں تاکہ آپ مناسب کارروائی کریں۔" (فتوح شام ازدی ص۲۷)

ابوبکر صدیق نے جواب دیا:۔

"بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ تمہارا خط ملا، شاہِ روم کے بارے میں تم نے جو لکھا ہے میں نے ذہن نشین کیا۔ اس کے انطاکیہ میں قیام پذیر ہونے کے معنی ہیں کہ وہ اور اس کی فوجیں شکست کھائیں گی اور تم اور مسلمان اللہ کے فضل سے فتح حاصل کرو گے۔ تم نے یہ جو لکھا ہے کہ تم سے لڑنے کے لئے وہ اپنی ساری قلمرو سے فوجیں جمع کر رہا ہے تو یہ ایسی بات ہے جس کے رونما ہونے کا ہمیں اور تمھیں پہلے سے علم تھا، کوئی قوم اپنا اقتدار اور اپنا ملک لڑے بغیر نہیں چھوڑا کرتی۔ خدا کا شکر ہے تم جانتے ہو کہ بہت سے مسلمان پہلے ان سے لڑ چکے ہیں جن کو موت اتنی پیاری تھی جتنی اُن کے دشمن کو زندگی۔ جن کو لڑائی کے صلہ میں خدا اجرِ عظیم عطا کرے گا، جو جہاد فی سبیل اللہ کو اپنی باکرہ بیویوں اور چُنی دولت سے زیادہ عزیز رکھتے تھے، جن کا ایک مرد، مشرکوں کے ہزار آدمیوں سے بہتر تھا۔ (ان جاں نثاروں کی مثال سامنے رکھ کر) میرے لشکر سے ان کا مقابلہ کرو اور تعداد کی کمی سے نہ گھبراؤ۔ اللہ تمہارے ساتھ ہے، پھر بھی انشاء اللہ میں تمہارے پاس اتنی رسد بھیجوں گا جس سے تم مطمئن ہو جاؤ گے اور جس سے زیادہ کی تم کو خواہش نہ رہے گی، والسلام علیک۔"

(فتوح الشام ازدی ص۲۷)

علمائے ہند کی کلامی خدمات

از

(جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم - اے انسپکٹر مدارس عربیہ و رجسٹرار عربی و فارسی امتحانات اتر پردیش)

ہندوستان میں اسلامی ثقافت فتح سندھ کے بعد پہلی صدی ہی سے پھیلنے لگی تھی اور چھٹی صدی کے بعد تو [جب کہ غوری فاتحین اور اُن کی ہندوستانی جانشین دولتِ مملوکیہ نے ہندوستان میں ایک مستحکم حکومت قائم کی] مساجد و خوانق کی تعمیر اور مدارس کا قیام حکومتی استحکام کی شرطِ اولین سمجھا جانے لگا چنانچہ مسلمان فاتحین جن علاقوں کو فتح کرتے جاتے تھے وہاں مساجد و مدارس کی بنیاد ڈالتے جاتے تھے - ملا نظام الدین ہروی نے طبقات اکبری میں ملک بختیار الدین خلجی کے بارے میں لکھا ہے:-

"ملک بختیار الدین خلجی ...... شہر ندیا را خراب ساختند و عوض شہر آں دیگر موضعے کہ لکھنوتی بودہ است، بنا نہادہ دار الملک خود ساخت ...... چتر برگرفت و خطبہ و سکہ بنام خود کرد و مساجد و خوانق و مدارس بجائے معابد احداث نمودہ" (طبقات اکبری صـ ۲۳)

یہ چھٹی اور ساتویں صدی ہجری کا واقعہ ہے مگر مقدسی کی تصریح کے مطابق سندھ کے اندر مدارس کا وجود چوتھی صدی ہجری کے وسط میں ملتا ہے بلکہ غالباً اس سے بہت پہلے سے ان کا رواج تھا۔

دیگر ممالک اسلامیہ کی طرح ان مدارس میں بھی وقت کے تمام علومِ متداولہ کی تعلیم ہوتی تھی۔ اس لئے یہاں کے مدارس میں بھی علم کلام کے ساتھ اعتنا فطری تھا۔ کم از کم ساتویں صدی ہجری کے بعد سے تو علمائے ہند دوسرے علوم عقلیہ و نقلیہ کے ساتھ ساتھ علم کلام میں بھی یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ سطور ذیل میں ہندوستانی علماء کی کلامی خدمات کا ایک مختصر جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

لیکن نفسِ مضمون کی توضیح و تبیین سے پیشتر علم کلام کے آغاز و ارتقا اور ہندوستان میں اسلامی ثقافت کی نشر و اشاعت کا ایک اجمالی خاکہ مستحسن ہوگا۔

(۱) علمِ کلام کا آغاز و ارتقا

علم کلام کی حقیقت | اسلامی فکر میں علمِ کلام کا آغاز ثقافتی ارتقاء کے عام قوانین کا فطری تقاضا تھا۔ ہر

مذہب کو جلد یا بدیر دنیا کے سامنے اپنی تعلیمات عقل کی کسوٹی پر کس کر پیش کرنا ہوتا ہے۔ بالخصوص جب ملکی توسیع یا دینی تبلیغ کے سلسلے میں دوسری اقوام سے جن کے معتقدات اُس کی تعلیمات سے متصادم ہوتے ہیں سابقہ پڑتا ہے تو اُسے اپنی تعلیمات کی صحت و معقولیت عقلی دلائل کی مدد سے واضح کرنا پڑتی ہے، نیز مخالفین کے شکوک و شبہات اور اعتراضات کا جواب عقلی بنیادوں پر مہیا کرنا ہوتا ہے۔ اسلام کو بھی جب غیر قوموں سے سابقہ پڑا تو اپنی فکری مساعی کو اس جہت میں منعطف کرنا پڑا۔ یہی علم کلام تھا، چنانچہ المواقف میں علم کلام کی یہی حقیقت بتائی گئی ہے:۔

"الکلام علم یقتدر معہ علی اثبات العقائد الدینیۃ بایراد الحجج ودفع الشبہ	علم کلام وہ علم ہے جس کے ذریعہ عقائد دینیہ کے ثابت کرنے پر قدرت حاصل ہوتی ہے بایں طور کہ اُن کے ثبوت میں حجتیں لائی جائیں اور اُن پر جو شبہات وارد ہوتے ہیں اُنھیں دفع کیا جائے۔

(المواقف موقف اول مرصد اول مقصد اول)

علم کلام کا پہلا دور اس علم کلام کی بنیاد کب اور کس طرح پڑی، یہ تاریخ فکرِ اسلامی کا ایک دلچسپ مسئلہ ہے۔ اس کی تفصیلات میں گئے بغیر یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ کلامی تفکیر کے قدیم نمایندے معتزلہ تھے اور معتزلی مکتبِ فکر کا قدیم ترین نمایندہ [بلکہ اکثر مورخین کے نزدیک اُس کا بانی] واصل بن عطاء تھا جو اپنے عہد کا مشہور مناظر و خطیب اور [جو چیز اُس زمانہ کے عام علمی حالات کے بموجب غیر معمولی اہمیت رکھتی تھی] کثیر التصانیف مصنف تھا۔ ابن الندیم نے کتاب الفہرست کے تکملہ میں اُس کی متعدد تصانیف کا ذکر کیا ہے جن میں سے مندرجہ ذیل قابلِ ذکر ہیں:۔

کتاب اصناف المرجئہ۔

کتاب المنزلۃ بین المنزلتین۔

کتاب الخطب فی التوحید والعدل۔

کتاب السبیل الی معرفۃ الحق۔

کتاب فی الدعوۃ۔

کتاب طبقات اہل العلم والجہل [1]

حسن بصری رح کے ساتھ واصل کا واقعہ کہ موخر الذکر کے "المنزلۃ بین المنزلتین" کا نرالا قول احداث کرنے پر اول الذکر نے اُسے "قد اعتزل عنا" کہہ کر اپنے حلقہ سے نکال دیا تھا اور اسی بنا پر وہ اور اس کے متبعین "معتزلہ" کے نام سے موسوم ہوئے [2] مشکوک الصحۃ ہے کہ واصل بن عطاء سے بہت پہلے معتزلہ کی جماعت موجود تھی جو اصولی مسائل دینیہ پر غور و خوض کیا کرتی تھی [3]۔

بہر حال واصل بن عطاء نے ۱۳۱ھ میں وفات پائی اور اُس پر علم کلام کے پہلے دور کا خاتمہ ہو گیا جس کی خصوصیت علامہ تفتازانی کے لفظوں میں حسب ذیل تھی۔

ومعظم خلافیاتہ مع الفرق الاسلامیۃ [4]	اس طبقہ کے اکثر اختلافات اسلامی فرقوں کے ساتھ تھے۔

علم کلام کا دوسرا دور: واصل بن عطاء کی وفات کے اگلے سال عباسی حکومت کا آغاز ہوا اور اس کے ساتھ علم کلام کا بڑا دور بلکہ اصلی کارنامہ شروع ہوا۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔

عباسی حکومت کا آغاز محض حکمراں خاندانوں کی تبدیلی ہی نہ تھا بلکہ "عرب کے سوزِ دروں" پر "عجم کے حسنِ طبیعت" کے غلبہ کا آغاز تھا۔ عباسی عجمیوں کی امداد سے برسرِ اقتدار آئے تھے لہٰذا دربارِ خلافت نے ان کے معاملے میں زیادہ نرم پالیسی اختیار کی۔ حریتِ فکر کے نام پر مخالفین و معاندین نے اسلام پر بےجا و بےحیا اعتراضات کرنا شروع کئے اور الحاد و زندقہ کی تحریک کا آغاز ہوا۔ اسی زمانہ میں یونانی فلسفہ عربی زبان میں منتقل ہونا شروع ہوا جس سے اس تحریک کے شیوع میں بہت مدد ملی اور کچھ ہی دنوں میں اس نے خطرناک شکل اختیار کر لی یہاں تک کہ تیسرے عباسی خلیفہ المہدی (۱۵۸ - ۱۶۹) کو اس کے انسداد پر خاص طور سے توجہ دینا پڑی۔ اُس

---

[1] الفہرست لابن الندیم تکملہ ص۱ [2] شرح عقائد نسفی ص۵ [3] رد اہل الاہواء والبدع بحوالہ تبیین کذب المفتری ص۱۰ حاشیہ [4] شرح عقائد نسفی ص۵۔

نے ایک جانب زنادقہ کی امن سوز تخریبی کارروائیوں پر قابو پانے کے لئے ایک خصوصی پولس افسر "صاحب الزنادقہ" کا عہدہ قایم کیا اور دوسری جانب اُن کے اصولی نظریات کی تنقید و تردید کے لئے متکلمین واہلِ جدل کو بلاکر اُن کے خلاف کتابیں لکھوائیں چنانچہ مسعودی لکھتا ہے:-

"وکان المہدی اول من امر الجدلیین من اہل البحث من المتکلمین بتصنیف الکتب فی الرد علی الملحدین ممن ذکرنا من الجاحدین وغیرھم واقاموا البراھین علی المعاندین وازالوا شبہ الملحدین فاوضحوا الحق للشاکین"[1]

اور مہدی نے سب سے پہلے طبقہ متکلمین میں سے مناظروں کو بلاکر ملاحدہ اور دیگر مخالفین کے رد میں جن کا ہم نے ذکر کیا ہے کتابیں تصنیف کرنے کا حکم دیا اور انھوں نے مخالفین کے مقابلے میں دلائل قائم کئے ملاحدہ کے شبہات کا ازالہ کیا اور متشککین کے واسطے حق کو واضح کیا۔

اس طرح علم کلام کے دوسرے دور کا آغاز ہوا۔ علامہ تفتازانی نے شرح عقائد النسفی میں لکھا ہے

ثم لما نقلت الفلسفہ عن الیونانیہ الی العربیۃ وخاض فیھا الاسلامیون وحاولوا الرد علی الفلاسفۃ فیما خالفوا فیہ الشریعۃ فخلطوا بالکلام کثیرا من الفلسفۃ لیتحققوا مقاصدھا فیتمکنوا من ابطالھا ...... وھذا کلام المتاخرین[2]

پھر جب فلسفہ یونانی سے عربی میں ترجمہ ہوا اور مسلمانوں نے اُس میں غور و خوض کیا اور جن اُمور میں فلسفہ نے شریعت کی مخالفت کی تھی، اُس کی تردید کا ارادہ کیا تو کلام میں بہت سے فلسفے کے مسائل ملادیئے تاکہ اُن کے مقاصد کی تحقیق کرسکیں اور اس طرح اُن کے باطل کرنے پر قادر ہوسکیں ...... اور یہ متاخرین کا علم کلام ہے۔

اب متکلمین دربارِ خلافت پر چھاگئے اور درباری قدردانی وہمت افزائی کی بنا پر مشاہیر

[1] مروج الذہب للمسعودی جلد دوم ص۱۷۱ [2] شرح عقائد النسفی ص۵

معتزلہ مثلاً ابو الہذیل العلاف، ابراہیم بن سیار النظام، ہشام بن الحکم، بشر بن المعتمر ثمامہ بن اشرس، معمر بن عباد، فضل الحدثی، احمد بن حابط، وغیرہم کا ظہور و نبوغ ہوا۔ ان لوگوں نے مخالفین کی تنقید و تردید انھیں کے اُصولوں پر کرنے کے لئے اُن کے مذاہب بالخصوص یونانی فلسفہ کا بڑا عمیق مطالعہ کیا چنانچہ اُن کی علمی سرگرمیوں کے متعلق شہرستانی نے لکھا ہے۔

"ثم طالع بعد ذلك شيوخ المعتزلة كتب الفلاسفة حين فسرت ايام المأمون فخلطت مناهجها بمناهج الكلام ...... فكان ابو الهذيل العلاف شيخهم الاكبر وافق الفلاسفة ...... ثم ابراهيم بن سيار النظام في ايام المعتصم كان اعلیٰ في تقرير مذاهب الفلاسفة ...... ومن اصحابه محمد بن شبيب وابو شمر وموسىٰ بن عمران والفضل الحدثي واحمد بن حابط ووافقه الاسواري في جميع ماذهب اليه من البدع وكذلك الاسكافية اصحاب ابي جعفر الاسكافي والجعفرية اصحاب الجعفرين جعفر بن مبشر وجعفر

اس کے بعد جب فلسفہ کی کتابیں مامون الرشید کے زمانہ میں ترجمہ ہوئیں تو مشاہیر معتزلہ نے اُن کا مطالعہ کیا اور اس طرح فلسفہ کے مناہج کو علم کلام کے مناہج کے ساتھ خلط ملط کر دیا ...... چنانچہ ابو الہذیل العلاف جو اُن کا مشہور عالم تھا وہ فلاسفہ کا ہم زبان تھا ...... پھر ابراہیم بن سیار النظام، جو متعصم باللہ (۲۱۸-۲۲۷) کے زمانہ میں تھا، سب سے فلاسفہ کی تقریر میں دستگاہِ کامل رکھتا تھا .... اُس کے شاگردوں میں محمد بن شبیب، ابو شمر موسیٰ بن عمران، فضل حدثی اور احمد بن حابط تھے۔ نیز الاسواری نے اُس کی جملہ بدعات میں اُس کی موافقت کی تھی۔ اسی طرح فرقہ اسکافیہ نے جو ابو جعفر الاسکافی کے پیرو تھے اور جعفریہ فرقے نے جو جعفر بن مبشر اور جعفر بن حرب کے متبع تھے اُس کی موافقت کی) پھر بشر بن المعتمر کی بدعتوں کا زمانہ آیا جو تولد (علت ثانیہ) کا قائل تھا بلکہ اُس میں

بن حرب ثم ظهرت بدع بشر ابن المعتمر من القول بالتولد والافراط فيه والميل الى الطبيعيين من الفلاسفة"[1]

مبالغہ کرتا تھا اس کے علاوہ فلاسفہ میں سے طبیعیین کی جانب اُس کا میلان تھا۔

مخالفینِ اسلام کے افکار و آرار کے مطالعہ پر زیادہ وقت صرف کرنے کا یہ فطری نتیجہ تھا کہ ان لوگوں کو کتاب و سنت کے گہرے مطالعہ کا موقعہ نہیں مل سکا اور وہ عقلیت کی پرستاری میں اسلام کی روح سے بیگانہ تر ہوتے گئے یوں بھی اعتزال کی بُنیاد شروع ہی سے غیر اسلامی فکری رجحانات سے متاثر تھی :- جبر و اختیار کے مسئلے میں ان لوگوں پر یہودی [یا نصرانی] تعلیمات کا اور صفاتِ باری کے مسئلے میں یہودی اور نو فلاطونی تعلیمات کا اثر غالب تھا۔ لہذا اس عہد کے متکلمین نے جہاں ایک جانب زنادقہ و فلاسفہ اور دیگر مخالفین اسلام کے اعتراضات کا دنداں شکن جواب دیا۔ دوسری جانب اسلامی تعلیمات کی غلط ترجمانی پر بھی اصرار کیا۔ اس بے راہ روی کی اصلاح پر علمائے اسلام [محدثین و فقہائے کرام] نے شروع ہی سے توجہ کی۔ قدریت جس کی بدعت آخر عہد صحابہ ہی میں پیدا ہو چکی تھی[2] متاخرین صحابہ نے اُس سے بے زاری کا اظہار کیا۔ اس کی تفصیل علم کلام کی تواریخ میں مذکور ہے اس باب میں امام مالکؒ کا "رسالہ فی القدر والرد علی القدریہ"[3] خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ انکارِ صفات کی بدعت پہلی صدی کے اختتام پر نمودار ہوئی جس کے بانی جعد بن درہم اور اُس کا شاگرد جہم بن صفوان تھے۔ اس سے مشاہیر تابعین و تبع تابعین نے بے زاری کا اظہار کیا چنانچہ اثباتِ صفات کے موضوع پر قدیم زمانہ ہی سے اکثر محدثین کرام نے قلم فرسائی کی جن کے نام اور تصانیف حافظ ابن تیمیہ نے رسالہ حمویہ میں گنائے ہیں۔

---

[1] الملل والنحل الشہرستانی جلد اول صہ ۱۲ [2] ایضاً صہ ۱۲ [3] الدیباج المذہب صہ ۲۷ فمن اشہرها فی هذا الباب رسالته فی القدر والرد علی القدریة وهو من خیار الکتب الدالة علی سعة علمه۔

لیکن ان کتابوں پر علمِ کلام سے زیادہ حدیث کی مصنفات ہونے کا زیادہ اطلاق ہو سکتا ہے۔ سنی نقطۂ نظر سے اس موضوع پر سب سے پہلی اور سب سے اہم کتاب "فقہ اکبر" ہے جسے امام ابو حنیفہؒ نے تصنیف فرمایا تھا۔ امام صاحب سرآمد فقہائے روزگار تو تھے ہی علم کلام میں بھی یدِ طولیٰ رکھتے تھے بلکہ علمائے متکلمین کے گلِ سرسبد تھے چنانچہ مشہور ہے

"الناس عیال علی ابی حنیفۃ فی الکلام"

بہرکیف اس دور میں (دوسری اور تیسری صدی میں) علم کلام کے دو مکاتب فکر تھے۔ اہل السنت والجماعت کا علم کلام [جو اس دور میں فرق مبتدعہ بالخصوص فرق جہمیہ و معتزلہ کے علم کلام سے امتیاز کے لئے فقہ اکبر یا علم التوحید والصفات کہلاتا تھا] اور غیر اہل السنت والجماعت کا علم کلام جن میں معتزلہ کی کلامی سرگرمیاں زیادہ نمایاں تھیں۔ معتزلی علم کلام میں جہاں تک اسلامی تعلیمات کی توجیہہ کا تعلق ہے "تعطیل" اور "قدر" پر خصوصیت سے زور دیا جاتا تھا۔ ان میں سے اول الذکر یعنی "انکارِ صفات" کے مسئلے نے نصف صدی کے بعد "خلق قرآن" کے فتنہ کی شکل اختیار کرلی جس کے سلسلے میں مشاہیر علمائے وقت کو قید و بند کی مصیبتیں جھیلنا پڑیں اور جو مامون الرشید (۱۹۸-۲۱۸) کے تاباں و درخشاں عہدِ حکومت پر ایک بدنما دھبہ ہے مامون کے دو جانشینوں معتصم (۲۱۸-۲۲۷) اور واثق (۲۲۷-۲۳۲) نے بھی اس ایک گونہ احتسابِ مذہبی کی لعنت کو باقی رکھا مگر جب واثق کی وفات کے بعد متوکل باللہ (۲۳۲-۲۴۷) تخت نشین ہوا تو اس نے اس پالیسی کو موقوف کردیا۔ احمد بن ابی داؤد جو اس فتنے میں مامون اور اس کے جانشینوں کا مشیر کار تھا کچھ عرصے بعد معتوب بارگاہ ہوا۔ معتزلہ کا اثر و رسوخ دربار خلافت سے زائل ہونے لگا اور متوکل نے [کسی وجہ سے بھی ہو] احیائے سنت کے باب میں کمر بستگی کا اظہار کیا۔ اس طرح اہل السنت والجماعت کا مسلک یوماً فیوماً ترقی پذیر ہونے لگا۔

چنانچہ مشاہیر محدثین مثلاً امام بخاری، امام مسلم، امام ابو عیسیٰ ترمذی، امام ابو داؤد سجستانی

وغیرہم نے اسی زمانہ میں اپنی اپنی جامع اور سنن مدون فرمائیں۔ اسی طرح مشاہیر فقہاء اپنے اپنے مقام پر تفقہ فی الدین کے فرائض انجام دے رہے تھے مگر خالص کلامی خدمات کے لئے عبد اللہ بن محمد بن کلاب القطان، ابو العباس القلانسی، الحارث بن الاسد المحاسبی، عبد العزیز بن یحییٰ المکی وغیرہم مشہور تھے جو متکلمانہ انداز میں اعتزال کی بیخ کنی کر رہے تھے۔

لیکن معتزلہ نے بھی اس عرصے میں اپنے اثر و رسوخ کو بہت زیادہ بڑھا لیا تھا اور درباری سرپرستی سے محروم ہونے کے بعد بھی وہ علمی دنیا پر چھائے رہے۔ اس عہد (تیسری صدی ہجری کے) مشاہیر معتزلہ حسب ذیل تھے:۔

ابو جعفر الاسکافی، جعفر بن مبشر، جعفر بن حرب، ابو موسیٰ المردار، ابو عثمان الجاحظ، ابن الراوندی، ابو الحسین الخیاط، ابو القاسم الکعبی، ابو علی الجبائی، ابو ہاشم، ابو العباس الناشی، ابو محمد عبد اللہ بن محمد الخالدی، ابو عیسیٰ الوراق وغیرہم۔

تیسری صدی کے سرے پر فرقہ معتزلہ کا سید الطائفہ ابو علی الجبائی تھا جس کے متعلق ابن خلکان نے ابن حوقل کے حوالے سے لکھا ہے

"ابو علی الجبائی الشیخ الجلیل امام المعتزلۃ ورئیس المتکلمین فی عصرہ"[۱]

علم کلام کا تیسرا دور | اسی الجبائی کے شاگرد امام ابو الحسن الاشعری تھے۔ کم و بیش چالیس سال تک اعتزال کی آغوش میں پرورش پانے کے بعد جب کہ انھوں نے اپنی فطری صلاحیتوں اور ریاض و جگر کاوی سے یہ مرتبہ بہم پہنچایا تھا کہ اگر وہ معتزلی ہی رہتے تو ابو علی الجبائی سے بھی بڑھ کر ہوتے اور قوتِ کلام اور تشحیذِ ذہنی کی بنا پر ابو الہذیل العلاف کے درجے پہ پہنچ جاتے، یکایک محض توفیقِ ایزدی و تائیدِ صمدی سے وہ اس اعتزال سے تائب ہو کر حلقۂ اہل السنت والجماعت میں داخل ہوئے۔ اُن کے توبہ کرنے اور گروہ اہل سنت میں داخل ہونے کی تفصیل ابن عساکر نے "تبیین کذب المفتری" میں دی ہے جس کا اعادہ موجب تطویل ہوگا۔

---

[۱] وفیات الاعیان لابن خلکان جلد اول ص ۴۸۱

بہر کیف تیسری صدی کے سرے پر ۲۹۶ھ میں امام اشعری کی زندگی میں اور اُس کے ساتھ اسلامی سماج میں ایک انقلابِ عظیم برپا ہوا۔ تیسری صدی میں خالص اسلامی فکر کو جس کے علم بردار محدثین تھے عموماً "حشویت" سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ اس لئے اُس کے نام لیوا کم تھے لیکن جب امام ابو الحسن الاشعری کے مبارک ہاتھوں سے اُمت کی تجدید ہوئی تو فکرِ اسلامی کے دھارے کا رُخ ہی بدل گیا اور چوتھی صدی میں چہار جانب سنت ہی کا چرچا ہونے لگا چنانچہ اُن اکابر مفکرین (متکلمین اشاعرہ) کی تعداد جو اُن کے بعد پیدا ہوئے سینکڑوں ہزاروں تک پہنچتی ہے، ان میں سے بعض کے اسمارِ گرامی حافظ ابن عساکر نے "تبیین کذب المفتری" میں [از صفحہ ۱۱۷ تا صفحہ ۳۳۰] بیان کئے ہیں اور پھر بھی انھیں عدمِ استقصار کا شکوہ ہے:۔

ولولا خوفي من الاملال للاسهاب وايثاري الاقتصار لهذا الكتاب لتتبعت ذكر جميع الاصحاب ..... وكنت اكون بعد بذل المجهود مقصراً او من تقصيري بالاخلال بذكر كثير منهم معتذراً فكما لا يمكنني احصاء نجوم السماء كذلك لا اتمكن من استقصاء ذكر جميع العلماء[1]

اگر مجھے خوف نہ ہوتا کہ زیادہ گوئی سے قارئین اکتا جائیں گے اور چوں کہ میں نے اس کتاب میں اختصار کو ملحوظ رکھا ہے، تو سب بزرگوں کا ذکر کرتا ...... اور پھر بھی باانیہمہ سعی و کاوش قاصر رہتا بلکہ کوتاہی بیان کا معترف رہتا اور اکثر متکلمین کا ذکر نہ کر سکنے کے لئے معذرت خواہ ہوتا کیوں کہ جس طرح میرے لئے آسمان کے تاروں کا شمار کرنا ممکن نہیں ہے اسی طرح میں تمام علمار کے ذکر کے استقصار سے بھی قاصر ہوں۔

اس طرح علم کلام کا نیا اور حقیقی دور شروع ہوا۔ امام اشعری نے مذہب اہل السنت والجماعت کی تائید و نصرت میں کم و بیش دو تین سو کتابیں لکھیں جن میں سے تقریباً ایک سو پانچ کتابوں کے نام کی فہرست ابن عساکر نے "تبیین کذب المفتری" میں دی ہے

[1] تبیین کذب المفتری لابن عساکر صہ ۳۳۰

اہل السنت والجماعت میں امام اشعری کے دو معاصر تھے۔ مشرق میں امام ابو منصور الماتریدی (المتوفی ۳۳۳ھ) جو امام الہدیٰ کے نام سے مشہور ہیں وہ امام محمدؒ شاگرد امام ابی حنیفہؒ کے شاگرد امام ابی بکر الجوزجانیؒ کے تلمیذ رشید تھے۔ انھوں نے امام ابی حنیفہؒ کے "فقہ اکبر" کی شرح لکھی۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل کتابیں تصنیف فرمائیں۔

کتاب تاویلات القرآن

کتاب التوحید

کتاب المقالات

کتاب بیان اوہام المعتزلہ

کتاب رد الادلہ للکعبی

دوسرے معاصر مغرب میں امام ابو جعفر طحاوی (۲۲۹-۳۲۱) تھے جو پہلے شافعی المذہب تھے مگر حنفی مسلک کی معقولیت سے متاثر ہو کر حنفی ہو گئے تھے اور اس میں یہ رتبہ بہم پہنچایا کہ مصر میں رئیس الاحناف مشہور ہوئے۔ ابن خلکان نے لکھا ہے:

"انتہت الیہ ریاسۃ اصحاب ابی حنیفۃ"[1]

ان کا شمار مشاہیر محدثین میں ہوتا ہے اور حدیث و فقہ میں اُن کی تصانیف آج بھی مستند سمجھی جاتی ہیں۔ انھوں نے عقائد اسلام کو "بیان السنۃ" کے نام سے قلمبند کیا جو آگے چل کر "عقیدۂ طحاوی" کے نام سے مشہور ہوا۔

ہندوستان میں ان دو بزرگوں کو بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ "عقیدہ طحاوی" درس میں شامل تھی اور علمائے ہند نے اس کی شرح بھی لکھی۔ لیکن اول الذکر یعنی امام ابو منصور الماتریدی کو تو وہ قبول عام نصیب ہوا کہ اُن کا مسلک ہی یہاں کا مسلک مختار قرار پایا۔ چوں کہ ہندوستان میں ابتدا ہی سے حنفی مذہب پر عمل رہا ہے اس لئے یہاں کے علماء خود کو

---

[1] وفیات الاعیان لابن خلکان جلد اول صفحہ ۱۹

ماتریدی کہتے ہیں۔ بایں ہمہ اشاعرہ سے اُن کا استفادہ عملاً جاری رہا اور عموماً اشعری تعلیمات ہی یہاں مروج رہیں۔ اشاعرہ اور ماتریدیہ میں معمولی اور جزئی اختلافات ہیں جو عموماً نظر انداز کردیئے جاتے ہیں۔

امام ابوالحسن الاشعری کے شاگردوں میں ابوالحسن الباہلی اور ابن مجاہد الطائی بہت زیادہ مشہور ہیں۔ ان دونوں کے شاگرد قاضی ابوبکر الباقلانی، ابواسحٰق الاسفرائنی اور اُستاذ ابن فورک تھے، یہ تیسرے طبقے کے اساطین اشاعرہ ہیں ان میں قاضی ابوبکر الباقلانی زیادہ مشہور ہیں۔ ابن خلدون لکھتا ہے۔

وکثر اتباع الشیخ ابی الحسن الاشعری واقتفی طریقتہ من بعدہ تلمیذہ کابن مجاھد وغیرہ واخذ عنھم القاضی ابوبکر الباقلانی فتصدر للامامۃ فی طریقتھم وھذبھا ووضع المقدمات العقلیۃ التی تتوقف علیھا الادلۃ والانظار۔[1]	امام ابوالحسن الاشعری کے پیرو بہت زیادہ تھے اُن کے بعد ان کے شاگرد مثلاً ابن مجاہد وغیرہ اُن کے نقش قدم پر چلے۔ ان لوگوں سے قاضی ابوبکر الباقلانی نے علم حاصل کیا اور ان کے بتلائے ہوئے طریقہ کے مطابق قوم کی رہنمائی کی انھوں نے اس طریقہ کلامیہ کی تہذیب و اصلاح کی اور اُن مقدماتِ عقلیہ کو وضع کیا جس پر اصل دلائل و مباحث کا انحصار ہے۔

قاضی ابوبکر الباقلانی کا اشعری علم کلام کی ترقی میں بہت بڑا حصہ ہے وہ مالکی فقہ کے بہت بڑے عالم تھے اور اشعری علم کلام کی تائید میں متعدد کتابوں کے مصنف۔ امام باقلانی کے بعد ابوالمعالی امام الحرمین کا نام آتا ہے جو امام غزالی کے اُستاد تھے۔ امام الحرمین نے علم کلام میں "کتاب الشامل" لکھی پھر اُسے مختصر کرکے ملخص کا نام "کتاب الارشاد" رکھا جو عرصے تک

[1] تبیین کذب المفتری لابن عساکر ص۲۲

عقائد اہل السنت والجماعت کی درسی کتاب رہی۔

اسی زمانہ میں منطق اور فلسفہ کا رواج عام ہوگیا تھا اس لئے کلام اور فلسفہ میں خلط ملط ہوگیا۔ لہذا ضرورت سمجھی گئی کہ جہاں فلسفہ عقائد ایمانیہ کے خلاف ہے اُس کی تردید کی جائے۔ اس نئے اندازِ فکر کی ابتدا امام غزالی نے کی۔ ابن خلدون لکھتا ہے۔

واول من کتب فی طریقۃ الکلام	سب سے پہلے اس انداز پر علم کلام میں امام غزالی
علی ھذا المنحی الغزالی رحمہ اللہ	نے لکھا۔ امام رازی نے اور دوسرے لوگوں نے اُن
وتبعہ الامام ابن الخطیب وجماعۃ	کی پیروی کی، اُن کے نقشِ قدم پر چلے اور اُن کی تقلید
وقفوا اثرھم واعتمد والقلید ھم[1]	پر اعتماد کیا۔

طریق سنت کے احیاء اور مذہب اہلِ حق کی تائید و نصرت کی بنار پر امام اشعری، قاضی ابو بکر الباقلانی، امام غزالی اور امام رازی تیسری، چوتھی، پانچویں اور چھٹی صدی کے مجددین ملت کہلاتے ہیں۔ امام اشعری کی کلامی خدمات کا تذکرہ اوپر گذرا۔ قاضی ابو بکر الباقلانی کے انتقال پر منادی ان کے جنازے کے آگے کہتا جاتا تھا

"ھذا ناصر السنۃ والدین ھذا امام المسلمین، ھذا الذی کان یذب عن الشریعۃ السنۃ المخالفین ھذا الذی صنف سبعین الف ورقۃ رداً علی الملحدین۔"[2]

(یہ سنت اور دین کے مددگار ہیں، یہ مسلمانوں کے امام ہیں، یہ وہ ہیں جو شریعت کو مخالفین کی زبان درازی سے بچاتے تھے، یہ وہ ہیں جنہوں نے ملاحدہ کے رد میں ستر ہزار اوراق لکھے۔)

امام غزالی کی "تہافۃ الفلاسفہ" نے واقعی فلسفہ والحاد کی بنیادیں کھوکھلی کر دیں اور امام رازی کو تو بجا طور پر سرخیل متکلمین کہا جا سکتا ہے۔ یہاں تک کہ اُن کے مخالفین بھی اُن کی مخالفت میں اس سے زیادہ نہ کہہ سکے کہ

لہ مقدمہ ابن خلدون ص۴۹۵ ۲ہ تبیین کذب المفتری لابن عساکر ص۲۲۲

گر بعقل وِرائے کارِ دیں بدے
فخرِ رازی رازدارِ دیں بُدے

امام رازی کے ایک شاگرد مولانا بدرالدین دمشقی دہلی آئے اور یہیں متوطن ہو گئے۔ وہ غیاث الدین بلبن کے عہد کے مشاہیر علماء میں سے تھے۔

امام غزالی کے متاخر معاصرین میں سے امام نجم الدین ابو حفص عمر بن محمد تھے جنہوں نے ۵۳۷ھ میں وفات پائی وہ ایک جلیل القدر حنفی فقیہ تھے انھوں نے اہل السنت والجماعت کے عقائد کو ایک متن متین کی شکل میں مدوّن کیا جو بعد میں "عقائد نسفی" کے نام سے مشہور ہوا، آٹھویں صدی میں علامہ تفتازانی نے اس کی شرح لکھی اور بے شمار علمائے روم نے اس شرح پر حواشی لکھے۔ "شرح عقائد نسفی" ہندوستان میں بھی بہت زیادہ مقبول ہوئی اور آج تک یہاں کے درس میں داخل ہے

ایک دوسرے حنفی امام علامۃ الکمال بن الہمام الحنفی المتوفی ۸۶۱ھ نے امام غزالی کی الاقتصاد اور قواعد العقائد کی مدد سے "کتاب المسایرہ" تصنیف کی جس پر ان کے ہم نام کمال الدین محمد بن ابی شریف المقدسی المتوفی ۹۰۵ھ نے "المسامرہ" کے نام سے شرح لکھی۔

علم کلام کا چوتھا دور | امام رازی کی وفات کے بعد تاتاریوں کا سیلاب اُمنڈ آیا جس نے ۶۵۶ھ میں آخری عباسی خلیفہ مستعصم باللہ کو قتل کر کے عباسی خلافت کی اینٹ سے اینٹ بجادی فتنۂ تاتار نے اسلامی ثقافت کو بھی ناقابلِ تلافی صدمہ پہنچایا۔ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ فلسفہ کی تعلیم پر جو پابندیاں تھیں اُن کی گرفت ڈھیلی ہو گئی۔ مدارس میں اہل علم نے فلسفہ اور کلام کو ساتھ ساتھ پڑھانا شروع کیا اور کچھ عرصے میں دونوں کا موضوع تقریباً ایک ہی ہو گیا۔ لہذا کچھ ہی دنوں میں علم کلام اور فلسفہ میں خلط ملط ہو گیا اور علم کلام کا ایک نیا طریقہ جاری ہوا۔ ابن خلدون لکھتا ہے:

"ثم توغل المتاخرون من بعدھم فی مغالطۃ کتب الفلسفۃ

پھر اس کے متاخرین نے کتب فلسفہ کی مخالطت میں بہت زیادہ مبالغہ کیا اور دونوں فنون کے

والتبس علیھم شأن الموضوع	موضوع کی حیثیت کے فرق کو فراموش کر دیا
فی العلمین فحسبوہ فیھما واحداً	اور مسائل کی مشابہت کی وجہ سے دونوں کا
من اشتباہ المسائل فیھما	موضوع ایک ہی سمجھا .... اور متاخرین
... ولقد اختلطت الطریقتان	کے نزدیک دونوں طریقے خلط ملط ہو گئے اور
عند ھؤلاء المتاخرین والتبست	مسائل کلامیہ مسائل فلسفیہ کے ساتھ مل گئے
مسائل الکلام بمسائل الفلسفہ	بدیں طور کہ ایک فن دوسرے سے ممتاز نہ رہا اور
بحیث لا یتمیز احد الفنین من	نہ طالب فن اُن کی کتابوں سے اسے حاصل کر سکتا
الاخر ولا یحصل علیہ طالبہ	ہے۔ جیسا کہ امام ناصرالدین بیضاوی نے طوالع
من کتبھم کما فعلہ البیضاوی	الانوار میں کیا ہے اور ان کے بعد دوسرے عجمی علماء
فی الطوالع ومن جاء بعدہ	نے اپنی تالیفات میں کیا ہے۔
من علماء العجم فی جمیع تالیفھم[1]"	

اس نئے اندازِ فکر کی بنا ابن خلدون کی رائے میں قاضی ناصرالدین البیضاوی (المتوفی ۶۸۵ھ) نے "طوالع الانوار" میں ڈالی لیکن غالباً اس کا بانی محقق طوسی (المتوفی ۶۷۲ھ) ہے جو مشہور شیعی متکلم اور فلسفہ کا عالم متبحر ہے۔ محقق طوسی کی "تجرید العقائد" نے چوتھے دور کے کلامی ادب کی پیداوار میں خصوصی حصہ لیا ہے۔ اس پر متعدد شروح و حواشی لکھے گئے لیکن تین شرحیں زیادہ مشہور ہیں۔

(۱) شرح تجرید للشیخ جمال الدین حسن بن مطہر الحلی (المتوفی ۷۲۶ھ) جو آج بھی ہمارے یہاں شیعی مدارس کے نصاب میں داخل ہے۔

(۲) شرح تجرید لشمس الدین محمود بن عبدالرحمٰن الاصفہانی (المتوفی ۷۴۶ھ) جو شرح قدیم کے نام سے مشہور ہے، اور

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۳۸۹

(۳) شرح تجرید لمولانا علاء الدین علی القوشجی (المتوفی ۸۷۹ھ) جو شرح جدید کے نام سے موسوم ہے۔

شرح قدیم پر میر سید شریف الجرجانی (المتوفی ۸۱۶ھ) نے حاشیہ لکھا جو حاشیہ تجرید کے نام سے مشہور ہوا۔ روم کے مدارس میں اُس کے درس کا عام رواج تھا اکثر علمائے روم نے اس پر حواشی لکھے۔ شرح جدید (للقوشجی) کے حاشیوں میں محقق دوانی (المتوفی ۹۰۸ھ) اور میر صدر الدین الشیرازی (المتوفی ۹۰۳ھ) کے حواشی خاص طور سے قابل ذکر ہیں اور ان میں سے بھی محقق دوانی کے پہلے دو حاشیے یعنی حاشیہ قدیمہ اور حاشیہ جدیدہ ہندوستان میں زیادہ مشہور ہوئے۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ آٹھویں صدی کے نصف اول میں قاضی عضد الدین الایجی نے جن کے متعلق خواجہ حافظ کہتے ہیں ؎

دگر شہنشۂ دانش عضد کہ در تصنیف
بنائے کار مواقف بنام شاہ نہاد

علم کلام میں دو کتابیں لکھیں جنہیں ہندوستان میں بھی قبولِ عام کا شرف حاصل ہوا۔

(۱) مواقف: جس پر میر سید شریف الجرجانی نے شرح لکھی۔ شرح مواقف پر متعدد علماءٔ نے جن میں ہندوستان کے مشاہیر فضلاء بھی شامل ہیں حواشی تحریر کیے۔

(۲) عقائد عضدی: اس پر بہت سے علماء نے شروح لکھیں مگر مقبولیت صرف محقق دوانی کی شرح کو حاصل ہوئی۔ یہ شرح ہندوستان کے عربی مدارس میں زیر درس رہی ہے اور اکثر علمائے ہند نے اس پر حواشی لکھے ہیں۔

آٹھویں صدی کے نصف دوم میں علامہ سعد الدین تفتازانی نے علم و ادب کی خدمت کی؛ علم کلام میں اُن کی دو کتابیں مشہور ہیں۔

(۱) مقاصد اور اُس کی شرح "شرح المقاصد" اور

(۲) شرح عقائد نسفی

سب سے زیادہ مقبولیت "شرح عقائد نسفی" کے حصے میں آئی۔ روم و ہندوستان کے اکثر علماء

نے اس پر حواشی تحریر کئے جن میں خیالی کا حاشیہ زیادہ مشہور ہے شرح عقائد نسفی آج بھی ہمارے یہاں مدارس عربیہ کے نصاب میں داخل ہے۔

نویں صدی نے عجم کے آخری محقق کو پیدا کیا۔ یہ محقق جلال الدین الدوانی ہیں۔ جس کلامی فلسفہ یا فلسفیانہ علم کلام کی بُنیاد محقق طوسی نے ڈالی تھی، محقق دوانی پر اُس کا خاتمہ ہوگیا محقق دوانی کی تصانیف مثلاً حواشی قدیمہ وجدیدہ اور شرح عقائد عضدی ہمارے یہاں عرصے تک داخل درس رہیں۔ اس سے قطع نظر ہندوستان کے اکثر مدارس محقق دوانی کے سلسلۂ تلمذ میں منسلک ہیں اور اکثر علمار نامدار کا سلسلۂ تلمذ محقق تک پہنچتا ہے اُس کی تفصیل آگے آئے گی۔

محقق دوانی پر یہ اجمالی خاکہ ختم ہوجاتا ہے۔ جس سال محقق نے وفات پائی (۹۰۸ھ) اُسی سال ایران میں صفوی سلطنت کی بُنیاد پڑی جو ایک نئے معاشرتی انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ ایران میں اس کے بعد بھی مفکرین و حکمار پیدا ہوتے رہے اور ہندوستان کے علماء و فضلاء اُن سے متاثر بھی ہوئے جیسے میر باقر داماد، صدر الدین شیرازی (شارح ہدایۃ الحکمت) ملا ہادی سبزواری وغیرہم۔ مگر یہ متکلم نہیں تھے، فلسفی تھے۔

ہند پر فارسی زبان وادب کے اثرات

از

(جناب مولانا محمد حفظ الرحمن صاحب ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند رفیق ندوۃ المصنفین)

زبان اور تہذیب کا باہمی ربط اتنا گہرا اور قریب ہوتا ہے کہ ایک حد تک یہ دونوں ایک دوسرے کے وجود، ارتقار، اور نشو ونما میں فطری طور پر معاون ہوتے ہیں، زبان تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے اس کی جڑیں بھی تہذیب کی جڑوں کی طرح روحانی ادراک اور باطنی حقیقتوں میں پیوست ہوتی ہیں۔ اس کا تعلق جہاں ایک طرف زندگی کی بے چین اور مضطرب کشمکش سے ہوتا ہے اسی طرح انسانی جذبات واحساسات روحانی بصیرت اور عرفانی محسوسات سے بھی ہوتا ہے، یہ ہمارے تخلیقی شعور کو اُجاگر کرتی ہے اور تہذیبِ انسانی کی رہنمائی کے لئے فکر ونظر کے چراغ روشن کرتی ہے۔ زبان کا قانون مذہب اور حکومت کے قانون سے سخت ہوتا ہے اور مختلف زبانوں کے اختلاط کے بعد نئی زبانوں کے وجود میں لانے کا کام قدرت آہستہ آہستہ کرتی ہے اور وقت اسے ایسی ضرورت بنا کر لا کھڑا کرتا ہے کہ اس سے دامن بچائے نہیں بچ سکتا۔ کون ہے جو بن بولے رہ سکتا ہے۔ زبان پر تالا نہیں ڈالا جا سکتا۔ چپ سادھ کر بیٹھنے کا برت رکھنا بڑے سے بڑے ستیہ گرہی کے بھی بس کا کام نہیں۔ اور وقت کی بے رحم چنگاریاں ایسے ذہنی شیش محلوں کو چکنا چور کر دیتی ہیں۔

تہذیب کوئی الہامی عطیہ نہیں، کوئی دیوتائی چیز نہیں یا جنت کی حور نہیں بلکہ وہ زمین پر بسنے والے انسانوں کی روح اور ضمیر کی عرفانی روشنی کا مادّی ظہور ہوتی ہے اس کی تخلیق میں فطرت کا مضبوط ہاتھ چپکے چپکے تعاون کرتا ہے اور اس کے ارتقا میں مصور، رقاص، شاعر، ادیب، اداکار، کسان، امیر وغریب سب ہی حصہ لیتے ہیں اس کی جلوہ گری محبوب کی نشیلی آنکھوں، معصوموں کی شوخ مسکراہٹوں، جوان کامیاب ارادوں اور ناکام حوصلوں

لے یہ مقالہ انڈین کونسل کلچرل ریلیشنز کے ایک خاص اجتماع میں پڑھا گیا تھا۔

فضا میں اُڑتے ہوئے پرچموں۔ کھیتوں میں لہلہاتی ہوئی بالیوں، گردش کرتی مشینوں، زمین کا سینہ چیرتے ہوئے ہلوں، شبستانوں میں مچلتے ہوئے نغموں، مجلسوں میں اٹکھیلیاں کرتے ہوئے قہقہوں، اور شفق کے بکھرے ہوئے گہنوں سے لے کر پگھلے ہوئے لوہے کی سلاخوں تک میں پائی جاتی ہے۔

میرا مقصد اس تمہید سے یہ ہے کہ زبان کا تہذیبی ارتقا میں زبردست ہاتھ ہوتا ہے وہ کبھی جذبات کا اظہار بن کر شاعر کے گیتوں میں ڈھلتی ہے جو عوامی شعور اور تہذیبی خدوخال کو نکھارتے ہیں۔ وہ کبھی نصاب بن کر قوموں کے ذہن کی تخلیق کرتی ہے تو کبھی مختلف قوموں کے مابین تہذیبی رشتہ کی کڑیوں کو اتنا مضبوط بنا دیتی ہے کہ عظیم تاریخی جھٹکے اور انقلابی زلزلے بھی ان تہذیبی زنجیروں کو توڑ نہیں پاتے۔ یہ میں کوئی نئی بات نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ دنیا کی کلچرل تاریخ میرے اس بیان کی شہادت دے رہی ہے کہ زبان نے قوموں کو متحد کرنے میں کتنی موثر اور جاوداں کوششیں کی ہیں اور زبان کے ذریعہ جو اتحاد عمل میں آیا ہے اس کے نقوش اتنے روشن ہیں کہ موجودہ سیاسی معاہدات تک ان کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے اس لئے فارسی زبان بھی اس فطری انقلاب سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

اس بحث کے دو رخ ہیں ایک یہ کہ فارسی نے ہند پر کیا اثرات ڈالے اور دوسرے یہ کہ ہند میں پہنچ کر فارسی پر کیا اثرات پڑے، دونوں کی ایک طویل تاریخ ہے چاہیں تو آپ دونوں کو خلط ملط بھی کر سکتے ہیں کیوں کہ ہزاروں سال کے تعلق کا یہ تاریخی ربط ہے، جس میں تسلسل بھی ہے اور ارتقا بھی، اس میں لسانی صداقتیں بھی ہیں اور زمانہ کے تقاضے بھی، ان میں خونی رشتہ بھی ہے اور حکمرانی و محکومی کی داستان بھی۔ اور اس تعلق اور ربط کی بنیادیں اتنی گہری ہیں کہ آج بھی ہند کی قومی تہذیب کے نمایاں عناصر ایرانی تہذیب کا عکس جمیل کہے جا سکتے ہیں۔ ہڑپا اور موہنجوداڑو جیسے قدیم شہروں کے مدھم نقوش آج بھی علمی تحقیق کے لئے ایک وسیع میدان رکھتے ہیں، ویران علاقوں کی خاموشیاں اور شکستہ پتھروں کے مدفن ہند و ایران کے ثقافتی اور کلچرل اتحاد کی مربوط کڑیوں

کے گواہ ہیں، فتح پور سیکری کے منقش در و دیوار آج بھی آرٹ کے میدان میں ان کے باہمی تمدنی مشترکہ روایات کی کہانی دہرا رہے ہیں، سعدی کی حکایتیں آج بھی ہماری اخلاقی رہنمائی کرتی ہوئی نظر آتی ہیں، ہمارا گلکدۂ سخن آج بھی خیابانِ حافظ کے خوش رنگ پھولوں سے مشکبار ہے۔ ہماری بزمِ تصوف میں آج بھی جامی، عطار اور نظامی و مولوی کے نغموں کی گونج ہے، فارسی ادب کے کردار آج بھی ہمارے ادبی میدان میں ہندوستانی آداب و اطوار کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں، شیریں فرہاد کی دل کی دھڑکنیں آج تک ہندوستانی وارداتِ حسن پر چھائی ہوئی ہیں اور قصرِ شیریں کے بے زبان محراب و طاق ہمارے یہاں بولتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کوہ کنی اگر ایران میں رسوم کی قیود میں جکڑ دی گئی ہو تو ہو ہمارے یہاں یہ عزم و عمل اور جد و جہد کی راہوں کو دار و رسن سے ملا دیتی ہے جو ہماری قومی زندگی میں ایک تحریک کا مرتبہ رکھتی ہے اور رستم و سہراب ہمارے ادب اور زندگی میں اسی شاہنامائی وقار اور عظمت کے ساتھ رچے ہوئے ہیں۔ اس لئے میں بجا طور پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ ایران و ہند ادبی طور پر دو ملک نظر نہیں آتے۔ میں تو یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ ہند کی فضاؤں میں ایران نظر آتا ہے اور ایران کی فضاؤں میں ہند ....

ہند و ایران پڑوسی ملک ہیں اور جغرافیائی محلِ وقوع کے اعتبار سے ان میں آمد و رفت کی آسانی رہی ہے اس لئے ان کا تعلق انسانی یادداشت سے قبل سے ہے۔

یہ ایک تاریخی صداقت ہے کہ عربوں کے علاوہ جتنی بھی قومیں اور حملہ آور آئے وہ یا تو ایران میں ہو کر آئے یا ایران کے قریبی سرحدوں سے ہو کر آئے، اس کا واضح نتیجہ یہ ہے کہ وہ یا تو فارسی بولتے ہوئے آئے یا ایسی زبان جس پر فارسی زبان اور محاوروں کی گہری چھاپ تھی۔ وسط ایشیا میں بھی خود ایرانی تمدن کا وسیع حلقہ تھا۔ آریوں کے اس قافلہ کی تاریخی اور لسانی شہادت موجود ہے کہ ان کے چند قافلے ایران ہو کر آئے، اتھروید کے متعلق تو یہ کہا جاتا ہے کہ اس کے الفاظ کا تعلق ہند کی بہ نسبت ایران سے زیادہ ہے۔ "اسُورا"، "سوما" اور "دیو" اس کی زندہ مثال ہیں۔

قریبی ربط کی ایک مثال پروفیسر براؤن کے قول سے ملتی ہے کہ ایک بار ایرانی اور ہندی مشترک

قوم کی حیثیت سے پنجاب کے علاقوں میں آباد ہو گئے تھے اور ایک شہادت ہے کہ پنجاب کے جاٹ جن کو عرب مورخوں نے "زط" کہا ہے وہ ایرانی فوج میں شامل ہو کر عربوں سے لڑے بعض ایرانی مورخوں نے تو ساسانیوں کے عہد تک مغربی پنجاب، سندھ، اور بلوچستان کے علاقوں پر اپنا حق سمجھا ہے

ایک اور مورخ ہند و ایران کے تعلقات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتا ہے۔ مورین حکومت کے زمانہ میں ایران کا ہندوستان پر گہرا اثر پڑا چنانچہ رسوم و رواج اور دیگر اوضاع زندگی میں زبردست مماثلت نظر آتی ہے

ابن حوقل اور اصطخری کا بیان ہے

"گیارہویں صدی عیسوی میں اصفاریوں نے جب سندھ کو فتح کیا تو سب سے پہلے اُن کو ایک فارسی بولنے والی قوم سے واسطہ پڑا یہ مکرانی تھے جو فارسی اور مکرانی بولتے تھے۔ چنانچہ رابعہ بنت کعب قزداری بلوچستان کے علاقہ کی ایک مشہور عورت ہے جو گیارہویں صدی عیسوی میں فارسی میں شعر و سخن کا ذوق رکھتی نظر آتی ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ سندھ میں فارسی زبان کا ہندو مسلمان دونوں پر کافی اثر تھا اور فارسی زبان کا بلوچستان کے علاقہ میں اچھا خاصا رواج تھا۔

یہ ساسانی عہد کے آخری بادشاہ کا دور تھا اس کے بعد افراسیاب کے حکم سے خراسان کے ہزاروں ایرانی خاندانوں کو جلا وطن کر دیا گیا اور وہ بھاگ کر پنجاب میں ملتان اور لاہور کے اردگرد آباد ہو گئے اور کچھ خاندان دہلی تک پہنچ گئے "منتخب التواریخ" میں لکھا ہے کہ ان ایرانیوں نے کئی مشہور شہر آباد کئے جو ہندی ایرانی متحدہ تمدن کا گہوارہ تھے۔ شاید بمبئی اور گجرات کے علاقوں میں موجودہ پارسی نسل بھی اسی عہد میں ہند میں آئی ہو۔

یہی بات زبانوں کے متعلق کہی جا سکتی ہے۔ میری رائے میں ان میں تعلق بالکل ان بہنوں کا سا ہے جو مختلف خاندانوں میں بیاہی گئی ہوں سنسکرت اور فارسی کا تعلق ایک ہی خاندان سے ہے ایک وقت تھا جب یہ دونوں زبانیں یکساں ہیئت رکھتی تھیں اور ان کے

مشترک رجحانات تھے جب ہند آریوں کی سنسکرت کے لہجہ اور آواز سے روشناس ہو رہا تھا تو حقیقتاً وہ فارسی زبان کی موسیقی کی صدائے باز گشت تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ قدیم ہندو ایران کے درمیان حیرت انگیز اشتراک اور مماثلت پائی جاتی ہے ویدا اور اوبیستا کا مطالعہ کرنے سے بھی یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ سنسکرت اور فارسی کا گہرا تعلق رہا ہے بہت سے الفاظ کے لہجے اور آوازیں یکساں ہیں اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ان دونوں زبانوں کا تعلق ماہرینِ السنہ کے ارشادات کے مطابق ایک ہی خاندان سے ہے۔

یہی وہ قدیم مماثلت تھی جو آہستہ آہستہ تاریخ کے مختلف دوروں میں ایران سے چل کر ہندوستان کو فارسی زبان سے روشناس کراتی رہی۔ غزنوی عہد سے لے کر اکبر کے عہد کے درمیان تک جو چھ سو سال کا عرصہ ہے اس میں فارسی نے یہاں مضبوط قدم جما لئے تھے چنانچہ اس دور کے ہندی ادب میں فارسی الفاظ اور محاورات کی کافی آمیزش پائی جاتی ہے اور ہندی موسیقی میں ریختہ، خیال، ترنگولہ جیسی اصطلاحات فارسی ہی کی دین ہیں۔

مسعود ابن محمود کے عہد میں تلک ابن جے سین اور بجے رائے جو ہندی النسل ہیں مسعود کے منصب دار اور سالار تھے اور فارسی زبان پر پوری قدرت رکھتے تھے۔

فرشتہ کا بیان ہے کہ مسلمانوں کی طرح ہندوؤں نے بھی سب سے پہلے فارسی کی جانب اسی کے عہد میں توجہ کی۔

بدایونی لکھتا ہے کہ برہمن نام ایک ہندو تھا جو اسی عہد میں فارسی اور عربی کا درس دیا کرتا تھا اور فارسی زبان میں شعر بھی کہتا تھا اس کا ایک مشہور شعر یہ ہے ؎

دل خوں نہ شدے چشمِ تو خنجر نہ شدے گر　　راہ گم نہ شدے زلفِ تو ابتر نہ شدے گر

سکندر لودھی کے عہد میں تعلیم یافتہ ہندوؤں نے فارسی سیکھنی شروع کی اور سوریوں کے عہد میں تو بہت سے ہندو فارسی جانتے تھے مگر حسابات وغیرہ مقامی زبانوں میں رکھے جاتے تھے

کشمیر میں سلطان زین العابدین نے ہندوؤں کو نظمِ مملکت میں برابر کا شریک بنایا۔ اس طرح کشمیری پنڈتوں میں فارسی کا رواج ہوا۔ اور کچھ عرصہ بعد یہ ان کی تقریباً مادری زبان ہی بن گئی۔ پنڈت کاچرُ نے مجموعۃ التواریخ میں لکھا ہے کہ زین العابدین نے کشمیر میں ایک ہندو فقیر کی کرامت سے متاثر ہو کر ہندوؤں کے ساتھ تمدنی رشتہ مضبوط کرنے کے لئے یہ ترکیب نکالی کہ ہندوؤں کو فارسی سے روشناس کرایا۔

مہاتمیٔ کشمیرہ منڈل کا بیان ہے کہ سپرو پنڈتوں نے سب سے پہلے فارسی سیکھنے کے لئے قدم بڑھایا۔ چنانچہ (سپ ـ پرو) دو لفظوں کا مرکب ہے جس کے معنی ہیں "سبق پڑھا"۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر میں اکثر ذاتوں کے نام فارسی نظر آتے ہیں جیسے توطہ دار، رازداں، کارکن اور منشی وغیرہ بٹ قوم میں یودی بٹ کے نام سے فرشتہ ایک شخص کا ذکر کرتا ہے جو شاہ نامہ کا حافظ تھا اور اسے نہایت خوش الحانی کے ساتھ پڑھتا تھا۔

کلکتہ ریویو میں بلوخ من لکھتا ہے کہ فارسی زبان سولھویں صدی عیسوی تک ہندوؤں کے اعلیٰ طبقات میں پوری طرح پھیل گئی تھی اور عوامی بول چال اور ادبی زبان پر بھی اس کا گہرا اثر ہو چلا تھا۔

گورونانک لودھیوں کے آخری زمانہ کے بزرگ ہیں آدی گرنتھ جلد اول جو بابا گرونانک کی تصنیف ہے اس میں اسی فارسی کی آمیزش ہے اور گرنتھ صاحب میں ہمیں کچھ اشعار فارسی کے بھی ملتے ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار میں فارسی کی گہری چھاپ نظر آئے گی ؎

صدق کر سجدہ من کر مقصود   جیدھر دیکھا تیدھر موجود

پیر پیکا میر سالک صادق شہدے اور شہید   شیخ مشائخ قاضی ملا اور درویش شہید

گرنتھ صاحب کے یہ اشعار ظاہر کرتے ہیں کہ بابا گرونانک کے زمانہ میں عوام کی زبان میں فارسی الفاظ کی زبردست آمیزش ہو چکی تھی۔ یہی بات ڈاکٹر تاراچند نے اپنی کتاب "ہندوستانی کلچر پر اسلامی اثرات" میں کہی ہے پھر کبیر اور دوسرے ہندی شعرا کا کلام بھی اس کی تائید کرتا ہے ایسا معلوم

ہوتا ہے کہ سکندر لودھی کے بعد ہندوستان میں فارسی زبان کی تعلیم کا سلسلہ اکبر کے زمانہ تک مسلسل جاری رہا چنانچہ جب اکبر کے عہد میں راجہ ٹوڈرمل نے فارسی کو دفتری زبان قرار دیا تو اس تبدیلی سے ملک میں کوئی اضطراب پیدا نہیں ہوا۔ ٹوڈرمل خود فارسی داں تھا اور اکبر سے پہلے شیر شاہ کا ملازم رہ چکا تھا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ سوریوں کے زمانہ میں بھی فارسی کی تعلیم رائج تھی۔

دکن میں یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ لودھی خاندان کی فتح کے ساتھ ہی فارسی نے مرہٹی زبان پر اپنے اثرات ڈالنے شروع کر دیئے مرہٹی زبان میں فارسی کے سینکڑوں الفاظ اور محاورے شامل ہو گئے اگر پیشواؤں کے عہد کی زبان دیکھی جائے تو اس میں فقرے کے فقرے اور جملے کے جملے بالکل اسی طرح ملیں گے جیسے ایک انگریزی تعلیم یافتہ ہندی کی گفتگو میں انگریزی الفاظ بولتا نظر آتا ہے۔

مرہٹہ سرداروں کے خطوط، امرا کے مراسلے، عہدیداروں کے احکام فارسی الفاظ سے بھرے ہوئے ہیں یہاں میں مثال کے طور پر ناگاؤں ضلع قلابہ (جنوب بمبئی) کے مندر بھیمشور کے ایک کتبہ کا حوالہ دینا چاہتا ہوں اس کا سنہ پہلی ہی سطر میں درج ہے اور قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ اول سن ہجری دیا ہوا ہے اور اس کے بعد سالباہن کا سن شکے ہے دوسری اہم بات جو اس کتبہ میں ہے یہ ہے کہ اس میں ایک دو فارسی الفاظ بھی استعمال کئے گئے ہیں ایک لفظ توجعیۃ کا ہے جو دوبار آیا ہے دوسرا لفظ سازکار ہے، تیسری سب سے اہم اور حیرت انگیز بات جس کی جانب میں آپ کی خصوصی توجہ دلاؤں گا یہ ہے کہ یہ کتبہ دولت آباد کے جادھو خاندان کے خود مختار راجہ کے عہد کا ہے جب کہ مسلمانوں کی حکومت کا کوئی خاص سیاسی اثر و اقتدار وہاں نہیں پہنچا تھا۔

میں شیواجی کے ایک خط کی جانب بھی اشارہ کروں گا جو ۲۶ جولائی ۱۶۷۶ء کو تحریر ہوا ہے ایک سردار اشونت رائے کو لکھا گیا ہے اس میں فارسی کے یہ الفاظ موجود ہیں۔ مذکور، حشم، جنس جمع، وضع، کاغذ، باب، موافق، مجرا وغیرہ صفحہ ۳۸ (فارسی کا مرہٹی زبان پر اثر) نیز اس خط کا اسلوب فارسی انداز کا ہے اور ادبی طور پر یہ نگارش مرہٹی زبان میں فارسی طرزِ تحریر کا اچھا نمونہ کہی

جا سکتی ہے۔

مرہٹہ حکمرانوں نے جن خطابات سے اپنے سرداروں کو نوازا ان میں چند یہ ہیں راجہ رام شیواجی کے فرزند نے اپنے برہمن وزیر رام چندر کو "حکومت پناہ" ایک دوسرے سردار اداجی چوہان کو "ہمت بہادر" اور "مملکت مدار" سنتاجی گھورپڑے کو "ضبط الملک" شیواجی تحبیہ سالا مو ہیتے کو سرلشکر اور اپنے وزیر کو پیشوا کا خطاب دیا۔

ذرا اور جنوب کی طرف چلئے۔ ابن بطوطہ دکن کے حالات میں محمد تغلق کے زمانہ کا ایک واقعہ نقل کرتا ہے۔ ایک ہندو عورت جو ستی ہونا چاہتی تھی اور کچھ لوگ اس کو روک رہے تھے تو اس نے جھنجھلا کر کہا مارا می ترسانی از آتش۔ مامی دانیم او آتش است، رہا کن مارا۔

مشرقی ہند میں فارسی زبان نے اپنے اثرات ڈالنے شروع کر دئے تھے بنگال میں خلجیوں کی دفتری زبان فارسی تھی۔ بختیار خلجی جس کا دارالحکومت لکھنوتی تھا وہاں فارسی قدریں ارتقاء پذیر ہو رہی تھیں۔

مغلیہ دور تک جو تصانیف ہند میں ہوئیں ان کا ادبی معیار اور علمی مرتبہ کسی طور پر بھی ایرانی تصانیف سے کم نہیں تھا۔ اس دور میں صرف ایرانی انداز نگارش کی ہی تقلید نہیں کی گئی بلکہ اس میں بلندی اور دلکشی پیدا کی گئی۔ اس دور میں برنی، البیرونی، مسعودی، سعدی، سلمان، خسرو، خواجہ معین الدین چشتی، بابا فرید الدین شکر گنج، خواجہ نظام الدین۔ کی تصانیف ہوئیں جو اخلاقی اور ادبی طور پر بہت اہم ہیں۔

مختصر یہ کہ مغلیہ دور تک فارسی کا اثر و رسوخ۔ شمالی ہند، کشمیر، مالوہ، گجرات، مہاراشٹر گولکنڈہ، بیجاپور، برار، حیدر آباد، گلبرگہ اور بنگال تک پھیلا ہوا تھا اور مغلیہ دور میں ہند ایران تعلقات قدیم سلسلہ کی ارتقائی کڑی کی ہی حیثیت رکھتے ہیں۔

مغل نسلی طور پر ترک تھے لیکن وہ ایرانی تہذیب میں رنگے ہوئے ہندوستان آئے۔ اس طرح ہند و ایران کے تہذیبی روابط کا ایک عظیم الشان عہد شروع ہوا۔ بابر جس نے اپنی تزک ترکی

میں لکھی فارسی زبان پر بھی عبور رکھتا تھا اور شعر وسخن کی مشق کرتا تھا اس نے ازبکوں کے مقابلہ پر شاہ اسمٰعیل کی حمایت حاصل کرنے کے لئے ایرانی ساخت کا تاج پہنا اور بارہ اماموں کے نام اس پر کندہ کرائے۔ ہمایوں نے بھی ہند سے بھاگ کر شاہ طہماسپ کے دربار میں پناہ لی۔ اور ان کی امداد سے قندھار فتح کرنے میں کامیاب ہوگیا اور آخر صفوی دربار سے باقاعدہ سفارتی تعلق قائم ہوگیا اور مغل دربار اور ایرانی دربار براہِ راست ایک دوسرے کے قریب آگئے۔

مغلیہ عہد میں اکبر کا دربار فارسی تہذیب کا گہوارہ بن گیا۔ اکبر کے ہاتھوں ایرانی ہندی قومی تہذیب کی مشترک بنیاد پڑی اور یہ عمل مغلوں کے پورے دور میں جاری رہا مسلمان صوفیوں اور ہندو بھگتوں نے مختلف فرقوں کے جمالیاتی شعور میں محبت کے جذبات کو ابھارا۔ ایرانی اور ہندو تہذیب کے امتزاج کے عمل کو جو تاریخی قوتوں کے ماتحت غیر محسوس طور پر ایک مدت سے جاری تھا اکبر کی شعوری کوششوں نے اسے اور تیز کر دیا۔ چنانچہ بہت جلد مغل دربار سے ایک مشترک تہذیب کا دائرہ پھیلنا شروع ہوا۔

راجہ ٹوڈر مل نے سارے ممالکِ محروسہ کے دفاتر میں یکسانیت پیدا کرنے کے لئے فارسی کو دفتری زبان قرار دیا جس کے نتیجہ میں فارسی زبان ملک کی اپنی زبان بن گئی اور تمام مکاتب و مدارس میں باقاعدہ نصابِ تعلیم مرتب ہوکر عوام وخواص سب ہی پر فارسی ادب نے اپنا اثر قائم کرلیا۔ اس کے علاوہ امرا اور راجپوت رئیس جو سیر وشکار، میدانِ جنگ اور نجی صحبتوں میں بادشاہ کے ساتھ رہتے تھے فارسی کے ماہر و کامل نظر آتے ہیں۔

اکبر نے ہندوستان کی تاریخ میں پہلی بار سرکاری مدارس بڑی تعداد میں قائم کئے اور ان میں فارسی کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا یہ ملک گیر سرکاری مدارس ہندو مسلمان بچوں کے لئے مشترک تھے۔

بہر حال اس طرح رفتہ رفتہ سارے تعلیم یافتہ طبقے کی زبان علمی وادبی طور پر فارسی بن گئی۔ چنانچہ مدارس میں دینی نصاب کے علاوہ ہندو مسلمانوں کے لئے ایک مشترک نصاب تھا بقول ابو الفضل ان میں فارسی ادب وانشا، خوش خطی، حساب، علم ہندسہ، نجوم، رمل، سیاست مدن، منطق،

طب و تاریخ کی تعلیم دی جاتی تھی اور ظاہر ہے کہ ان علوم و فنون کا ذریعۂ تعلیم فارسی ہی تھا۔

مغل بادشاہوں کی علم دوستی اور ہمت افزائی سے تصنیف و تالیف اور ترجموں کا کام بڑے زور شور سے ہونے لگا جس میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک تھے۔ رامائن اور اتھروید کے فارسی تراجم میں ایک فاضل ہندو پنڈت ملا عبد القادر کے ساتھ تھا۔ مہابھارت کا ترجمہ بھی بدایونی نے کیا، بھگوت پران اور دوسری سنسکرت کتابوں کے ترجمے راجہ ٹوڈرمل سے منسوب کئے جاتے ہیں۔ فیضی نے لیلاوتی کو فارسی کا جامہ پہنایا۔ مگر حساب اور دیگر فنون کا ترجمہ سنسکرت سے فارسی میں ہندوؤں نے ہی کیا۔ دارا شکوہ نے جو ہندو فلسفے اور تصوف کا دلدادہ تھا اپنشدوں بھگوت گیتا اور یوگ وشسٹ کا ترجمہ کرایا اور خود مجمع البحرین کے نام سے ہندو اور اسلامی تصوف کے تقابلی مطالعہ پر کتاب لکھی۔

مسلمان مورخین کے ساتھ ساتھ بندرا بن داس کی لب التواریخ، چندر بھان برہمن کی چہار چمن، بھیم سین کی تاریخ دل کشا، اور ایشر داس کی تاریخ عالمگیری بھی اس دور کی اہم تصانیف ہیں

فارسی ادب اور شاعری میں بھی ہندوستان بالخصوص ہندوؤں کا حصہ کچھ کم نہیں ہے مرزا منوہر، سالم کشمیری، بنوالی داس کا شمار معیاری سخن گویوں میں ہوتا تھا۔ ہندو شاعروں نے فارسی زبان اور ایرانی شاعری کی روح کو اس حد تک اپنا لیا تھا کہ غیریت اور اجنبیت محسوس تک نہیں ہوتی۔ فارسی انشا کے میدان میں منشی ہرکرن، چندر بھان برہمن، منشی مادھو رام اور منشی لال چند کا مرتبہ بہت بلند ہے۔

اس دور میں ایران سے نظیری، عرفی، ظہوری اور کوثری مشہور قصیدہ گو شاعر ہند آئے، فیضی، ابو الفضل اور بدایونی کے اسلوب ادبی اور فنی طور پر ایرانی ہیں۔

فن تعمیر میں بھی میر سید علی طبریزی، خواجہ عبد الصمد اور رضا عباسی جو صفوی دربار میں اپنی شہرت کا سکہ جما چکے تھے اپنے ساتھ ایرانی فن کی روایات لے کر ہند آئے۔

مختصر یہ کہ اس دور میں تصوف، تاریخ، ادب، فنونِ لطیفہ اور مختلف فنون و علوم میں ہندو مسلمان فارسی مصنفین اور مترجمین اتنی کثرت سے نظر آتے ہیں جتنا کہ کسی ملک میں اپنی ملکی اور وطنی زبان کے مترجمین اور مصنفین ہو سکتے ہیں۔

فارسی زبان کے دیرپا اثرات لکھنؤ تمدن پر پڑے اور وہاں دہلی کے مغل بادشاہ کے دربار کے امراء ہجرت کر گئے، دلّی جو عالم میں منتخب شہر کی حیثیت رکھتا تھا کئی بار قتل و غارتگری کا شکار بنا اور یہاں کی مجلسی صحبتوں کو درہم برہم کر دیا۔ مغلیہ دور کے انحطاط کے ایام میں لکھنؤ تہذیب و فن کا مرکز بن گیا۔ اہلِ فن ہنرمند، اور عالم لکھنؤ اور فیض آباد کے درباروں میں چلے گئے اور جو فنکار، امراء، اور ہنرمند لکھنؤ پہنچے وہ دہلی کی تہذیب کے نمائندہ تھے اور یہ تہذیب ایرانی زیادہ اور ہندی کم تھی اس لئے لکھنؤ پہنچ کر ان کی بدولت لکھنؤ ایرانی تہذیب کا ہند میں عظیم الشان مرکز بن گیا۔ لکھنؤ پر ایرانی تہذیب کی اتنی گہری چھاپ ہے کہ وہاں کی عام زندگی کو اگر افسانوی رنگ میں پیش کیا جائے تو وہ کسی ایرانی شہر کی زندگی کی چلتی پھرتی تصویر نظر آئے گی۔

ادھر رام پور میں بھی ایرانی تہذیب فارسی زبان کے ساتھ اُبھری اور اُس نے دربار کے سہارے کی بنیاد پر امراء کے ساتھ ساتھ عوام کو بھی اثرانداز کرنا شروع کر دیا۔ رام پور کی شہری زندگی میں آج بھی ان اثرات کو دیکھا جا سکتا ہے۔

مغلیہ دور کے انحطاط میں فارسی کی مقبولیت کو کوئی صدمہ نہیں پہنچا۔ غیر مسلم حکومتوں نے بھی اس کی عظمت کو مجروح کرنے کی کوشش نہیں کی، پنجاب میں سکھوں کی جو نئی ریاست اُبھری اُس نے قدیم روایات کو برقرار رکھا۔ گورونانک کا میں حوالہ دے چکا ہوں۔ گورو گوبند سنگھ کی فارسی تصنیف ظفر نامہ فارسی ادب کی معیاری تخلیق کہی جا سکتی ہے، مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں حکیم عزیز الدین، فقیر نور الدین، دیوان امرناتھ اکبری، دیوان گنگارام وغیرہ فارسی کے اکابر علماء موجود تھے۔ اس دور میں بھی دفتری کاروبار فارسی میں ہوتا تھا، روزنامچے اور واقعات

کی مسلیں بھی فارسی ہیں مرتب ہوتی تھیں۔ جبا سنگھ کلال نے اپنے سکوں پر یہ عبارت کندہ کرائی تھی ؎

سکہ زد در جہاں بفضل اکال ملک احمد گرفت جبا کلال

اس زمانہ کے بعض اچھے غیر مسلم مصنف یہ ہیں۔ منشی سوہن لال جنہوں نے عمدۃ التواریخ پنڈت کاچرنے مجمع التواریخ لکھی۔ ان کے علاوہ دیوان امرناتھ، منشی دیارام در، کرنل جہان سنگھ، دیوان کرپارام، اور دیوان اننت رام مشہور مصنفین ہیں۔

انگریزوں کے آنے کے بعد بھی ۱۸۲۹ء تک فارسی ہی دفتری زبان رہی۔ ہندی اور فارسی کے اختلاط سے حالانکہ ایک نئی ہندوستانی زبان کا وجود عمل میں آچکا تھا مگر ۱۸۵۷ء تک شمالی ہند میں بھی علمی زبان فارسی رہی۔ بول چال کی زبان تو فارسی نہ تھی اور شاعری میں بھی فارسی کا ہی غلبہ تھا۔ شمالی ہند کا ولی دکنی نے جب دورہ کیا ہے تو دلی والے اس کی اردو غزلوں کو سن سن کر حیرت میں تھے کہ اُردو میں بھی شاعری ہو سکتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ شمالی ہند کی علمی زبان ابھی تک فارسی ہی تھی۔ اور مغلوں کے بعد بھی کچھ عرصہ تک فارسی رہی۔ انگریز آئے تو انھوں نے بھی فارسی کے ارتقائی اثرات کو فوری طور پر ٹھیس نہ پہنچائی بلکہ اس کی اشاعت کے لئے کئی درسگاہیں قائم کیں مثلاً کلکتہ میں وارن ہیسٹنگز نے ۱۷۸۱ء میں ایک مدرسہ عالیہ کے نام سے کھولا۔ ۱۷۸۴ء میں سر ولیم جونسز نے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی بنیاد رکھی جس کی غایت یہ تھی کہ مشرقی علوم میں تحقیق و تدقیق کے شوق کو ترقی دی جائے۔ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا گیا جس میں دیگر علوم اور زبانوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ فارسی اور عربی کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ اس دور میں فارسی تعلیم کے لئے ایک خاص رقم علیحدہ کر دی گئی تھی جس سے طلباء کو وظائف دیئے جاتے تھے۔ ۱۸۲۳ء میں آگرہ کالج کی بنیاد گنگا دھر پنڈت آنجہانی کے عطیہ سے پڑی۔ اس کالج میں فارسی عربی اور سنسکرت کی تعلیم دی جاتی تھی۔

دہلی کالج ۱۸۲۵ء میں کھولا گیا اور جس میں فارسی کو بھی ذریعہ تعلیم بنایا گیا تھا۔

اس دور میں جو فارسی کی مشہور تصانیف ہوئیں ان میں سدا سکھ نیاز کی تنبیہ الغافلین، پنڈت متھرا ناتھ مالوی کی ریاض المذہب، لکشمی نرائن سرور کی بھگوت پران، راجہ رام موہن رائے کی تحفۃ الموحدین رامائن منظوم منشی موہر سنگھ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اس دور فارسی کی اشاعت میں منشی نول کشور اور ان کے مطبع نے بڑا حصہ لیا۔ اگر یہ مطبع نہ ہوتا تو عربی فارسی کی ہزاروں کتابیں ضائع ہو جاتیں۔ اس طور پر انھوں نے سینکڑوں کتابوں کو تلف ہونے سے بچا لیا۔

ایران اور ہند کے تعلق سے ہندوستان میں ایک نئے شعور، نئے ذہن اور نئی تہذیب نے جنم لیا۔ مجھ سے اگر کوئی فارسی کے ہند پر اثرات کے بارے میں پوچھے تو میں صرف اتنا ہی کہہ دوں گا فارسی نے ہمیں تصوف میر دیا، غالب دیا، غزل دی، مرثیہ دیا، مجلسی اطوار کے نکھرے ستھرے آداب دیئے۔ تاج کے بلند مرمریں میناروں کو جمنا کی بے رحم لہریں غرق کر سکتی ہیں کوئی بھی طوفانی زلزلہ اس کے در و دیوار میں جھول ڈال سکتے ہیں مگر بڑے سے بڑے انقلابات میر غالب کو ہم سے نہیں چھین سکتے، غزل کی عظمت پر ٹھیس نہیں پہنچا سکتے۔ غزل فارسی اور ہندی تخیلات کا حسین اور نازک سنگم ہے وہ صرف صنفِ سخن نہیں بلکہ ہماری تہذیب ہے۔ اور ہمارا امزاج ہے ہمارے ہزار سالہ تجربات کا جاودانی ور پھیلتا بڑھتا نقش ہے۔

مختصر یہ کہ فارسی زبان اور ہندی زبانوں کے درمیان اگرچہ انگریزی زبان اور مغربی کلچر کی دیوار تقریباً ڈیڑھ صدی تک حائل رہی۔ مگر پھر بھی فارسی کی بنیادی اہمیت کم نہیں ہوئی آج بھی ہمارے مکاتب میں، مدرسوں میں، خانقاہوں میں اور مساجد میں بچوں کی تعلیم آمدنامہ، سکندر نامہ اور گلستاں بوستاں سے شروع کی جاتی ہے۔

فارسی کا تعلق ہم سے اب اتنا بنیادی ہو گیا ہے اور اب یہ ایسی اہم ضرورت بن کر ہمارے سامنے آکر کھڑی ہو گئی ہے کہ بغیر اس کے سیکھے ہندوستان کی قومی تہذیب کا جز بننا ناممکن ہے۔ موجودہ دور کا کوئی بھی فلسفی، محقق، اور مورخ فارسی کے بغیر ہمارے قومی ذہن کی نمائندگی نہیں کر سکتا۔

خوارج اور مسئلہ نصبِ امام

از:- جناب حافظ غلام مرتضیٰ صاحب ایم اے لکچرار عربی الہ آباد یونیورسٹی -

اسلام میں مملکتی تنظیم کے مسئلے کو ہمیشہ سے خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے
جہاں تک نفس مسئلے کا تعلق ہے شاید ہی کسی کو (ایجاباً یا سلباً) اس کی اہمیت سے انکار ہو، مگر اس
اتفاق کے بعد اس کی دیگر تفاصیل میں جیسا کہ ہر اصولی مسئلے کی تفریع و تبسیط کے سلسلہ میں ہوا کرتا ہے
مختلف متفکرین اسلام کے مابین جزئی اختلافات کا پیدا ہونا ناگزیر تھا- اگرچہ اکثر اوقات ان جزئی اختلافات
کی نوعیت نزاعِ لفظی سے زیادہ نہیں ہوتی - مثلاً اس مسئلہ ہی کو کہ
"اسلام میں مملکتی تنظیم کے مسئلے کو ہمیشہ سے خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے"۔
ممکن ہے بعض حضرات حسب ذیل الفاظ میں تعبیر کریں کہ
"اسلام میں نصبِ امام کی بنیادی اہمیت ہے"
یہ ایک لفظی نزاع سے زیادہ نہیں ہے مگر جب اسالیبِ فکر میں پختگی آجاتی ہے تو ہر لفظ "جہانے دگر" بنجاتا
ہے اور اس وقت انتخابِ الفاظ کا مسئلہ "خصوصی اہمیت" سے زیادہ "بنیادی اہمیت" کا حامل بن جاتا
ہے - بات یہ ہے کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اسلام میں مملکتی تنظیم کے مسئلہ کو ہمیشہ سے خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے
تو ہماری مراد محض اتنی ہوتی ہے کہ
"عامہ اہل اسلام کا سوائے خوارج اور چند معتزلہ کے اجماع ہے کہ نصبِ امام اُمت پر واجب ہے"
لیکن ع شب آخر گشتہ و افسانہ از افسانہ می خیزد
اس تعبیر میں ایک اور ترمیم پیش کی جاسکتی ہے جس کا میرے خیال میں نفس مسئلے سے کوئی تعلق نہیں ہے
وہ یہ ہے کہ خوارج میں سے صرف ایک مخصوص فرقہ "نجدات" عدم وجوب امامت کا قائل تھا جو کب کا

مٹ چکا۔ باقی تمام خوارج وجوبِ امامت کے مسئلہ میں اہلسنت کے ساتھ ہیں۔

یہ ایک خاص تاریخی نزاع ہے جو عقائد و فقہ کی نزاعات سے قطعاً علیحدہ ہے اور جس پر بہت کشادہ دلی کے ساتھ بحث وتمحیص کی جا سکتی ہے۔ جہاں تک تاریخ کے فیصلے کا تعلق ہے یہ کہنا غلط ہے کہ

۱- تمام خوارج وجوبِ امامت کے مسئلہ میں اہلسنت کے ساتھ ہیں' بالفاظِ دیگر وجوبِ نصب امام کے قائل ہیں اور یہ بھی غلط ہے کہ

۲- خوارج میں سے صرف ایک مخصوص فرقہ "نجدات" عدم وجوب امامت کا قائل تھا۔

اور یہ بھی کہ

۳- وہ فرقہ (نجدات) کب کا مٹ چکا۔

چونکہ خوارج کا امامت سے ایک خصوصی تعلق رہا ہے (اگرچہ سلبی) اس لئے یہ مسئلہ ایک سیر حاصل بحث کا مستحق ہے۔ کیا اچھا ہوتا کہ کوئی مورخ اس پر روشنی ڈالتا۔ لیکن اہل حضرات کی بے اعتنائی کے بعد مجھ جیسا نااہل ہی اس فرضِ کفایہ کو ادا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وما توفیقی الا باللہ

(۱) علمائے محققین نے جہاں بھی وجوبِ امامت کے مسئلہ میں اختلاف کا ذکر کیا ہے وہاں خوارج کو اہلسنت والجماعت سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ کیونکہ ان حضرات کے نزدیک یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت تھی کہ خوارج ہرگز وجوبِ نصب امام کے قائل نہیں مثلاً

(۱) علامہ سعدالدین تفتازانی فرماتے ہیں۔

وقول الخوارج انہ لا یجب اصلا لما فیہ من اثارة الفتنة فاسد (شرح تہذیب الکلام ص۱۷۱)

خوارج کا یہ قول کہ نصب امام سرے سے واجب ہی نہیں کیونکہ اس میں فتنہ انگیزی کا اندیشہ ہے' باطل ہے

(۲) محقق طوسی کی کتاب تجرید کی شرح میں علامہ قوشجی لکھتے ہیں:۔

وذہبت الخوارج الی انہ غیر واجب مطلقا (شرح تجرید بحث امامت)

خوارج کا مسلک یہ ہے کہ نصب امام سرے سے واجب ہی نہیں۔

(۳) امام رازی اپنی کتاب المحصل میں "القسم الرابع فی الامامة" کے ذیل میں فرماتے ہیں۔

منهم من قال بوجوبها ومنهم من لم يقل ...... واما الذين لم يقولوا بوجوبها فهم الخوارج والاصم (المحصل صفحہ ۱۷۶)

ان میں سے بعض لوگ وجوب امامت کے قائل ہیں اور بعض اس کے قائل نہیں۔ رہے وہ لوگ جو وجوب امامت کے قائل نہیں وہ خوارج اور اصم (معتزلی) ہیں۔

(۴) محقق سید شریف جرجانی نے شرح مواقف میں لکھا ہے:۔

وقالت الخوارج لا يجب نصب الامام اصلا بل هو من الجائزات (شرح مواقف جلد ثامن صفحہ ۳۴۵)

خوارج کا قول ہے کہ نصب امام سرے سے واجب ہی نہیں بلکہ یہ مسئلہ جائز امور میں سے ہے۔

(۵) قاضی بیضاوی صاحب تفسیر بیضاوی نے طوالع الانوار میں فرمایا ہے:۔

الباب الثالث فی الامامة وفیه مباحث) الاول فی وجوب نصب الامام اوجبه الامامية والاسماعيلية علی الله والمعتزلة والزيدية علينا عقلاً واصحابنا سمعاً ولم يوجب الخوارج مطلقاً

تیسرا باب امامت کے بارے میں ہے اور اس میں کئی مباحث ہیں پہلا بحث وجوب نصب امام کے متعلق ہے۔ امامیہ اور اسماعیلیہ کے نزدیک نصب امام اللہ تعالیٰ پر واجب ہے اور معتزلہ اور زیدیہ کے نزدیک مخلوق پر عقلاً واجب ہے اور ہمارے علماء نے اس کو از روئے شرع مخلوق پر واجب گردانا ہے اور خوارج نے سرے سے اس کو واجب ہی نہیں گردانا۔

(۶) علامہ شمس الدین اصفہانی مطالع الانظار میں لکھتے ہیں:۔

ولم یوجب الخوارج نصب الامام مطلقاً لا علی الله تعالی ولا علينا لا سمعاً ولا عقلاً (مطالع الانظار صفحہ ۴۲۳)

خوارج نے نصبِ امام کو بالکل واجب ہی نہیں گردانا نہ اللہ تعالیٰ پر اور نہ مخلوق پر نہ شرعی طور سے اور نہ عقلی طور سے۔

(۷) ابن ابی شریف اپنی کتاب المسامرہ میں لکھتے ہیں :-

واما اصل الوجوب فقد خالف فیه الخوارج فقالوا هو جائز و منهم من فصل فقال قوم من هؤلاء یجب عند الامن دون الفتنة وقال فریق بالعکس ای یجب عند الفتنة دون الامن (المسامرہ صفحہ ۲۹۵)

رہا نفس وجوب امام کا مسئلہ تو خوارج نے اس بارے میں مخالفت کی ہے اور کہا ہے کہ یہ جائز امر ہے اور اُن میں سے بعضوں نے تفریق کی ہے چنانچہ ایک فریق کا قول ہے کہ امن کی حالت میں واجب ہے نہ کہ فتنہ کے زمانہ میں اور ایک فریق اس کے برعکس ہے یعنی فتنہ کی حالت میں واجب ہے نہ کہ امن کی حالت میں۔

(۸) علامہ سعد الدین تفتازانی شرح مقاصد میں لکھتے ہیں :- (خط کشیدہ الفاظ مقاصد کے ہیں)

احتجت الخوارج القائلون بعدم وجوب نصب الامام بان فی نصبه اثارة الفتنة (شرح مقاصد جلد دوم صفحہ ۲۷۶)

خوارج جن کا یہ عقیدہ ہے کہ نصب امام واجب نہیں ان کی دلیل یہ ہے کہ نصب امام میں فتنہ انگیزی کا اندیشہ ہے۔

(۹) مولانا عبد العزیز فرہاری نبراس (شرح شرح عقائد نسفی) میں فرماتے ہیں

ثم الاجماع علی ان نصب الامام واجب اراد اجماع اهل السنة والشیعة والمعتزلة لا اهل السنة بدلیل قوله وانما الخلاف ولا الفرق کلها لان الخوارج لا یوجبونه (نبراس صفحہ ۵۱۱)

پھر اس بات پر اجماع اُمت ہے کہ نصب امام واجب ہے اجماع سے مصنف کی مراد اہلسنت، شیعہ اور معتزلہ کا اجماع ہے کیونکہ آگے چل کر فرماتے ہیں "وانما الخلاف" نہ تمام فرقوں کا اجماع اس لئے کہ خوارج نصب امام کو واجب نہیں مانتے

مذکورہ بالا اقتباسات سے صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ خوارج میں من حیث الجماعت عدمِ وجوب امامت کے قائل تھے بلکہ حوالہ ۱ اور ۳ سے ان اسباب کا بھی پتہ چلتا ہے جن کی بناء پر خوارج کا یہ عقیدہ تھا۔ حوالہ ۵ میں قاضی بیضاوی نے نصبِ امام کے متعلق اسلامی فرقوں میں جو اختلافات تھے ان کا اجمالاً ذکر کرنے کے بعد خوارج کی طرف سے نصبِ امام کی قطعی طور پر نفی کردی ہے۔ یہاں پر یہ بھی واضح کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اوپر جو حوالہ جات نقل کئے گئے وہ اہلسنت والجماعت کے اساطین علماء کی کتابوں سے

اخذ کیے گئے ہیں اور آخری عبارت شرح عقائد نسفی کی شرح سے نقل کی گئی ہے جو تمام اہلسنت کے درمیان عقائد کے بارے میں محقق اور مستند تصنیف ہے۔

علمائے اہلسنت کے علاوہ شیعہ مصنفین نے بھی اپنی کتابوں میں خوارج کو عدم وجوب امامت کا قائل بتلایا ہے۔ مثلاً

(۱۰) شرح باب الحادی عشر کا مصنف لکھتا ہے۔

فاعلم ان الناس اختلفوا فی الامامۃ ھل ھی واجبۃ ام لا۔ فقالت الخوارج لیست بواجبۃ اصلاً (شرح باب الحادی عشر ص۳۴)	اس مسئلہ میں کہ امامت (نصب امام) واجب ہے یا نہیں لوگوں کا اختلاف ہے۔ خوارج کا یہ قول ہے کہ یہ بالکل واجب ہی نہیں۔

(۱۱) محمد بن محمود آملی "نفائس الفنون فی عرائس العیون" میں جو ابھی تک شائع نہیں ہوئی، لکھتے ہیں

"مذہب اشاعرہ وبعضے از معتزلہ آنست کہ نصب امام بر خلق واجبست و مذہب امامیہ واسماعیلیہ وبعضے از معتزلہ آنست کہ بر حق تعالیٰ واجب است و مذہب خوارج آنست کہ نصب امام واجب نیست اصلا" (نفائس الفنون ص... مخطوطہ فارسیہ لائبریری مفتی صاحب سہ بجانبہ الہ آباد)

اب تک علمائے اسلام کی مختلف تصانیف سے اقتباسات نقل کر کے یہ ثابت کیا گیا کہ خوارج وجوب امامت کے بارے میں اہلسنت کے ساتھ نہیں بلکہ اُن کے بالکل برخلاف تھے۔ ان عبارتوں کا مفہوم اس درجہ واضح ہے کہ یورپین مصنفین نے بھی باوجود ثقافتی اور تمدنی بُعد کے اُن کا وہی مفہوم سمجھا ہے جس کی طرف اُوپر اشارہ کیا گیا مثلاً

(۱۲) میکڈانلڈ جو مشاہیر مستشرقین میں سے ہے، اپنی کتاب "اسلامی دینیات، فقہ اور دستوری نظریے کا ارتقاء" (ص۵۰) میں رقمطراز ہے

The Kharijites on the other hand recognize no fundamental need of an Imam, he is only allowable.

(اس کے برعکس خوارج قطعی طور پر کسی امام کی ضرورت نہیں سمجھتے، ان کے نزدیک نصب امام محض جائز امور میں سے ہے۔

(۱۳) ایک دوسرا یورپین مصنف (T. P. Hughes) لکھتا ہے

They also held that there was no absolute necessity for a Khalifah at all

(Dictionary of Islam P. 270)

(خوارج کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ سرے سے کسی خلیفہ کی مطلق ضرورت ہی نہیں)

مذکور الصدر حوالہ جات میں بھی عدم وجوب امامت کی نسبت خوارج کی طرف من حیث الجماعت کی گئی ہے۔ خوارج میں سے کسی صرف مخصوص فرقہ کی طرف اس کی نسبت نہیں کی گئی۔

۲۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ خوارج میں سے صرف ایک مخصوص فرقہ "نجدات" عدم وجوب امامت کا قائل تھا جو اس درجہ صریح البطلان ہے کہ کسی وضاحت کا محتاج نہیں۔ بالفرض اگر کسی مصنف نے نجدات کی جانب اس عقیدے کی نسبت کی ہے تو اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ یہ لوگ اس باب میں تشدد اور غلو سے کام لیتے تھے نہ یہ کہ ان کے سوا باقی تمام فرقے وجوب امامت کے بارے میں اہلسنت کے ساتھ تھے تاہم اس سلسلہ میں بھی چند علمائے محققین کے اقوال پیش کئے جاتے ہیں جن سے اندازہ ہوگا کہ کل خوارج یا اُن میں سے اکثر کا یہ عقیدہ تھا مثلاً

(۱) امام رازی اپنی کتاب الاربعین میں فرماتے ہیں۔

قول اکثر الخوارج انہ لا یجب نصب الامام فی شئ من الاوقات فان فعلوہ جاز ولن ترکوہ جاز ایضًا۔	خوارج میں سے اکثر کا قول یہ ہے کہ نصب امام کسی وقت بھی واجب نہیں، لیکن اگر امام مقرر کرلیں تو بھی جائز ہے اور اگر نہ کریں تو بھی جائز ہے۔
(الاربعین صفحہ ۴۲۷)	

(۱۴) شیخ قاسم بن قطلوبغا شرح مسایرہ میں رقمطراز ہیں:۔

وقال اکثر الخوارج وابوبکر الاصم من المعتزلہ لا یجب علی اللہ تعالیٰ و لا علی الخلق (شرح مایرہ ۲۹۷)	اکثر خوارج اور ابوبکر الاصم معتزلی کا قول ہے کہ نصب امام نہ اللہ تعالیٰ پر واجب ہے اور نہ مخلوق پر۔

مذکورہ بالا تصریحات سے صاف پتہ چلتا ہے کہ خوارج میں سے صرف ایک فرقہ "نجدات" ہی عدمِ وجوب امامت کا قائل نہ تھا بلکہ اُن میں سے اکثر کا یہی عقیدہ تھا۔ مزید تفصیل کے لئے چند دیگر اقتباسات بھی ہدیۂ ناظرین ہیں۔

(۳) محقق سید شریف جرجانی شرح مواقف میں فرماتے ہیں:

العجاردہ۔ ھو عبد الرحمٰن بن عجرد وھم آخر السبع من فرق الخوارج زادوا علی النجدات بعد ان وافقوھم فی مذھبھم وجوب البراءۃ عن الطفل (شرح مواقف جلد ثامن ۳۹۳)	فرقہ عجاردہ کا پیشوا عبد الرحمٰن بن عجرد تھا اور یہ خوارج کے سات فرقوں میں سے آخری ہے۔ ان لوگوں نے نجدات کے ساتھ اُن کے معتقدات میں موافقت کرنیکے بعد بعض دوسری چیزوں کا اضافہ کیا مثلاً نابالغ کی برارت کو واجب جاننا وغیرہ۔

(۴) اسی بات کو کشاف اصطلاحات الفنون کا مصنف لکھتا ہے،

العجاردۃ فرقۃ من الخوارج اصحاب عبد الرحمٰن بن عجرد وافقوا النجدات فیما ذھبوا الیہ الا انھم زادوا علیھم وجوب البراءۃ عن الطفل ...... (کشاف جلد دوم ۹۴۹)	عجاردہ خوارج میں سے ایک فرقہ ہے جو عبدالرحمٰن بن عجرد کے پیرو ہیں۔ ان لوگوں نے نجدات کے عقائد میں اُن کی موافقت کی لیکن نابالغ کے متعلق وجوب برارت کا بھی انھوں نے اضافہ کیا تھا۔

(۵) امام شہرستانی کتاب الملل والنحل میں فرماتے ہیں:۔

العجاردۃ اصحاب عبد الکریم بن عجرد وافق النجدات فی بدعھم (کتاب الملل والنحل ج ۱ ص ۵۹)	عجاردہ عبدالکریم بن عجرد کے پیرو ہیں۔ ابن عجرد نے نجدات کے ساتھ ان کی بدعتوں میں موافقت کی تھی۔

امام ابوالحسن اشعری فرماتے ہیں کہ عجاردہ کے اندر پندرہ فرقے شمار کئے جاتے تھے (ملاحظہ ہو مقالات الاسلامیین جلد اول ص۹۳)

اس سے قارئین کرام اندازہ لگا سکتے ہیں کہ عجاردہ کی کتنی بڑی اکثریت تھی جو نجدات کے عقیدوں میں شریک تھی۔ لہذا جب نجدات کے ہمخیال دوسرے فرقے بھی موجود تھے تو یہ خیال کہ "خوارج میں سے صرف ایک مخصوص فرقہ نجدات عدمِ وجوب امامت کا قائل تھا" ایک بے معنی سی بات ہو۔

(۶) محقق سید شریف جرجانی شرح مواقف میں خوارج کے فرقوں کے شمار کے وقت لکھتے ہیں:۔

الفرقة الثالثة من کبار الفرق الاسلامیة الخوارج وهم سبع فرق المحکمة وهم الذین خرجوا علی علی رض عند التحکیم ...... ولم یوجبوا نصب الامام بل جوّزوا ان لا یکون فی العالم امام (شرح مواقف جلد ثامن ص۳۹۲)	اسلام کے بڑے فرقوں میں سے تیسرا فرقہ خوارج ہے اور اُن کے اندر پھر سات فرقے ہیں جن میں سے ایک محکمہ ہے جس نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے خلاف تحکیم کے وقت بغاوت کی تھی اور ان لوگوں نے نصبِ امام کو واجب نہیں گردانا بلکہ اس بات کو جائز بتایا ہے کہ دنیا میں کوئی امام ہی نہ ہو۔

(۷) اسی بات کو کشاف اصطلاحات الفنون کا مصنف یوں لکھتا ہے:۔

المحکمة فرقة من الخوارج وهم الذین خرجوا علی علی کرم الله عند التحکیم ...... ولم یوجبوا نصب الامام (کشاف جلد اول ص۳۲۷)	محکمہ خوارج میں سے ایک فرقہ ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے مسئلہ تحکیم کے وقت حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے خلاف خروج کیا تھا اور انھوں نے نصبِ امام کو واجب نہیں گردانا۔

(۸) امام عبدالکریم شہرستانی محکمہ کے حالات میں لکھتے ہیں:۔

وجوّزوا ان لا یکون فی العالم امام اصلاً (الملل والنحل جلد اول ص۱۱۵)	ان لوگوں نے اس کو جائز قرار دیا تھا کہ دنیا میں سرے سے کوئی امام ہی نہ ہو۔

مذکورالصدر اقتباسات میں فرقہ محکمہ کی خصوصیات میں سے عدمِ وجوب نصبِ امام بتایا

گیا ہے - اس سے کم از کم اس بات کی توصراحت ہو ہی جاتی ہے کہ فرقہ نجدات کے ساتھ محکمہ کا بھی یہی عقیدہ تھا۔ یہ بھی واضح رہے کہ محکمہ ہی وہ فرقہ تھا جس نے سب سے پہلے تحکیم کے موقع پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے اختلاف کیا اور بارہ ہزار کا لشکر جرار لیکر حضرت علیؓ کے مقابلے میں نہروان میں صف آرا ہوئے تھے اور جس پُرجوش نعرہ کے ذریعہ اتنی بڑی جمعیت اکٹھا کی گئی تھی وہ لاحکم الا للہ کا نعرہ تھا یعنی دنیا میں کسی امام کی امامت یا خلیفہ کی خلافت کی ضرورت نہیں، صرف اللہ کی حکومت یا بالفاظِ دیگر حکومت الہیّہ قائم ہونی چاہیئے۔ خوارج کے اس نعرہ کا یقیناً غلط مقصد تھا۔ جیسا کہ خود حضرت علیؓ نے فرمایا ہے - امام شہرستانی لکھتے ہیں:-

ولما سمع امیر المومنین علی علیہ السلام هذه الکلمة عدل یراد بها جور انما یقولون لا امارة ولا بد من امارة برة او فاجرة۔	جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے یہ کلمہ سنا تو فرمایا کہ یہ ایک عادلانہ کلمہ ہے جس سے ان کا مقصد ظلم و ستم ہے ان کا صرف یہ قول ہے کہ کسی امارت (امامت) کی ضرورت نہیں ہے حالانکہ امارت (امامت) ناگزیر ہے خواہ وہ نیکوکار ہو یا بدکار ہو
(الملل والنحل جلد اوّل ص۵۵)	

مورخین لکھتے ہیں کہ نہروان کی اس جنگ میں مسلمانوں میں سے دس سے بھی کم افراد شہید ہوئے تھے۔ اس کے برخلاف خوارج میں سے جو زندہ بچے تھے وہ تعداد میں دس سے بھی کم تھے اور یہ معدودے چند افراد جو قتل ہونے سے بچ گئے تھے ان میں سے دو عمان، دو کرمان، دو سجستان، دو جزیرۃ العرب اور ایک یمن کی طرف فرار ہوگئے تھے اور خوارج کی ساری بدعتیں ان مقامات میں انھیں لوگوں سے پھیلیں (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو الملل والنحل تالیف شہرستانی اور الفرق بین الفرق تالیف عبدالقاہر بغدادی بحث خوارج)

اس گزارش سے نہ صرف اتنا ہی واضح ہوجاتا ہے کہ محکمہ سے خارجیت کا آغاز ہوا بلکہ اس کی بھی صراحت ہوجاتی ہے کہ وہ مسئلہ جس کی بناپر خوارج اہلسنت والجماعت کے سوادِ اعظم سے جدا ہوگئے تھے

وہ عدم وجوب نصب امام ہی کا مسئلہ تھا۔

عربی کتابوں کو تو چھوڑیئے جس سے اس علمی کساد بازاری کے زمانہ میں لوگ ناواقفیت کا عذر پیش کر سکتے ہیں، اردو زبان میں بھی اس قسم کے حوالوں کی کمی نہیں جن میں سے ایک "مذاہب الاسلام" ہے جسے مولانا نجم الغنی خاں صاحب رامپوری نے اسلام کے مختلف فرقوں اور ان کے عقائد کے بارے میں لکھا ہے۔ اس کتاب میں مولانا موصوف فرماتے ہیں:۔

"اور اکثر خوارج کا یہ قول ہے کہ امام کا مقرر کرنا کسی حال میں امن کا زمانہ ہو یا فتنہ وفساد کا نہ اللہ پر واجب ہے نہ بندوں پر، نہ شرعی طور پر نہ عقلی طور پر، پھر اگر اسے مقرر کر دیں تو جائز ہے اور اگر نہ مقرر کریں تو بھی جائز ہے۔" (مذاہب الاسلام صـ۴۶۹)

۳۔ رہا یہ قول کہ فرقہ نجدات کب کا مٹ چکا، تو یہ ایسا مبہم ہے جس سے بالکل پتہ نہیں چلتا کہ آیا یہ فرقہ ظہور پذیر ہونے سے قبل ہی مٹ چکا تھا یا ۱۹۵۷ء سے قبل مٹ چکا ہے۔ اگر یہ مراد ہے کہ یہ فرقہ پانچویں صدی ہجری سے قبل مٹ چکا ہے۔ کیونکہ علامہ ابن حزم ظاہری جن کا سال وفات ۴۵۶ھ ہے انھوں نے بھی اس فرقہ کے متعلق "وقد بادت النجدات" لکھا ہے تو یہ دعویٰ محلِ کلام ہے۔ کیونکہ نجدات جو نجدہ بن عامر کے قتل کے بعد عطویہ اور فدیکیہ نام کی دو شاخوں میں منقسم ہو گئے تھے ان میں سے عطویہ چھٹویں صدی میں بھی سجستان، خراسان، کرمان اور قہستان کے علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ جیسا کہ امام شہرستانی فرماتے ہیں۔

ثم افترقوا بعد نجدة الی عطویة وفدیکیة .... واهل سجستان و خراسان وکرمان وقهستان من الخوارج علی مذهب عطیة۔

(دیکھئے کتاب الملل والنحل جلد اول صـ۵۷)

ابن حزم ظاہری کی تحقیق تو یہ ہے کہ اباضیہ اور صفریہ کے علاوہ خوارج کے دوسرے فرقے ان زمانے میں مٹ چکے تھے جو ہرگز قابل تسلیم نہیں کیونکہ امام شہرستانی جو ابن حزم ظاہری کے تقریباً ایک صدی بعد گزرے ہیں، فرماتے ہیں کہ محکمہ کے چند افراد نہروان کی جنگ میں شکست کھانے کے بعد عمان،

کرمان، سجستان، جزیرۃ العرب اور یمن میں جاکر بس گئے تھے اس کے بعد لکھتے ہیں:۔

وظهرت بدع الخوارج فی هذه المواضع منهم و بقيت الى اليوم (کتاب الملل والنحل بحث خوارج)

ان مقامات میں خوارج کی بدعتیں انھیں لوگوں سے پیدا ہوئیں اور یہ بدعتیں آج بھی باقی ہیں۔

اور جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جاچکا محکمہ ہی وہ فرقہ ہے جس سے خارجیت کا آغاز ہوا اور منجملہ دیگر بدعتوں کے اُن کی بنیادی بدعت عدم وجوب نصب امام ہی کا مسئلہ تھا جس کی شہادت اُن کے نعرہ "لاحکم الا للہ" سے ملتی ہے۔

علاوہ بریں امام رازی کے ایک قول سے تو اس کی شہادت ملتی ہے کہ فرقہ نجدات علاقہ سجستان میں ساتویں صدی میں بھی (ان کے زمانہ میں) پائے جاتے تھے۔ چنانچہ اپنی کتاب "اعتقادات فرق المسلمین والمشرکین" میں لکھتے ہیں:۔

الفرقة الثالثة النجدات اتباع نجدة بن عامر الحنفی وهم يرون ان قتل من خالفهم واجب واكثر الخوارج بسجستان على مقالته (اعتقادات ص۵۲)

تیسرا فرقہ نجدات ہے جو نجدہ بن عامر حنفی کے پیرو ہیں اُن کا عقیدہ ہے کہ مخالفین کو قتل کرڈالنا واجب ہے اور سجستان کے اکثر خوارج اسی نجدہ ہی کے مذہب پر ہیں۔

بہرکیف فرقہ نجدات جو بقول ابن حزم پانچویں صدی سے قبل مٹ چکا تھا وہ کم ازکم ساتویں صدی میں (جو امام رازی کا زمانہ ہے) تو ضرور ہی پایا جاتا تھا اور میں تو یہاں تک کہوں گا کہ آج بھی جبکہ ایران میں عام طور پر شیعہ امامیہ کا مذہب رائج ہے اور افغانستان میں سنی المذہب کا غلبہ ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ وہاں کے دیہی علاقوں میں اور کون کون سے مذاہب کے پیرو موجود ہیں اور اگر خوارج بھی ہیں تو وہ کس فرقے سے تعلق رکھتے ہیں اور اُن کے عقائد کی تفصیل کیا ہے۔ جبکہ ہمارا اپنا تجربہ ہے کہ خود ہندوستان کے مختلف گوشوں میں بہت سے مذاہب اور فرقے ایسے پائے جاتے ہیں جن کی تفصیل عام طور پر لوگوں کو معلوم نہیں۔

ممکن ہے کوئی صاحب اس سلسلے میں ابن حزم ظاہری کی حسب ذیل عبارت کا حوالہ دیں۔

متفق جمیع اہل السنۃ وجمیع المرجئۃ وجمیع الشیعۃ وجمیع الخوارج علی وجوب الامامۃ (کتاب الفصل فی الملل والاہواء والنحل الجزء الرابع الکلام فی الامامۃ والمفاضلۃ)

جملہ اہل سنت والجماعۃ، تمام مرجئہ، کل شیعہ اور سب خوارج کا اس بات پر اتفاق ہے کہ نصب امام واجب ہے۔

تو میں عرض کروں گا کہ ہمیں علامہ ابن حزم ظاہری کے فضل و کمال سے انکار نہیں، ان کا ادب واحترام اپنی جگہ پر ہے مگر جب ایسی فضا پیدا ہو جائے کہ دوسرے علماء محققین کے اقوال اُن کے مقابلے میں نظر انداز کئے جانے لگیں تو مجھے مجبوراً یہ عرض کرنا ہی پڑے گا کہ علمائے ناقدین کے نزدیک ابن حزم ظاہری اہلِ سنت کے مسلک سے ناواقف تھے اور اہلِ حق اور باطل پرستوں کے درمیان تمیز کرنے سے بھی قاصر تھے مثلاً امام ابن السبکی فرماتے ہیں:۔

وابن حزم لایدری مذہب الاشعریۃ ولا یفرق بینہم وبین الجہمیۃ لجہلہ بما یعتقدون

ابن حزم اشاعرہ کے مذہب سے ناواقف ہیں اور اور ان کے عقائد سے بے خبر ہونے کی وجہ سے جہمیہ اور ان کے مابین کوئی فرق نہیں کرتے۔

(ملاحظہ ہو طبقات الشافعیۃ الکبریٰ الجزء الثالث)

حالانکہ اہلِ سنت والجماعت میں امام ابو الحسن اشعری کا اتنا بڑا درجہ ہے کہ آج بھی تمام دنیائے اسلام میں انھیں کے پیرو سب سے زیادہ پائے جاتے ہیں۔

علاوہ بریں ابن حزم ظاہری کو تو کچھ اعجوبہ نویسی ہی میں لطف آتا تھا۔ اجماعِ امت کے شارعِ عام سے ہٹ کر اپنے لئے ایک نئی راہ نکالنا ان کی فطرت میں داخل تھا اور اسی کو وہ مایۂ افتخار سمجھتے تھے خواہ ان کی جدت طرازی صریح نصوص کتاب وسنت ہی کے مخالف کیوں نہ ہو۔ مثلاً ان کی تحقیق ہے کہ بعض عورتیں بھی پیغمبر ہوئی ہیں۔

وشارکھم بعض النساء فی النبوۃ (ملاحظہ ہو الفصل فی الملل والاہواء والنحل الجزء الرابع)

حالانکہ خود قرآنِ پاک کا ارشاد ہے

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُّوحِي إِلَيْهِمْ فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِن كُنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ (سورۃ نحل)

مذکورۂ بالا آیت میں قصر کے ابلغ طریقہ یعنی النفی والاستثناء کے ذریعہ رسالت کو صرف مردوں میں منحصر کر کے عورتوں کی طرف سے اُس کی نفی کر دی گئی ہے یعنی ہم نے صرف مردوں کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔ بالفاظِ دیگر عورتیں پیغمبر نہیں ہو سکتیں۔ چنانچہ اس آیتِ کریمہ کی تفسیر میں امام رازی فرماتے ہیں:۔

"دلت الآیۃ علیٰ انّہٗ تعالیٰ ما ارسل احداً من النّساء"

ابن حزم ظاہری کی اعجوبہ نگاری کے بارے میں جو کچھ راقم نے عرض کیا وہ تنہا میرا ہی خیال نہیں ہے بلکہ بیسویں صدی کے مشہور مورخ و نقاد علامہ شبلی مرحوم نے بھی ابن حزم کی کتاب الملل والنحل پر تبصرہ فرماتے ہوئے یہی لکھا ہے۔ علامہ موصوف کے الفاظ درجِ ذیل ہیں:۔

"اس کتاب میں بعض خیالات بالکل جدید ہیں مثلاً یہ بحث کہ عورتیں پیغمبر ہو سکتی ہیں یا نہیں اس کے متعلق ہم کو جہاں تک معلوم ہے آج تک کسی نے اثبات کا پہلو نہیں لیا۔ لیکن علامہ ابن حزم ظاہری کا دعویٰ ہے کہ عورتیں پیغمبر ہو سکتی ہیں"

(ملاحظہ ہو مقالاتِ شبلی جلد چہارم ص۳)

بہر کیف جو مصنف رسالت جیسے اہم دینی مسئلہ میں قرآنِ پاک کی تصریح کے خلاف مسلک اختیار کرنے کی جرأت کر سکتا ہے وہ اگر خوارج کے بارے میں ایسی اطلاع دے جو تاریخی شواہد کے خلاف ہو تو کوئی بعید نہیں۔

ادبیات

غزل

از

(جناب الم مظفرنگری)

رہینِ سوزِ وفا شاد کام ہو نہ سکا — جلا پتنگ پہ جل کر تمام ہو نہ سکا

جو وقفِ بادہ کشی غرقِ جام ہو نہ سکا — بریں مے کدہ عالی مقام ہو نہ سکا

جو دل سے پیرِ مغاں کا غلام ہو نہ سکا — وہ مستحقِ مے لالہ فام ہو نہ سکا

گرا ہے خاک پہ مژگاں سے دیکھ وہ آنسو — کہ جس کا منزلِ دل میں قیام ہو نہ سکا

ازل کے دن سے بیان کر رہا ہوں میں پھر بھی — فسانۂ غمِ ہستی تمام ہو نہ سکا

حریمِ عرش ہو یا جلوہ گاہِ دیر و حرم — جوابِ دل تو کوئی بھی مقام ہو نہ سکا

نہ ہم نے دعوتِ تعظیمِ عشق دی اُن کو — ہمیں سے اپنا کبھی احترام ہو نہ سکا

ادائیں ان کی جھلکتی ہیں نور ظلمت سے — حجاب اُن سے بہر صبح و شام ہو نہ سکا

جو روز میکدۂ دل سے لے کے پیتا ہے — رہینِ جلوۂ ساقی و جام ہو نہ سکا

پہنچ سکا نہ کبھی منزلِ حقیقت پر — صراطِ عشق میں جو تیز گام ہو نہ سکا

قسم وفا کی ہے صد ننگ زندگی وفا — وہ دردِ عشق جو ان کا پیام ہو نہ سکا

یہی تو بزمِ تمنا تھی بے خبر کہ جہاں — بقدرِ رقصِ شرر بھی قیام ہو نہ سکا

ہے اب تو مایۂ تسکینِ حیات غم کے لئے — وہ داغِ دل کہ جو ماہِ تمام ہو نہ سکا

نوازشیں تو بہت کیں نگاہِ ساقی نے — ہمیں سے میکدے میں شغلِ جام ہو نہ سکا

الم ہمیشہ رہا مقتدیٔ پیرِ مغاں
جبھی تو اہلِ حرم کا امام ہو نہ سکا

غزل

از

(جناب شمس نوید)

خلوصِ دل پہ شرمانا بھی کیا ہے
محبّت کی سزا پانا بھی کیا ہے!

فضا میں دیر تک سیمیں خراشیں
حسیں تاروں کا ٹکرانا بھی کیا ہے

کسی کو یاد کرنا خوب ۔۔۔ لیکن
کسی کا یاد آجانا بھی کیا ہے

مصائب اور شکستِ فاتحانہ
عزائم کی قسم کھانا بھی کیا ہے!

کبھی دھوکا کبھی جانِ حقیقت
محبّت تیرا افسانا بھی کیا ہے

جنوں کا راز اور بزمِ خرد میں
چھپانا اور سمجھانا بھی کیا ہے

وفا ناکام ۔۔۔۔۔ تکمیلِ محبّت
جسے کھونا اسے پانا بھی کیا ہے!

شکستِ دل نے غم کو زندگی دی
شکستہ ساز پر گانا بھی کیا ہے

جہاں دنیا اکیلا چھوڑ جائے
وہاں دنیا کو اپنانا بھی کیا ہے

جہانِ رنگ و بو تیری حقیقت
سمجھنا اور گذر جانا بھی کیا ہے

گلوں سے کھیلنا پُر کیف لیکن
گلوں سے آگ دہکانا بھی کیا ہے

کبھی ممکن حقایق سے بھی لڑنا
کہیں سائے سے ڈر جانا بھی کیا ہے!

تشیلی جستجو سے آگہی میں
ابھرنا ڈوبتے جانا بھی کیا ہے

نئی تعمیر کی خاطر جہاں کو
خود اپنے ہاتھ سے ڈھانا بھی کیا ہے

تری زلفوں کو سلجھانے کی خاطر
ترے غم میں اُلجھ جانا بھی کیا ہے

تبصرے

بہادر شاہ ظفر اور اُن کا عہد | از جناب رئیس احمد جعفری تقطیع کلاں ضخامت ۱۳۶۰ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت عنہ روپیہ پتہ :- کتاب منزل کشمیری بازار لاہور

بہادر شاہ ظفر مغلیہ دورِ سلطنت کی بزم کے آخری شمع تھے۔ ان کے دور میں سیاسی زوال نقطۂ عروج کو پہنچ چکا تھا اور قانونِ طبعی کے مطابق اس زوال کا اثر انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ میں نمایاں تھا۔ تاہم جس طرح خلافتِ بغداد کے دورِ زوال میں علمی، فنی اور ادبی اعتبار سے بڑی ترقی ہوئی اور بڑے بڑے علماء، حکماء، مشائخ اور ارباب فن وادب پیدا ہوئے۔ مغلیہ سلطنت کے اس آخری دور میں بھی شعر وادب۔ فن و حکمت نے بڑی ترقی کی اور بڑی بڑی نامور شخصیتیں پیدا ہوئیں اس کتاب میں جو درحقیقت ایک انسائیکلوپیڈیا ہے اسی دور کی نہایت مفصل اور مبسوط روئیداد قلمبند کی گئی ہے۔ عنوانات گفتگو اور مباحث کے تنوع کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ صرف فہرست ہی ۵۰ صفحات میں آئی ہے۔ لائق مصنف نے دیباچہ میں اس بے حد ضخیم کتاب کو چند مہینوں کا کارنامہ بتایا ہے۔ یہ اگر سچ ہے تو بے شبہ زود نویسی کے ساتھ ان کی بسیار نویسی لائق مبارکباد ہے۔ لیکن اس کی وجہ سے کتاب میں یہ نقص رہ گیا کہ اول تو اس میں وہ ترتیب قائم نہیں رہ سکی ہے جو پہلے سے ایک سوچی سمجھی تصنیف میں ہونی چاہیئے جو واقعات ترتیب کے اعتبار سے پہلے مذکور ہونے چاہئیں تھے وہ موخر ہو گئے ہیں اور جن کو موخر ہونا چاہیئے تھا وہ مقدم ہو گئے ہیں اس طرح واقعات کے ذکر و بیان میں یکسانیت نہیں ہے۔ جو واقعہ غیر اہم تھا بعض جگہ اس کا ذکر بڑی تفصیل سے ہوا ہے اور اس کے بالمقابل بعض اہم واقعات کا ذکر سرسری طور پر مختصراً کر دیا گیا ہے۔ پھر یہ ظاہر ہے کہ اس عجلت میں تحقیق کا معیار بھی اونچا نہیں ہوسکتا جن

بعض اُردو کتابوں کے کئی کئی صفحات کے اقتباسات نقل ہوتے چلے گئے ہیں ان میں بعض معیاری بھی ہیں اور بعض محض افسانہ ہی ہیں۔ اس سے قطع نظر اس میں شک نہیں کہ بہادر شاہ اور ان کے خاندان۔ اور اس دور کے شعرا۔ ادبا۔ حکما۔ علماء۔ مشائخ اور صناعین کے حالات و سوانح۔ سیاسی و اقتصادی۔ تہذیبی و تمدنی۔ مذہبی اور ثقافتی احوال و واقعات اس تفصیل کے ساتھ یکجا کہیں نہیں ملیں گے۔ لائق مؤلف۔ اُردو زبان کے مشاق اور پختہ اہل قلم ہیں اس لئے اسلوبِ نگارش شستہ و رفتہ اور زبان صاف ستھری ہے۔ پوری داستان دلچسپ ہونے کے ساتھ اس قدر اثر آفریں اور عبرت انگیز ہے کہ ایک مرتبہ کتاب شروع کرنے کے بعد ختم کئے بغیر اسے ہاتھ سے رکھ دینے کو جی نہیں چاہتا۔

فکر و فن از جناب خلیل الرحمٰن صاحب اعظمی تقطیع خورد ضخامت ۲۵۳ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت تین روپے۔ پتہ: آزاد کتاب گھر۔ کلاں محل دہلی ع۶۔

آج کل افسانہ نگاری کی طرح تنقید نگاری بھی ہمارے ادیبوں کا ایک عام موضوعِ نگارش ہے۔ لیکن ایسے ادیب کم ہی ہیں جو واقعی نقاد کہلا سکیں۔ خلیل الرحمٰن صاحب اعظمی اگرچہ نوجوان ہیں لیکن ان کا شمار انھیں چند گنے چنے ادیبوں میں ہونا چاہیے۔ یہ کتاب مصنف کے دس تنقیدی مقالات پر مشتمل ہے۔ ان میں چھ مقالات کلاسکل شعرا یعنی غالب، بہادر شاہ ظفر، خواجہ میر درد، داغ اور مومن و حسرت پر ہیں۔ باقی مقالات شعرائے حال، جوش، جمیل، مظہری، مجاز اور جذبی پر ہیں۔ کسی شاعر کے فن کے متعلق کوئی قطعی رائے قائم کرنا بڑا مشکل کام ہے اور وہ بھی اردو کے شعرائے متقدمین کے متعلق جن کی نسبت یہ مشکل سے ہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ فکری اعتبار سے اپنا کوئی خاص مطمح نظر رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ ہر نقاد کا تنقیدی شعور، تجربہ اور زاویۂ نگاہ دوسرے سے مختلف ہوتا ہے اور وہ ایک شاعر کو اسی سے دیکھتا ہے۔ اس بنا پر یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ان مقالات میں اعظمی صاحب نے جس کے متعلق جو رائے قائم کی ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ انھوں نے ہر شاعر کا بڑی دقتِ نگاہ سے مطالعہ کیا ہے۔ اس کے ماحول، ذاتی حالات اور زندگی

کے واقعات کی روشنی میں اس کے ذہن و فکر کے ابعادِ ثلاثہ متعین کئے ہیں۔ اور پھر اس کے ساتھ اس کے اشعار کو منطبق کیا ہے پھر اس عمل سے وہ جس نتیجہ پر پہنچے ہیں اس کا اظہار سنجیدہ و متین لہجہ میں صاف صاف کر دیا ہے۔ اس سلسلہ میں ان کا سب سے اچھا مضمون جوش ملیح آبادی پر ہے اس میں خود ساختہ شاعرِ انقلاب کے لئے ایک ایسا آئینہ تیار کر دیا گیا ہے جس میں اپنی شکل دیکھ کر خود اس کو اپنے سے گھن آنی چاہئے۔ شروع میں لائق مصنف کے قلم سے ایک مقدمہ ہے جس میں آج کل کے عام تنقید نگاروں پر لطیف انداز میں تبصرہ کیا گیا ہے۔ پھر بڑی بات یہ ہے کہ مصنف نے جو کچھ لکھا ہے خلوص اور صفائی کے ساتھ لکھا ہے۔ عام روش کے برخلاف مغربی مصنفین کے نام لے کر یا ان کے خیالات کو اردو کا جامہ پہنا کر قارئین کو مرعوب کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب ہر صاحبِ ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے۔

ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں از مولانا سید سلیمان ندوی رح تقطیع خورد ضخامت ۱۲۸ صفحات کتابت و طباعت بہتر۔ قیمت درج نہیں۔ پتہ: ادارہ تصنیف و تالیف آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی۔

مولانا مرحوم نے یہ مقالہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کلکتہ منعقدہ ۱۹۱۸ء میں پڑھا تھا اور اسی زمانہ میں اس کا بڑا چرچا ہوا تھا اس میں مولانا نے یہ بتایا ہے کہ مسلمانوں کی عہدِ حکومت میں ہندوؤں کے لئے علوم و فنون کی تعلیم حاصل کرنے کی کیا کیا سہولتیں تھیں اور ان سے فائدہ اٹھا کر ہندو کس طرح تاریخ، شعر، لغت، مصوری طب اور دوسرے علوم و فنون میں کمال حاصل کرتے اور حکومت میں ان کا کیسا وقار و مرتبہ ہوتا تھا۔ شروع میں ہند و عرب کے باہمی روابط پر بھی ایک اجمالی نظر ڈالی گئی ہے۔ اجمالی اس لئے کہ اس موضوع پر مولانا کی خود ایک مستقل کتاب ہے۔ تحقیق اور زبان کے اعتبار سے یہ رسالہ بھی مولانا کے قلم کی خصوصیات کا حامل ہے، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کا شکر گذار ہونا چاہئے کہ اس کی توجہ سے یہ ایک بلند پایہ علمی مقالہ اس لائق ہو سکا کہ ارباب ذوق اس سے استفادہ کر سکیں۔

معراج العاشقین مرتبہ جناب گوپی چند نارنگ ایم۔ اے تقطیع متوسط ضخامت ۸۴ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت ۱۲؍ پتہ: آزاد کتاب گھر کلاں محل۔ دلی۔

حضرت ابوالفتح صدرالدین سید محمد حسینی جو عام طور پر خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے لقب سے معروف ہیں حضرت شاہ نصیر الدین چراغ دہلوی کے خلیفہ اور اپنے وقت کے مشہور بزرگ تھے شیخ کے ایما پر آپ نے دکن کو اپنے فیوض وبرکات روحانی کا مرکز بنالیا تھا چنانچہ وہاں گلبرگہ میں آپ کا مزار آج تک زیارت گاہ عوام وخواص ہے۔ آپ نے عربی، فارسی میں تصنیفات کے علاوہ تصوف کے اسرار ورموز میں ایک رسالہ معراج العاشقین کے نام سے دکنی زبان میں بھی لکھا تھا۔ اصل رسالہ تو پندرہ صفحہ کا ہی ہے۔ لیکن لائق مرتب نے اسے بڑی قابلیت کے ساتھ اڈٹ کیا ہے۔ شروع میں ایک مقدمہ ہے جس میں حضرت خواجہ کے حالات زندگی پر مستند حوالوں کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ اور پھر رسالہ کے موضوع اور اس کی لسانی خصوصیات پر گفتگو کی ہے۔ آخر میں پہلے دکنی الفاظ کی ایک فرہنگ حروف تہجی کے اعتبار سے ہے اور پھر رسالہ میں جو عربی کے جملے، آیات قرآنی اور احادیث آئی ہیں ان کا اردو میں ترجمہ لکھا ہے۔ اس سلسلہ میں بعض جگہ مسامحت ہوگئی ہے۔ مثلاً ص۔ ۷۹ پر نمبر ۳ میں "یخرج من بین الصلب والترائب" "ماء دافق کی صفت ہے نہ کہ انسان کی۔ ص ۴۳ پر نمبر ۳ میں ان اللہ یصلی کا ترجمہ "خدا نماز ادا کر رہا ہے" نہیں ہے بلکہ "خدا درود بھیج رہا ہے" ہے اصل رسالہ تو جیسا کچھ بھی ہے ہے ہی۔ لائق مرتب کی یہ کوشش ان کا یہ تحقیقی ذوق اور تصوف سے یہ دلچسپی بہر حال بڑی قابل قدر اور لائق تحسین ہے۔

لمعات القرآن از شیخ محمد حنیف صاحب کوتواری تقطیع متوسط ضخامت ۴۴ صفحات کتابت وطباعت معمولی قیمت مجلد ۳ روپے۔ پتہ: مصنف کا نام بی/ ۵۹ دل کشا اسٹریٹ کلکتہ ۔ ۱۷

عبادات، معاملات، اخلاق، معاشرت، اور ریاست وغیرہ کے متعلق قرآن مجید میں جو تعلیمات اور احکام وہدایات ہیں شیخ صاحب نے ان کو دو سو چونسٹھ عنوانات پر تقسیم کرکے پہلے ہر عنوان کے متعلق قرآن مجید کی ایک آیت نقل کی ہے اور پھر اس کی تشریح کی ہے۔ تشریح میں مولانا رومی اور ڈاکٹر اقبال کے اکثر حوالے دیئے ہیں۔ قرآن مجید کی تعلیمات حقہ جس عنوان سے بھی کان میں پڑیں۔ بہر حال موجب خیر وبرکت ہیں۔ لیکن غالباً جناب مصنف کی یہ پہلی ہی تصنیف ہے اس لئے اس میں نہ کوئی ترتیب ہے۔ نہ فصول وابواب ہیں۔ نہ زبان میں ہمواری اور یکسانیت ہے اور بھولے پن کا یہ عالم ہے کہ مولانا رومی کے ساتھ ڈاکٹر غلام جیلانی برق کو بھی بزرگان دین میں شمار کرتے ہیں (ص ی) پھر کتابت اور طباعت کی غلطیاں بھی بیشمار ہیں۔ بہر حال موصوف کو قرآن مجید سے جو شغف معلوم ہوتا ہے وہ قابل قدر اور لائق داد ہے۔

جلد ۳۹ شمارہ ۶

دسمبر ۱۹۵۷ء مطابق جمادی الاوّل ۱۳۷۷ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظرات

کل شیء ھالک الا وجھہ

آہ! کیوں کر کہئے کہ فلکِ علم و فضل کا آفتابِ رخشندہ غروب ہوگیا۔ بزمِ انس و قدس کی شمع فروزاں گل ہوگئی۔ درجِ تقویٰ وطہارت کا لعلِ شب چراغ گم ہوگیا۔ شریعت وطریقت کے اسرار و رموز کا محرم جاتا رہا۔ اخلاق ومکارمِ اسلامی کے ایوان میں خاک اڑنے لگی۔ جو کل تک لاکھوں انسانوں کے لئے طبیب عیسیٰ نفس تھا خود وہ موت کی آغوش میں جا سویا۔ ملتِ بیضا کا سہارا، فرزندانِ توحید کی امیدوں کا مرجع، پیروانِ دینِ محمدی کی تمناؤں کا مرکز راہیٔ ملکِ عدم ہوگیا۔ یعنی حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی نے ۵ دسمبر کو بمقام دیوبند ۸۲ برس کی عمر میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

حضرت مولانا کی وفات ایک فرد، ایک شخص اور ایک انسان کی موت نہیں ہے۔ بلکہ ایک خاص دور ایک عہد اور حیاتِ ملی کے صحیفہ کے ایک باب کا اختتام ہے۔ حضرت مولانا گنگوہی اور حضرت شیخ الہند نے اپنے مقدس ہاتھوں سے جو چمن لگایا تھا مولانا اس چمن کی آخری بہار تھے۔ حضرت حاجی امداد اللہ اور مولانا نانوتوی نے شریعت وطریقت علم و عمل اور تقدس وطہارت کی جو بزم سجائی تھی اجل کی بادِ صرصر اس کے چراغ بجھاتی رہی مگر ساتھ ہی چراغ سے چراغ بھی روشن ہوتے رہے اور بزم کبھی تاریک نہیں ہوتی لیکن اب اس بزم کا آخری چراغ بجھ گیا۔ روشنی کی جگہ ظلمت نے لے لی۔ تاریکی چھا گئی اور بزم کی بساط الٹ گئی۔

اسلام میں اعلیٰ اور مکمل زندگی کا تصور یہ ہے کہ تزکیۂ نفس اور تصفیۂ باطن کے ساتھ فکر و نظر کی بلندی اور جہد و عمل میں پختگی اور ہمہ گیری ہو اور یہ سب کچھ تعلق باللہ کے واسطہ سے ہو۔ مولانا اس دور میں اس معیار پر جس طرح پورے اترتے تھے ہند و پاک تو کیا پورے عالم اسلام میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ علم و فضل کا یہ عالم کہ اسرار و غوامض شریعت وطریقت ہر وقت ذہن میں مستحضر۔ کسی سائل نے کوئی مسئلہ پوچھا نہیں کہ

معلومات کا سمندر ابلنے لگا۔ چناں چہ حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات کی طرح حضرت مولانا کے مکتوبات بھی جو کئی جلدوں میں چھپ چکے ہیں اور جو سب کے سب بے ساختہ اور قلم برداشتہ لکھے گئے ہیں، علم و فضل اور حکمت ربانی کا گنجینہ ہیں۔ علوم شریعت و تصوف کے علاوہ تاریخ، جغرافیہ اور سیاسیات کا خاص ذوق اور ان کا وسیع مطالعہ رکھتے تھے۔ بین الاقوامی سیاسیات حاضرہ اور علی الخصوص مشرقی وسطی اور ممالک عربیہ کی سیاسیات پر بڑی گہری اور مبصرانہ نگاہ رکھتے تھے اور اس پر برابر غور و فکر کرتے رہتے تھے، گذشتہ سال کلکتہ میں ناگا قبائل کا تذکرہ آگیا تو مولانا نے ان قبائل کی تاریخ اور ان کی جغرافیائی پوزیشن پر اس قدر عالمانہ اور مبصرانہ تقریر کی کہ سننے والے حیران رہ گئے۔ عربی زبان خالص عربی لب ولہجہ میں بولتے اور گھنٹوں اس میں برجستہ تقریر کرسکتے تھے ترکی زبان سے واقف اور مگدھی زبان سے آشنا تھے۔ اس زبان کے بعض گیت اور اشعار یاد تھے۔ سلوک و معرفت میں یہ حال تھا کہ لاکھوں مسلمانوں نے تجلیۂ باطن کا فیض حاصل کیا۔ اور روحانی مقامات طے کئے۔ مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلویؒ نے ایک مرتبہ عالم جذب میں مولوی ظہیر الحسن ایم۔ اے کاندھلوی مرحوم سے خود ان کے مکان پر فرمایا کہ میاں ظہیر! لوگوں نے مولانا حسین احمد کو پہچانا نہیں۔ خدا کی قسم ان کی روحانی طاقت اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ اگر وہ اس طاقت سے کام لے کر انگریزوں کو ہندوستان سے باہر نکالنا چاہیں تو نکال سکتے ہیں۔ لیکن چوں کہ یہ عالم اسباب ہے اس لئے ان کو ایسا کرنے سے منع کردیا گیا ہے اور اس غرض کے لئے ان کو وہی طریقے اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے جو اس دنیا میں برتے جاتے ہیں۔

جہد و عمل کے میدان میں مولانا کی زندگی سرتاپا ارباب عزیمت کی زندگی تھی۔ مالٹا کی اسارت سے لے کر ملک کی آزادی کے حصول تک یہ زندگی جو ورع و تقدس کی مکمل آئینہ دار تھی ہمیشہ دار و رسن کے خطرات سے کھیلتی رہی۔ مصائب و آلام، اور شدائد و محن کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر ان کا مذاق اڑاتی رہی۔ حضرت شاہ ولی اللہ الدہلوی کے مکتب خیال کے ایک فرد فرید ہونے کی حیثیت سے اپنے مرشد حضرت شیخ الہند کے ساتھ مولانا نے حریت و استخلاص وطن کی راہ میں دار و رسن کو اس وقت لبیک

کہا جب کہ ابھی کانگرس کی زبان کامل آزادی کے لفظ سے آشنا بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس راہ میں طوفان آئے زلزلے آئے۔ بجلیاں کوندیں۔ بگولے اُٹھے۔ کوہ آتش فشاں پھٹ پڑے لیکن یہ مردِ حق آگاہ حق پرست اپنے مقام پر کھڑا رہا اور اس کے پائے ثبات و استقلال میں ذرا جنبش نہ ہوئی۔ سیاسیات میں اس درجہ عملی انہماک و توغل کے باوصف۔ جس کا مقصد وحید بھی دینِ قیم کا احیا اور اعلاء کلمۃ اللہ تھا۔ ظواہر شریعت میں تقشف اور سخت گیری کا یہ عالم تھا کہ اُس مجلس نکاح میں شرکت نہیں فرماتے تھے جس میں عام رسم و رواج کے مطابق دھوم دھڑکا شان دار دعوت۔ مسرفانہ رسوم اور مہر حضرت فاطمہ سے زیادہ مہر باندھا جاتا ہو۔ اگر حسن ظن کی بنا پر کسی ایسی مجلس میں شریک ہو بھی گئے تو جونہی کوئی ایسی بات علم میں آئی فوراً سخت غیظ و غضب کے ساتھ مجلس سے اٹھ کر چلے آئے۔ نشست و برخاست۔ کھانا پینا۔ وضع قطع ہر چیز میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سنن عادیہ تک کا اتباع کرتے اور دوسروں کو اس کی تلقین کرتے تھے۔ دینی اور ملی معاملات کے علاوہ نجی زندگی میں حد درجہ خوش مزاج خندہ جبیں اور شگفتہ طبع تھے۔ مہمان نوازی کی یہ کیفیت تھی کہ دونوں وقت کھانے پر اور ناشتہ پر لوگوں کا ہجوم ہوتا تھا۔ اُن کو کھلا کر قلبی راحت اور سکون محسوس کرتے تھے۔ متواضع اور منکسر المزاج اس درجہ کہ بس عجز و تواضع اور انکسار کا اس سے بڑھ کر تصور ہی نہیں ہو سکتا اس سلسلہ میں مولانا کے بعض واقعات ایسے ہیں کہ قلم کو ان کا ذکر کرتے ہوئے بھی حجاب آتا ہے۔

مولانا جامعیتِ کمالات و اوصاف کے اعتبار سے بے شبہ شیخ العرب والعجم تھے وہ خود تو ۸۲ برس کی عمر میں رفیق اعلیٰ سے جا ملے جس کے لئے کم و بیش پانچ ماہ سے ان کی روح ہر وقت بے چین اور مضطرب تھی لیکن عالم اسلام یتیم ہو گیا۔ مولانا کی وفات ملتِ بیضا کے لئے ایک سخت اور عظیم حادثہ ہے جس کی تلافی کی بظاہر مستقبل قریب میں کوئی امید نہیں۔ "نور اللہ مرقدہ و برد مضجعہ"

علمائے ہند کی کلامی خدمات

از

(جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے - ایل ایل بی - بی ٹی ایچ رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اترپردیش)

(۲)

ہندوستان میں اسلامی ثقافت

عرب فاتحین کی آمد | ہندوستان میں اسلامی ثقافت کا آغاز پہلی صدی ہجری سے ہوتا ہے جب کہ محمد بن قاسم نے ۹۳-۹۶ھ میں سندھ اور ملتان کو فتح کیا اور اس طرح شمالی مغربی ہندوستان قلمروئے خلافت میں شامل ہوا لیکن عرب حوصلہ آزماؤں کی ہندوستانی یورشیں تاریخ اسلام کے آغاز ہی سے شروع ہو چکی تھیں۔ غالباً ۱۵ھ کے کچھ ہی بعد عربوں کے بحری بیڑے نے گجرات کے بندرگاہ تھانہ پر حملہ کیا۔ بلاذری نے فتوح البلدان میں لکھا ہے

"ولّی عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ عثمان بن ابی العاص الثقفی البحرین وعمان سنۃ ۱۵ فوجہ اخاہ الحکم الی البحرین ومضی الی عمان فاقطع جیشاً الی تانہ (تھانہ) فلما رجع الجیش کتب الی عمر یُعلِمہ"[1]

سرزمین ہندوستان پر یہ عربوں کا سب سے پہلا حملہ تھا۔ کچھ دن بعد ایک فوجی مہم بھڑوچ روانہ کی گئی۔ دوسری مہم مغیرہ بن ابی العاص کی سرکردگی میں شہر دیول بھیجی گئی جو کامیاب ہو کر واپس آئی۔ بلاذری نے لکھا ہے

"ووجہ الحکم ایضاً الی بروص (بھڑوچ) ووجہ اخاہ المغیرۃ بن ابی العاص الی خور الدیبل (دیول) فلقی العدو فظفر"[1]

یہ سندھ پر عربوں کا پہلا حملہ تھا۔ اُدھر ایران کی عظیم الشان سلطنت تعجب خیز سرعت کے ساتھ مسلمانوں کے قبضہ میں آ رہی تھی اور بہت ہی قلیل عرصے میں پورا ایران بشمول سجستان، کابل، کرمان و مکران مسلمانوں

---

[1] فتوح البلدان بلاذری ص۴۳۱

کے قبضہ میں آگیا۔ اس طرح قلمروئے خلافت کی سرحدیں ہندوستان کی شمالی مغربی حدود سے مل گئیں چنانچہ ۳۹ھ میں حارث بن مرہ العبدی نے حضرت علی کرم اللہ وجہ کی اجازت سے ارض قیقان پر حملہ کیا وہ کامیاب بھی ہوئے مگر مرکز خلافت کی جانب سے باقاعدہ امداد نہ ملنے کی وجہ سے اس علاقہ پر قبضہ قایم نہ رکھ سکے اور ۴۲ھ میں اپنے رفقا سمیت شہید ہوئے لیکن ۴۴ھ میں مشہور عرب جرنیل مہلب بن ابی صفرہ نے اس علاقہ پر دوبارہ حملہ کیا اور وہ لاہور اور بنوں تک پہنچ گئے۔ بلاذری نے لکھا ہے

"ثم غزا ذلک الثغر المهلب ابن ابی صفرہ فی ایام معاویہ سنہ ۴۴ فاتی بنہ (بنوں) واللاہور وھما بین الملتان وکابل فلقیہ العدو فقاتلہ ومن معہ"[1]

بنوں کی فتح عربی ادب میں آج بھی یادگار ہے۔ ایک یزدی شاعر کہتا ہے ؎

الم تر ان الازد لیلۃ بیتوا ببنۃ کانوا خیر جیش المہلب

سندھ پر عربوں کا باقاعدہ حملہ | اسی طرح فوجی مہمیں اس علاقہ پر مسلسل تاخت و تاراج کرتی رہیں مگر یہ مستقل فتوحات نہ تھیں ان حملوں کی نوعیت محض ہنگامی یورشوں کی تھی سندھ میں عربوں کی باضابطہ حکومت ۹۵ھ سے شروع ہوئی۔ اگرچہ خلیفہ وقت اس دور دراز علاقہ کو فتح کرکے قلمروئے خلافت میں شامل نہیں کرنا چاہتا تھا مگر فرمانروائے سندھ کی ناعاقبت اندیشی نے اُسے مجبور کر دیا اور اپنی حکومت کی بقا کی خاطر اُسے مشرقی ممالک کے گورنر حجاج بن یوسف کو بادل ناخواستہ سندھ پر فوج کشی کی اجازت دینا پڑی۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔

۴۳ھ میں راجہ داہر سندھ کا راجہ ہوا۔ وہ بڑا مدبر اور بہادر تھا مگر دولت و قوت کے نشہ میں مغرور ہو کر وہ کچھ دن بعد بعض غیر اندیشی کی حرکتیں کر بیٹھا اور بلاوجہ عربوں سے لڑائی مول لے لی۔ علافی خاندان جو اسلامی حکومت کا باغی اور مجرم تھا راجہ داہر نے اسے اپنے یہاں پناہ دی۔ اس کے علاوہ وہ ان بحری قزاقوں کی ہمت افزائی کرتا تھا جنہوں نے بحر ہند کے تاجروں پر عافیت تنگ کر دی تھی۔ اس وقت عبدالملک بن مروان خلیفہ تھا اور اُس کی جانب سے مشرقی ممالک میں حجاج

[1] فتوح البلدان للبلاذری ص ۴۳۹

بن یوسف الثقفی گورنر تھا۔ اس دوران میں ایک عرب تاجر کا لنکا میں انتقال ہوگیا وہاں کے راجہ نے متوفی کے ورثاء کو ایک جہاز میں سوار کر کے عرب بھیجا مگران بحری قزاقوں (میدوں) نے اس جہاز کو لوٹ لیا۔ اس جہاز میں قبیلہ بنی یربوع کی ایک عورت تھی جو بے اختیار پکار اٹھی: "واحجاجاہ" جب حجاج کو یربوعی خاتون کی فریاد کا پتہ چلا تو اُس نے بے ساختہ کہا "لبیک" اور راجہ داہر فرمانروائے سندھ سے قیدیوں کی واپسی کی درخواست کی۔ راجہ کے جواب سے مایوس ہو کر حجاج نے بحری راستہ کو محفوظ و مامون کرنے کے لئے خود میدوں کی تادیب کا مصمم ارادہ کر لیا مگر یہ اس وقت تک ناممکن تھا جب تک کہ سندھ کی جانب سے اُن کو پناہ ملنے کی توقعات تھیں۔ لہٰذا مجبور ہو کر اُسے سندھ پر فوج کشی کا تہیہ کرنا پڑا۔

۹۲ھ میں حجاج نے سندھ پر فوج کشی کی ابتدا کی۔ پہلی دو مہمیں ناکام ہوئیں آخر میں اُس نے اپنے چچازاد بھائی محمد بن قاسم کی زیر سرکردگی ایک فوج بھیجی جو کامیاب ہوئی۔ ۹۳ھ میں راجہ داہر مارا گیا اور سندھ قلمروئے خلافت میں داخل ہوا۔ ۹۵ھ میں ملتان بھی فتح ہوا۔ محمد بن قاسم کی فتوحات کا سلسلہ آگے بھی بڑھتا مگر پہلے حجاج اور پھر اُس کے سرپرست ولید بن عبد الملک کا انتقال ہو گیا۔ ولید کے جانشین سلیمان بن عبد الملک کو حجاج اور اُس کے خاندان سے سخت عداوت تھی لہٰذا اُس نے محمد بن قاسم کو معزول کر کے یزید بن ابی کبشہ سکسکی کو والی سندھ مقرر کیا۔ یزید بن ابی کبشہ سندھ پہنچتے ہی مر گیا۔ اُس کے بعد جو لوگ سندھ کے گورنر بنائے گئے وہ زیادہ قابل نہ تھے۔ حالات بھی ناسازگار تھے لہٰذا فتوحات کا سلسلہ تین سو سال تک کے لئے بند ہو گیا مگر ہندوستان کا شمالی مغربی حصہ اسلامی ثقافت کے زیر اثر آگیا۔

اسلامی ثقافت کی سرزمین ہند میں ابتدا محمد بن قاسم نے محض ملک گیری اور استحکام حکومت ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اسلامی ثقافت کی نشر و اشاعت پر بھی خصوصیت سے توجہ کی۔ مفتوحہ علاقوں میں مساجد تعمیر کی گئیں چنانچہ اُس نے حجاج کو اپنی کارکردگی کی جو رپورٹ بھیجی تھی اُس میں اُس کا خاص طور پر تذکرہ تھا:-

"ہر ضروری مقام پر مسجدیں بنادی گئیں جہاں اذان اور خطبے وقت پر ہوتے ہیں"[1]

(1) چچ نامہ ص۵۵ بحوالہ تاریخ سندھ ص۵۰

اس کے علاوہ عرب فاتحین کی بلند کرداری، اخلاق حسنہ اور عدل و انصاف سے لوگ جوق در جوق دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگے۔ انھیں سندھی نومسلموں میں ایک بزرگ تھے جن کا نام چچ نامہ میں "مولانا اسلامی" بتایا گیا ہے۔ جب محمد بن قاسم نے اتمام حجت کے لئے راجہ داہر کے پاس سفارت بھیجی تو اس کی قیادت مولانا اسلامی ہی نے کی۔ سنہ ھ میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ نے ہندوستان کے حکمرانوں کو تبلیغی خطوط بھیجے اور اسلام کی دعوت دی۔ اکثر نے اسلام قبول کرلیا۔ ان میں جلیشہ (جے سنگھ پسر راجہ داہر) بھی تھا۔

سنہ ۱۱۱ھ تک سندھ اور ملتان کا ایک ہی گورنر ہوا کرتا تھا مگر جنید بن عبدالرحمٰن المری والی سندھ کے خراسان تبدیل ہوجانے کے بعد خاص سندھ میں انتشار و ضعف کا دورہ دورہ شروع ہوا۔ غالباً اسی زمانہ میں ملتان کا علاقہ سندھ کی بالادستی سے آزاد ہوگیا۔ محمد بن قاسم نے فتح ملتان کے بعد امیر داؤد بن نصر بن ولید عمانی کو حاکم ملتان بنایا تھا۔ جنید کے بعد شاید امیر داؤد اور اس کی اولاد [بنو منبہ] کی حکومت ہی میں ۳۷۵ھ تک ملتان کا علاقہ رہا اس طرح شمالی مغربی ہندوستان میں اسلامی ثقافت کے دو مرکز ہوگئے۔ سندھ اور ملتان۔

اس دور کے اکابر اہل علم میں سے قاضی موسیٰ بن یعقوب الثقفی کا نام مشہور ہے۔ وہ فاتح سندھ محمد بن قاسم کے ہم قبیلہ تھے اور اپنے علم و فضل کی وجہ سے اپنے اقران میں ممتاز تھے۔ فتح سندھ کے بعد محمد بن قاسم نے انھیں شہر ادور کا قاضی و خطیب مقرر کیا جو سندھ کا پایۂ تخت تھا۔ اس لئے وہی ملک سندھ کے قاضی القضاۃ مقرر ہوئے[1]۔ اُن کے بعد یہ عہدہ مدت تک انھیں کے خاندان میں رہا۔ ہر قاضی کو عہدۂ قضا کے علاوہ

"الصدر الامام الاجل بدر الملۃ والدین سیف السنۃ ونجم الشریعۃ"

کا خطاب بھی حاصل ہوتا تھا۔

عباسی خلافت اور سندھ میں شیعیت کی ابتدا	۱۳۲ھ میں امویوں کے زوال پر عباسی برسر اقتدار آئے اور سندھ بھی عباسی خلافت میں داخل ہوا۔ عہد اموی کا آخری والی سندھ منصور بن جمہور کلبی تھا جو غاصبانہ

[1] چچ نامہ صفحہ ۶ بحوالہ تاریخ سندھ صفحہ ۳۵۶

طور پر سندھ کا حاکم بن بیٹھا تھا مگر ابو مسلم خراسانی نے ابو العباس سفاح کی جانب سے مغلس عبدی کو حاکم سندھ بنا کر بھیجا۔ مغلس ناکام ہوا اور ابو مسلم نے موسیٰ بن کعب تمیمی کو سندھ کا والی بنا کر بھیجا جس نے جا کر سندھ کی حکومت سنبھال لی اور منصور بن جمہور کا استیصال کر دیا وہ سنہ ۱۳۴ھ سے سنہ ۱۴۰ھ تک سندھ کا گورنر رہا۔ اُس کے بعد منصور نے عمر بن حفص کو جو "ہزار مرد" کے نام سے مشہور تھا سندھ کا والی بنا کر بھیجا۔

عباسی علویوں کے نام سے برسر اقتدار آئے تھے جب وہ خلیفہ ہو گئے تو علویوں کو بھی مایوسی ہوئی اور عالم اسلام میں بھی غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ علویوں نے جا بجا اپنے حق کا مطالبہ کیا جس کی جمہور اہلِ سلام نے ہر جگہ تائید کی۔ حجاز میں نفس زکیہ نے اور کوفہ میں اُن کے بھائی ابراہیم نے خروج کیا۔ سندھ میں بھی اُن کے دعاۃ پہنچے۔ عمر بن حفص کا میلان اہل بیت کی جانب تھا لہٰذا اس نے عبداللہ الاشتر کی جو ان دعاۃ کی قیادت کر رہے تھے بڑی آؤ بھگت کی اور اُن کی دعوت کو پوشیدہ طور پر قبول کر لیا۔

لیکن اس دوران میں حجاز اور عراق میں علوی بغاوت ناکام ہو گئی۔ نفس زکیہ اور ابراہیم دونوں مارے گئے۔ یہ خبر سندھ میں بھی پہنچی اس لئے وہاں کوئی سیاسی انقلاب برپا نہ ہو سکا۔ البتہ عمر بن حفص نے عبداللہ الاشتر کو ایک ہمسایہ راجہ کے یہاں بغرض حفاظت بھیج دیا جہاں وہ نہایت اطمینان سے زیدیہ فرقے کے عقائد کی اشاعت کرنے لگے۔ خلیفہ منصور کو جب یہ معلوم ہوا تو اُس نے عمر بن حفص کو سندھ سے بدل کر افریقہ کا گورنر بنا دیا اور ہشام بن عمر تغلبی کو سندھ کا گورنر بنا کر بھیجا۔ ہشام بھی اہل بیت کا طرفدار تھا مگر اتفاقی طور پر عبداللہ الاشتر شاہی فوج کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔

شیعی دعاۃ کے ساتھ ساتھ خارجی دعاۃ بھی عمان سے سندھ پہنچے۔ اُن کا بڑا مبلغ حسان بن مجالد ہمدانی تھا۔ مگر عمر بن حفص کی بیدار مغزی کی وجہ سے خارجی دعاۃ کو کچھ کامیابی نہ ہوئی۔

منصور کی وفات پر اس کا بیٹا مہدی سریر آرائے خلافت ہوا۔ اُس کا عہد ملاحدہ و زنادقہ کے استیصال اور متکلمین کی ہمت افزائی کے لئے مشہور ہے۔ تخت نشین ہونے کے کچھ دن بعد مہدی نے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کی طرح شاہانِ وقت کو تبلیغی خطوط بھیجے اور اسلام کی دعوت دی۔ بہت سے بادشاہوں نے

اسلام قبول کرلیا۔ ان میں ایک سندھ کا راجہ تھا اور دوسرا لپشاور کا۔

کچھ عرصے بعد سندھ کے عرب خاندانوں میں یمنی و نزاری تعصب نے خانہ جنگی کی شکل اختیار کرلی۔ مرکز خلافت سے جو گورنر بھی بھیجا گیا۔ ناکام ہوا۔ آخر کار ۲۲۲ھ میں متوکل باللہ نے مجبور ہو کر ایک مقامی امیر عمر بن عبد العزیز الحباری کو سندھ کا نیم خود مختار حاکم تسلیم کرلیا۔ اس کے بعد تاریخ سندھ و ہند کا نیا دور شروع ہوا۔

علم و ادب کی ترقی میں سندھیوں کا حصہ | عرب محض کشور کشا فاتحین ہی نہ تھے وہ جہاں گئے اپنا مخصوص دین، اپنی مخصوص ثقافت اور اپنے مخصوص علوم بھی ساتھ لے کر گئے۔ عربوں نے اپنی ثقافت کی نشر و اشاعت میں جو بھی کوشش کی ہو مگر اس سے زیادہ تعجب سندھ کی قوت اخذ و قبول پر ہے۔ سندھ ایک بنجر ریگستانی علاقہ تھا اور اس حیثیت سے وہاں کی ثقافتی عظمت اور باشندگان سندھ کی تہذیب و مدنیت کے لئے صلاحیت ضروری نہیں ہے مگر ملک نے حیرت انگیز سرعت کے ساتھ فاتحین کے ثقافتی رنگ کو قبول کرلیا اور جن لوگوں نے عربی علوم کی ترقی میں حصہ لیا اُن کی صف اول میں سندھیوں کا نام نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ وقت کا سب سے اہم علم حدیث تھا۔ دوسرا علمی مشغلہ جس میں عرب اور ان کی تقلید میں نومسلم غیر عرب اپنی ذہانت و فطانت کے جوہر دکھاتے تھے شعر و شاعری تھا۔ مگر مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے علمی ولولوں نے انھیں علوم پر قناعت نہیں کی بلکہ "الکلمۃ الحکمۃ ضالۃ المومن فحیث وجدھا فھو احق بھا" کے مصداق علم و حکمت کی متاع گم گشتہ جہاں بھی مل سکی تلاش کر کے اُسے عربی زبان میں منتقل کیا اور اس طرح علوم و فنون کی ترقی میں زیادہ سے زیادہ حصہ لینے کی کوشش کی۔

دینی علوم | اس عہد کے محدثین میں ابو معشر نجیح بن عبد الرحمٰن السندی کا نام خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ سمعانی نے کتاب الانساب میں لکھا ہے۔

"ابو معشر نجیح بن عبد الرحمٰن السندی المدینی مولی اُم موسیٰ من اھل المدینۃ واُم موسیٰ ھی اُم المھدی	ابو معشر نجیح بن عبد الرحمٰن السندی المدینی اُم موسیٰ کے آزاد کردہ غلام مدینہ کے باشندے تھے اور اُم موسیٰ مہدی کی ماں کا نام ہے وہ محمد بن عمر، نافع اور ہشام بن

یروی عن محمد بن عمرو ونافع و
هشام بن عروة - روی عنه
العراقیون - قال ابونعیم کان
ابومعشر سندیا وکان رجلا
الکن وکان یقول حدثنا محمد
بن قعب یرید کعب مات سنة
سبعین ومایة فی شهر رمضان
وصلی علیه الرشید[1]

عروہ سے روایت کرتے ہیں اور اُن سے اہل عراق نے روایت کی ہے - ابونعیم نے کہا ہے ابومعشر سندی تھے اور ہکلے تھے اور کہا کرتے تھے "حدثنا محمد بن قعب" (بجائے کعب) انھوں نے رمضان ۱۷۰ھ میں وفات پائی اور ہارون نے اُن کی نماز جنازہ پڑھائی۔

حدیث کے علاوہ ابومعشر کو فقہ اور سیر و مغازی میں بھی دستگاہ عالی حاصل تھی - ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے۔

ابومعشر السندی المدنی الفقیه
صاحب المغازی هو نجیح بن عبد الرحمن
...... کان من اوعیة العلم
علی نقص فی حفظه[2]

ابومعشر سندی الاصل مدینہ کے رہنے والے فقیہ اور مغازی و سیر کے عالم تھے - اُن کا نام نجیح بن عبدالرحمن ہے ...... اگرچہ حافظہ اُن کا کمزور تھا پھر بھی وہ علم و فضل کے مخزن تھے۔

ابومعشر کی تاریخ دانی کے متعلق ابن الندیم الفہرست میں لکھتا ہے

"نجیح المدنی ابومعشر ......
عارف بالاحداث والسیر
واحد المحدثین ......
وله من الکتب کتاب المغازی"[3]

نجیح - مدینہ کے رہنے والے ابومعشر کنیت - وقائع اور سیر کے جاننے والے تھے اور محدثین میں سے تھے ...... اُن کی کتابوں میں سے ایک کا نام کتاب المغازی ہے۔

علم حدیث میں ابومعشر کے کمال کا اندازہ اُن مشاہیر محدثین کے اسماء گرامی سے ہوگا جن کے سامنے انھوں نے

[1] کتاب الانساب للسمعانی ورق ۳۱۴ [2] تذکرۃ الحفاظ للذہبی جلد اول ص ۲۱۲ [3] الفہرست لابن الندیم ص ۱۳۶

زانوئے تلمذتہ کیا - ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے -

"رای اسامۃ بن سہل وروی عن محمد بن کعب القرظی وموسیٰ بن یسار ونافع وابن المنکدر ومحمد بن قیس وطائفۃ" [1]

معاصر محدثین میں وہ جس قدر و منزلت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اس کا اندازہ اُن کے شاگردوں کے نام سے ہوگا - ذہبی نے لکھا ہے :-

"حدث عنہ ابنہ محمد وعبدالرزاق وابونعیم ومحمد بن بکار ومنصور بن ابی مزاحم وطائفۃ" [2]

ابو زرعہ نے انھیں "صدوق" بتایا ہے اور امام نسائی نے باوجود تضعیف کے اُنھیں قابل اعتماد سمجھا ہے"

"قال ابوزرعہ صدوق وقال النسائی لیس بالقوی قلت قد احتج بہ النسائی" [3]

ابو معشر کے صاحبزادے ابو عبدالملک محمد بن ابی معشر بھی بڑے محدث تھے - سمعانی نے کتاب الانساب میں لکھا ہے -

وابو عبدالملک محمد بن ابی معشر نجیح بن عبدالرحمن المدینی السندی سبق ذکر الدہ محمد ھذا اشخصہ المھدی من المدینۃ الی بغداد فسکنھا واعقب بھا رای ابن ابی ذیب وابابکر الھذلی وسمع من ابیہ کتاب المغازی وغیرہ - روی عنہ ابناہ داؤد والحسن وابوحاتم محمد بن ادریس الرازی محلہ الصدق	ابو عبدالملک محمد بن ابی معشر نجیح بن عبدالرحمن مدینی و سندی - اُن کے والد کا ذکر گزر چکا ہے - ان محمد (بن ابی معشر) کو خلیفہ مہدی نے مدینہ منورہ سے بغداد بھیج دیا جہاں وہ جاکر آباد ہوگئے اور اُن کی اولاد بھی وہاں باقی رہی - انھوں نے ابن ابی ذیب اور ابا بکر ہذلی کو دیکھا تھا اور اپنے باپ سے کتاب المغازی اور دوسری کتابوں کو سنا تھا - اُن سے ان کے بیٹوں داؤد اور حسن نے نیز ابوحاتم محمد بن ادریس الرازی نے روایت کیا ہے - اُن کی صدق بیانی مسلم ہے ..... ننانوے سال کی

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد اول ص ۲۱۲ [2] ایضاً ص ۲۱۲ [3] ایضاً ص ۲۱۲

۔۔۔۔ مات فی سنة ۲۴۴ھ وھو ابن تسع وتسعین سنة[1] عمر میں ۲۴۴ھ میں وفات پائی۔

امام اوزاعی بھی سندی الاصل تھے چنانچہ حافظ شمس الدین الذہبی نے تذکرة الحفاظ میں لکھا ہے:

"واصلہ من سبی السند"[2] امام اوزاعی کا علم وفضل بیان سے مستغنی ہے۔ سندھ کے اس جلیل القدر فرزند کے بارے میں ذہبی نے نقادانِ فن کی یہ رائیں نقل کی ہیں:۔

"قال اسمٰعیل بن عیاش سمعتھم یقولون سنة اربعین ومائة الاوزاعی الیوم عالم الامة وقال الخریبی کان الاوزاعی افضل اھل زمانہ"[3]	اسمٰعیل بن عیاش نے کہا کہ میں نے لوگوں کو ۱۴۰ھ میں کہتے ہوئے سُنا کہ آج امت کا عالم اوزاعی ہے۔ خریبی نے کہا ہے کہ اوزاعی اپنے زمانہ میں سب سے افضل تھے۔

شعر وشاعری اسی طرح شعر وشاعری میں بھی فرزندانِ سندھ نے عربی زبان کے شعراء مفلقین کے درمیان ایک بلند مقام حاصل کیا۔ ان میں گل سرسبد ابوعطاء السندی ہے جسے ابوتمام کی جوہر شناس نگاہوں نے بے شمار شعراءِ عربیت میں سے منتخب کر کے حماسہ کی تدوین میں درخورِ اعتنار سمجھا۔ سمعانی نے لکھا ہے:۔

"ابوعطاء السندی شاعر معروف ذکر شعرہ ابوتمام فی الحماسة"[4]	ابوعطاء السندی مشہور شاعر ہے۔ ابوتمام نے حماسہ میں اُس کے اشعار بیان کئے ہیں۔

اس سندی الاصل شاعر کے متعلق ابوالفرج اصفہانی نے کتاب الاغانی میں لکھا ہے:۔

"ابوعطاء اسمہ افلح بن یسار مولی بنی اسد ثم مولی عنترہ بن سماک بن حصین الاسدی منشاہ الکوفة وھو من مخضرمی الدولتین مدح بنی امیہ وبنی ھاشم وکان	ابوعطاء کا نام افلح بن یسار تھا وہ پہلے بنی اسد کا پھر عنترہ بن سماک بن حصین الاسدی کا مولی تھا۔ اُس کا مولد ومسکن کوفہ ہے اس نے دونوں دولتوں (بنو امیہ اور بنو عباس) کا زمانہ دیکھا تھا۔ بنو امیہ اور بنو ہاشم کی مدح میں قصیدے لکھے۔ اُس کا باپ یسار سندی تھا

[1] کتاب الانساب ورق ۱۳۰ [2] تذکرة الحفاظ جلد اول ص ۱۶۱ [3] ایضاً ص ۱۶۱ [4] کتاب الانساب ورق ۳۱۳

ابوہ یسار سندیا اعجمیا لا یفصح وکان فی لسان ابی عطاء لکنۃ شدیدۃ ولثغۃ[۱]	جو صحیح عربی نہیں بول سکتا تھا ابو عطار کی زبان میں بہت زیادہ لکنت اور لثغہ تھا۔ ز ہکلاتا تھا حرفوں کا صحیح تلفظ ادا نہ کر سکتا تھا۔ ر کو نہیں نکال سکتا تھا)

ابو الفرج اصفہانی آگے چل کر لکھتا ہے :-

"کان ابو عطاء من شعراء بنی امیہ ومداحهم والمنقطعی الهوی الیهم وادرک دولۃ بنی العباس فلم تکن لہ فیها نباهۃ فهجاهم وفی اخر ایام المنصور مات۔ وکان مع ذلک من احسن الناس بدیهۃ واشدهم عارضۃ وتقدما وشهد ابو عطاء حرب بنی امیہ وبنی العباس"[۲]	ابو عطار بنو اُمیہ کے شعرا مدح گستروں اور طرفداروں میں سے تھا۔ اُس نے عباسی خلافت کا زمانہ بھی پایا تھا لیکن وہاں اُس کی قدر افزائی نہیں ہوئی تو اُس نے ان کی ہجو کی اُس نے منصور عباسی کے آخر عہد خلافت میں وفات پائی۔ معہذا وہ بڑا تیز اور عمدہ بدیہہ گو تھا۔ ابو عطار بنو امیہ اور بنو عباس کی جنگ میں بھی شریک ہوا تھا۔

خالص عربی النسل شاعروں سے اُس کا مقابلہ تھا مگر ابو عطار کو غیر معمولی کامیابی ہوئی اُس کے ممدوحین میں ابن ہبیرہ جیسے اُمرا کبار تھے جنہوں نے دل کھول کر اُس کی قدر دانی کی اور بڑی فراخ دلی سے صلات و جوائز کے ساتھ اُسے نوازا۔ اس شاعرانہ کمال کی بدولت وہ اہل ثروت میں محسوب ہونے لگا یہاں تک کہ آزاد کنندگان اُس کی ملکیت کا دعویٰ کرنے لگے اور اُس نے چار ہزار درہم دے کر اُن سے اپنا پنڈ چھڑایا۔ ابو الفرج اصفہانی کہتا ہے :-

"کثر مال ابی عطاء السندی بعد ان أعتق فاعنتہ موالیہ وطمعوا فیہ وادعوا رقہ فشکا	آزادی حاصل کرنے کے بعد ابو عطار السندی کی دولت بہت بڑھ گئی۔ تو اُس کے آزاد کنندگان نے اُسے پریشان کرنا شروع کیا وہ اس کی دولت میں طمع رکھتے تھے

[۱] کتاب الاغانی لابی الفرج الاصفہانی جلد شانزدہم صـ۸۰۔ ابن قتیبہ نے اُس کا نام مرزوق بتایا ہے دیکھئے الشعر والشعراء صـ۱۲۹
[۲] اغانی جلد شانزدہم صـ۷۹

ذلک الی اخوانہ فقالوا لہ کاتبھم
فکاتبوہ علی اربعۃ آلاف . . . .
فادی فی مکاتبتہ وعتق"[1]

لہذا انھوں نے اُس کی غلامی کا دعویٰ کیا۔ اس کی اُس نے اپنے بھائی بندوں سے شکایت کی تو انھوں نے اُن سے مکاتبت کا مشورہ دیا۔ اس پر اس سے انھوں نے چار ہزار پر مکاتبت کرلی۔ اُس نے یہ رقم ادا کردی اور آزاد ہوگیا۔

لیکن اس مدح گستری کے پیشہ کے باوجود ابوعطار کا کردار بلند تھا۔ اُس نے ممدوحین کی مدح وستائش خلوص کے ساتھ کی اور اُن کی بربادی کے بعد بھی اُن کی محبت اُس کے دل میں جاگزیں رہی۔ جیسا کہ وہ خود کہتا ہے ؎

الیس اللہ یعلم ان قلبی — یحب بنی امیۃ ما استطاعا
وما بی ان یکون اھل عدل — ولکنی رأیت الامر ضاعا[2]

برامکہ کے زوال کے بعد کسی نے اُس کے مدح گستروں سے پوچھا کہ جو زور کلام تمھاری مدح میں ہوتا تھا وہ مرثیوں میں نہیں ہے، انھوں نے جواب دیا کہ مدح اُس کی بخشش لکھواتی تھی اور مرثیہ صرف وضعداری۔ لیکن ابوعطار کے مراثی اس رسمی وضع داری سے بلند ہیں۔ وہ تو عباسیوں کے عدل و انصاف پر بھی امویوں کے جور وستم کو ترجیح دیتا تھا ؎

فلیت جور بنی مروان عادلنا — ولیت عدل بنی العباس فی النار[3]

اپنے ممدوح ابن ہبیرہ کے قتل کے بعد جب کہ اُس کے جود و کرم کی کوئی اُمید نہیں رہی تھی جس طرح اُس نے اُس کا مرثیہ لکھا ہے اُس سے اُس کے خلوص کا اندازہ ہوتا ہے ؎

الا ان عیناً لم تجد یوم واسط — علیک بجاری دمعھا لجمود
عشیۃ قام النائحات وشققت — جیوب بایدی ماتم وخدود
فان تمس مھجور الفناء وربما — اقام بہ بعد الوفود وفود

---

[1] اغانی جلد شانزدہم صفحہ [2] ایضاً صفحہ [3] ایضاً صفحہ

فانك لم تبعد على متعهد بلى كل من تحت التراب بعيد[1]

باوجود سندی الاصل ہونے کے ابوعطار نے عربی زبان پر یہ قدرت بہم پہنچائی تھی کہ اُس کا کلام شعرائے عرب کے کلام سے ٹکر کھاتا تھا۔ ابوالفرج نے مدائنی سے روایت کی ہے کہ ابراہیم بن الاشتر نے ابوعطا کے پاس یہ دو شعر بھیجے تھے اور درخواست کی تھی کہ اسی قافیہ اور اسی حرف روی کے ساتھ اس پر اور شعر کہہ دے ؎

وبلدة يزدهي الجنان طارقها قطعتها بكناز اللحم معتاطه

وهنا وقد حلق النسران او كربا وكانت الدلو بالجوزاء منتاطه

ابوعطار نے یہ دو شعر لکھ کر بھیجے۔ اصل سے موازنہ کیجئے، عربی وعجمی کا امتیاز ناممکن ہے ؎

فانجاب عنها قميص الليل فابتكرت تسير كالفحل تحت الكور لطاطه

في اينق كلما حث الحداة لها بدت مناسمها هوجاً حطاطه[2]

عربوں نے سندھ کو ۹۵ھ میں فتح کیا ابوعطار کی شاعری کا دور بنی اُمیہ کے زوال (۱۳۲ھ) سے قبل زمانہ سے متعلق ہے یعنی تیس ۳۰ پینتیس ۳۵ سال کی قلیل مدت میں سندھ کی اخاذ طبیعت نے عرب کے رنگ کو اس خوبصورتی سے قبول کر لیا کہ اُس کے شاعر عرب کے شاعروں میں اور اُس کے علماء وہاں کے علماء میں مل گئے۔ ابھی سندھی باکمالوں کا لہجہ بھی درست نہ ہونے پایا تھا کہ وہ صف اول کے شعراء میں محسوب ہونے لگے۔ یاقوت معجم البلدان میں ابونعیم سے ابومعشر کے اس عجیب لہجہ کے متعلق روایت کرتا ہے

"قال ابو نعیم کان ابو معشر سندیاً ولكن الكن وكان يقول حد ثنا محمد بن قعب يريد كعب"[3]

ابونعیم نے کہا ہے کہ ابومعشر سندی تھا لیکن ہکلا تھا اور کہا کرتا تھا "حد ثنا محمد بن قعب" (بجائے کعب کے)

اسی طرح ابن قتیبہ نے کتاب الشعر والشعراء میں لکھا ہے کہ ابوعطار جرادہ کو "زرادہ" زج کو "زز" اور شیطان کو "سیتان" کہتا تھا[4]

---

[1] حماسہ باب المراثی ص [2] اغانی جلد شانزدہم ص۸۱ [3] معجم البلدان جلد خامس ص۱۵۱ [4] کتاب الشعر والشعراء لابن قتیبہ ص۱۲۹

اس کے باوجود اس کے اشعار اگر عرب شعراء کے اشعار کے دوش بدوش رکھ دیے جائیں تو امتیاز دشوار ہو جائے۔ ذیل کے اشعار میں "رنگ حماسیت" کس درجہ نمایاں ہے جو عرب شاعری کا امتیازی شعار ہے "موت سے بے پروائی اور معصوم محبت کا "حسن امتزاج" عرب کا حماسی شاعر ہی پیش کرسکتا تھا

ذکرتک والخطی یخطر بیننا وقد نہلت منا المثقفۃ السمر

فواللہ ما ادری وانی لصادق اداء عرانی من حبابک ام سحر

فان کان سحرا فاعذرینی علی الھوی وان کان داء غیرہ فلک العذر[1]

علوم دخیلہ اسلامی علوم کی تیسری شاخ "علوم دخیلہ" پر مشتمل ہے جن سے مراد دیگر اقوام کے علوم ہیں جنہیں عربوں نے اپنی زبان میں منتقل کرکے ترقی دی جیسے منطق، فلسفہ، ریاضی، ہیئت، نجوم اور طب وغیرہ۔ اموی عہد میں اس جانب کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ امویوں کے بانوے سالہ عہد حکومت میں صرف خالد بن یزید کا نام ملتا ہے جس نے کیمیا کی کتابوں کا خصوصیت سے عربی میں ترجمہ کرایا۔ ابن الندیم خالد بن یزید کے بارے میں لکھتا ہے

"وھو اول من ترجم لہ کتب الطب والنجوم وکتب الکیمیاء"[2]

(وہ پہلا شخص ہے جس کے واسطے طب، نجوم اور کیمیا کی کتابوں کے ترجمے کیے گئے)

لیکن عباسیوں نے تخت خلافت پر متمکن ہو کر علم وحکمت کی سرپرستی کو اپنا مشغلہ بنایا اور ان کی ہمت افزائی سے دیگر اقوام وملل کی کتابیں عربی زبان میں منتقل ہونا شروع ہوئیں۔ یہ سلسلہ دوسرے عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور (۱۳۶ - ۱۵۸) کے عہد سے شروع ہوتا ہے۔ اس کی تفصیل ہمارے موضوع سے خارج ہے مگر جن لوگوں نے اس علمی تحریک میں خدمات شائستہ انجام دی ہیں ان میں فرزندان سندھ کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اُن کی مساعی جمیلہ سے ہندوستان کے قدیم علوم مسلمانوں تک پہنچے۔

---

[1] حماسہ باب الحماسہ صفحہ ۱۶ [2] الفہرست لابن الندیم صفحہ ۴۹۷

سنہ ۱۵۶ھ میں ہندوستانی پنڈتوں کا ایک وفد بغداد پہنچا اور منصور کی خدمت میں باریاب ہوا۔ یہ وفد جو علمی تحفے دربارِ خلافت میں پیش کرنے کے لئے لے گیا تھا اُن میں "سوریہ سدھانت" کا ایک نسخہ بھی تھا جس کا عربی ترجمہ السندھند کے نام سے مدتوں عرب ہیئت دانوں میں مستعمل رہا ابن القفطی مشہور ہیئت داں ابن الکدمی سے نقل کرتا ہے

"وقد ذكر الحسين بن محمد بن حميد المعروف بابن الكدمي في زيجه الكبير المعروف بنظم العقد انه قدم على الخليفة المنصور في سنة ست وخمسين ومائة رجل من الهند قيم بالحساب المعروف بالسندهند في حركات النجوم .... فامر المنصور بترجمة ذلك الكتاب الى العربية ...... فتولى ذلك محمد بن ابراهيم الفزاري وعمل منه كتابا يسميه المنجمون السندهند الكبير ...... وكان اهل ذلك الزمن اكثر من يعملون به الى ايام الخليفة المامون فاختصره له ابو جعفر محمد بن موسى الخوارزمي وعمل منه

حسین بن محمد بن حمید معروف بابن الکدمی نے اپنی بڑی زیج میں جو نظم العقد کے نام سے مشہور ہے ذکر کیا ہے کہ ۱۵۶ھ میں خلیفہ منصور کے دربار میں ہندوستان کا ایک شخص آیا جو حرکات نجوم کے ضبط کے بارے میں سندھانت کے علم سے واقف تھا..

....

منصور نے اس کتاب (سوریہ سدھانت) کے عربی میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا ...... محمد بن ابراہیم الفزاری اس پر مامور ہوا اور اس نے وہ کتاب تیار کی جسے ہندوستانی ہیئت داں بڑا سدھانت کہتے ہیں .... اس زمانہ کے لوگ خلیفہ مامون کے وقت تک اکثر اسی (سدھانت) پر عمل کرتے رہے (مامون کے عہد میں) ابو جعفر محمد بن موسیٰ الخوارزمی نے سدھانت کو مختصر کیا اور اس سے اپنی مشہور زیج کو تیار کیا جسے اس زمانہ کے لوگوں نے بہت پسند کیا..

...... یہ کتاب ہمارے زمانہ (ساتویں صدی تک) علمائے ہیئت میں مقبول ہے۔

زیجہ المشہور فاستحسنہ اہل ذلک

الزمان ...... وما زال نافعاً عند

اہل العنایۃ بالتعدیل الی زماننا ہذا“[1]

منصور کے بعد مہدی اور مہدی کے بعد ہادی سریر آرائے خلافت ہوا مگر اُس نے سال بھر بعد ہی وفات پائی۔ ہادی کے بعد ہارون تخت خلافت پر بیٹھا اُس کا عہد حکومت برامکہ کی علمی سرپرستیوں کے لئے مشہور ہے۔ یہ ایک علم دوست خاندان تھا اور چونکہ اصلاً ہندی نژاد تھا اس لئے اُسے ہندوستانی علوم کے ساتھ والہانہ محبت تھی یحییٰ بن خالد البرمکی نے ایک شخص کو ہندوستان بھیجا تاکہ وہاں کی جڑی بوٹیوں کے متعلق تحقیقات کرے اور ہندوستان کے ادیان و مذاہب کے متعلق اطلاع فراہم کرے۔ ابن ندیم کہتا ہے:۔

”ان یحییٰ بن خالد البرمکی بعث برجل الی الہند لیاتیہ بعقاقیر موجودۃ فی بلادہم وان یکتب لہ ادیانہم“[2]

ابن الندیم آگے چل کر یحییٰ کی علمی سرپرستی اور ہندوستانی علوم سے شغف کے بارے میں لکھتا ہے

”الذی عنی بامر الہند فی دولۃ العرب یحییٰ بن خالد وجماعۃ البرامکۃ واہتمامہا بامر الہند واحضارہا علماء طبہا وحکمائہا“[3]

عربوں کے زمانۂ حکومت میں جس شخص نے ہندوستان کے حالات معلوم کرنے کے ساتھ اعتنا کیا وہ یحییٰ بن خالد ہے برمکی خاندان کے دوسرے افراد نے بھی اس کے ساتھ اعتناء برتی۔ انھوں نے ہندوستان کے طبیبوں اور حکیموں کو بلایا۔

ہندوستان کے جن اطباء کو یحییٰ بن خالد نے بلایا اُن میں دو شخصوں کے نام بہت زیادہ مشہور ہیں منکہ ہندی اور صالح بن بہلہ۔ ان دو طبیبوں نے معرکے کے علاج کرکے ہندوستانی طب کا سکہ جما دیا۔ منکہ نے ہارون الرشید کا[4] اور صالح بن بہلہ نے ابراہیم بن صالح کا علاج کیا جو ہارون الرشید کا چچا زاد بھائی تھا۔ ابراہیم بن صالح تو بظاہر مر چکا تھا۔ اُسے کفن بھی پہنا دیا گیا تھا مگر صالح نے اُس کے اس خطرناک سکتہ کا علاج

[1] اخبار العلماء باخبار الحکماء ص۱۷۸-۱۷۷ [2] الفہرست لابن الندیم ص۴۸۸ [3] ایضاً ص۴۸۸ [4] طبقات الاطباء لابن ابی اصیبعہ جلد دوم ص۳۳

کیا۔[۱] دربار خلافت میں جندی سابور کے منظور کی اطبار چھائے ہوئے تھے مگر خود جندی سابور کے طبی مدرسہ میں ساسانیوں کے عہد میں ہندوستانی طب داخل ہو چکی تھی چنانچہ بعد کے لوگوں میں ابوبکر محمد بن زکریا الرازی نے کتاب الحاوی میں ہندوستانی ویدک کی کتابوں سے بہت کچھ نقل کیا ہے۔ غرض ویدک کی متعدد کتابوں کا اس زمانے میں عربی کے اندر ترجمہ ہوا مثلاً کتاب سرد، کتاب چرک، کتاب سندستاتی کتاب اسماء عقاقیر الہند، کتاب مختصر للہند فی العقاقیر، کتاب علاجات الحبالی للہند، کتاب توفشتل کتاب روساء الہندیہ، کتاب السکر للہند، کتاب رای الہندی فی اجناس الحیات وسموہا، کتاب التوہم فی الامراض والعلل لتوفشتل الہندی[۲]

سنسکرت سے عربی میں ترجمہ کرنے والے مترجمین میں ابن الندیم نے دو شخصوں کا خصوصیت سے نام لیا ہے۔ منکہ ہندی اور ابن دھن جس کے انتظام میں برامکہ کا شفاخانہ تھا۔[۳]

---

[۱] اخبار العلماء باخبار الحکماء ص۱۴۷ وطبقات الاطباء جلد دوم ص۳۵ [۲] الفہرست لابن الندیم ص۴۲۲ [۳] ایضاً ص۳۲۲

(باقی آئندہ)

حسّان بن ثابت اور اُن کی شاعری

از

(جناب چوہدری غلام احمد صاحب ایم۔ اے لکچرار اسلامیہ کالج لائل پور)

"یہ مقالہ پاکستان اورینٹیل کانفرنس لاہور مورخہ ۲۸ ستمبر ۱۹۵۶ء کے موقع پر پڑھا گیا"

عرب اور شعر و شاعری فرانسیسی مصنف لیبان نے کیا خوب کہا کہ کل تمدن عرب کے زمانہ میں شاعری کا چرچا رہا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کبھی اس عروج پر نہ پہنچی جو اس نے جاہلیت میں حاصل کیا تھا۔ تمام اہلِ عرب خواہ وہ کسی شعبۂ زندگی سے وابستہ ہوں شعر و شاعری سے مانوس تھے اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اکیلے عربوں کا منظوم کلام تمام دنیا کے منظوم کلام کے برابر ہے۔ انھیں نظم کا اس قدر شوق تھا کہ وہ بعض اوقات فقہ فلسفہ اور جبر و مقابلہ کو بھی نظم ہی میں لکھتے اور ان کے اکثر قصص و حکایات میں نظم و نثر ملی ہوتی ہے تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ ردیف و قافیہ یورپ میں عربوں ہی سے آیا۔

عربوں میں شاعری اس درجہ مرغوب خاص و عام تھی کہ اس زمانہ میں شاعروں کا بڑا زور تھا۔ وہ اپنی نظم کے ذریعہ سے جب چاہتے جوشِ مخالفت پیدا کر دیتے۔ شعر کی تاثیر کا یہ عالم تھا کہ قریش نے اعشیٰ شاعر کو سو اونٹ محض اس لئے دئے کہ وہ ان مدحیہ اشعار کی اشاعت نہ کرے جو اس نے نبی اکرم صلعم کی تعریف میں کہے تھے اس نامور یوروپین مستشرق کی شہادت اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ دورِ جاہلیت کے عرب اُمّی ہونے کے باوجود اپنے دماغی کارناموں کے باعث اس وقت کی بہت سی قوموں پر فوقیت رکھتے تھے۔ یہ لوگ ناخواندہ غیر مہذب و ناشائستہ تھے مگر ان کی زبان نہایت فصیح و بلیغ تھی۔ یہ ریگستان اور سنگلاخ زمین کے رہنے والے تھے لیکن ان کی خطابت و شاعری کشمیر کی آب و ہوا کی طرح تر و تازہ اور پر رونق و شاداب تھی جہاں ان کے جذبات و احساسات کو ذرا ٹھیس لگی پھر ان کی آتش دہانی و دریا بیانی کی کچھ حد نہیں رہی۔ ڈیڑھ ہزار سال گذرنے کے باوجود ان کے کلام کی تازگی و نضارت شستگی و بلاغت ایسی ہی موثر ہے جیسی کہ اس تاریک زمانہ میں تھی۔

دورِ جاہلیت کی تقریباً دو صدیوں کا کلام مدوّن ہو کر ہم تک پہنچا ہے لیکن اس کا ذخیرہ اتنا بڑا ہے کہ کسی متمدن قوم نے صدیوں میں بھی جمع نہیں کیا۔ اگر علمائے ادب کی یہ روایت ٹھیک ہے تو ابو تمام مؤلف حماسہ کو زمانہ جاہلیت کی چودہ ہزار نظمیں زبانی یاد تھیں۔ حمّاد کو ستائیس ہزار قصائد یاد تھے۔ اصمعی سولہ ہزار نظموں کا حافظ تھا۔ ابو ضمضم نے ایک مرتبہ ایسے سنّو شاعروں کے اشعار نقل کئے جن میں سے ہر ایک کا نام عمرو تھا۔

عربی شاعری کے ادوارِ مختلف | علمائے ادب نے زمانہ کے اعتبار سے شعرائے عرب کو چار قسموں میں منقسم کیا ہے۔

(۱) **جاہلی** ۔ وہ شعراء جو زمانہ قبل از اسلام میں ہوئے۔ جیسے امرئ القیس۔ زہیر۔ امیہ بن ابی الصلت۔ اور لبید وغیرہ۔

(۲) **مخضرمی** ۔ جاہلیت اور اسلام دونوں زمانہ پانے والے شاعر جیسے کعب بن زہیر۔ حسان بن ثابت۔ نابغہ۔ جعدی۔ خنساء وغیرہ۔

(۳) **اسلامی** ۔ یعنی آغازِ اسلام سے لے کر بنو امیہ کے دور تک جو شاعر ہوئے۔ جیسے عمر بن ربیعہ۔ اخطل۔ فرزدق اور جریر۔

(۴) **مولّد** ۔ دورِ عباسی اور ان کے مابعد کے شعراء مثلاً بشار بن برد۔ ابو العتاہیہ۔ ابو نواس ابن الرومی۔ ابن المقفع۔ ابو تمام۔ المتنبی۔ ابو العلاء المعرّی وغیرہ

ان اصناف چہار گانہ میں سے جاہلی اور مخضرمی دور خالص اور معیاری عربی زبان کے لئے ممتاز ہے۔ بعد کے ادوار میں فصاحت و بلاغت کا یہ معیار قائم نہ رہ سکا جب مختلف عجمی اقوام مشرف باسلام ہوئیں اور اسلامی تمدن اکنافِ ارضی میں پھیلا تو عربی زبان بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ لغت کے نزدیک متاخرین شعراء کا کلام سند نہیں اور ٹکسالی زبان فقط وہی ہے جو جاہلیت یا آغازِ اسلام میں مروج تھی۔ حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ جن کے مختصر سوانح اور کلام پر جائزہ تبصرہ یہاں مقصود ہے اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تبصرہ و تنقید سے قبل ان کی ذات کو بالاختصار آپ سے متعارف کرا دیا جائے۔

حضرت حسان کا شجرۂ نسب وسوانح حیات | تاریخ ادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات جانتے ہیں کہ عربی ادب کا مطالعہ کرتے وقت ایک بڑی کمی جو محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ شعراء کی زندگی کے حالات تقریباً بالکل نہیں ملتے۔ بڑے سے بڑے شاعر کے متعلق ہم جو کچھ جانتے ہیں وہ چند سطروں یا زیادہ سے زیادہ ایک صفحہ میں آسکتا ہے۔ لکھنے پڑھنے کا رواج نہ ہونے کی وجہ سے راویوں نے اپنی دلچسپی اشعار تک محدود رکھی اور صرف ان واقعاتِ زندگی کو یاد رکھا جو یا تو غیر معمولی اہمیت رکھتے یا اُن کی جانب شاعر کے کلام میں اشارے پائے جاتے ہیں۔

یہی حال حضرت حسان کا ہے۔ ہم اتنا جانتے ہیں کہ آپ انصار کے قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتے تھے جو ازد کی ایک شاخ ہے۔ عرب کے عام علماء انساب کے نزدیک ازد بنو قحطان ہیں اور ان کا اصل وطن یمن ہے۔ آپ کا شجرۂ نسب ایک جانب سے آل جفنہ تک پہنچتا ہے جو غساسنہ کے نام سے مشہور تھے اور ملک شام پر حکمراں تھے اور دوسری طرف لخمیین سے جو عراق کے حاکم تھے کیوں کہ ان سب کا مورث اعلیٰ عمرو بن عامر بن ماء السماء تھا۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت حسانؓ حسب ونسب کے اعتبار سے عرب میں بہت بلند مقام رکھتے تھے اور اپنے اشعار میں فخریہ اظہارِ شرافت ونجابت کرنے میں حق بجانب تھے۔ اور نیز یہ کہ غساسنہ اور آل منذر کی شان میں ان کے قصائد ان کے دوسرے اشعار سے کیوں ممتاز ہیں۔ اس سے یہ راز سربستہ بھی الم نشرح ہوتا ہے کہ حضرت حسان پر ملوکِ غسان کی پیہم نوازشات کی وجہ ان کی شاعری کے سوا کچھ اور بھی تھی اور وہ تھا ان کا نسبی تعلق۔ بہر کیف ان کا پورا نسب نامہ یہ ہے:-

"حسان بن ثابت بن المنذر بن حرام بن عمرو بن زید مناۃ بن عدی بن عمرو بن مالک بن النجار وہو تیم اللہ بن ثعلبۃ بن عمرو بن الخزرج بن حارثۃ بن ثعلبۃ وہو العنقاء بن عمرو مزیقیاء بن عامر بن ماء السماء بن حارثۃ الغطریف بن امرئ القیس البطریق بن ثعلبۃ البہلول ابن مازن بن الازد بن الغوث بن ہمیت بن مالک بن زید بن کہلان بن یشجب بن یعرب بن قحطان۔"

ابو الولید۔ ابو عبدالرحمٰن اور ابو الحسام آپ کی کنیتیں ہیں۔ آپ کی والدہ کا نام فُریعہ ہے جو شرف

باسلام ہوئیں۔ آپ نے ایک سو بیس[120] سال عمر پائی۔ جس میں سے ساٹھ برس جاہلیت میں گذرے اور ساٹھ برس مشرف باسلام رہے۔ یہ معلوم ہو چکا کہ آپ کا تعلق خزرج کے قبیلہ بنی نجار سے تھا اور اوس و خزرج کے دونوں قبیلے یثرب میں سکونت پذیر تھے جو بعد میں مدینۃ النبی اور پھر اختصاراً مدینہ مشہور ہوا۔ یہ دونوں قبیلے حلقہ بگوش اسلام ہونے کے بعد انصار کے لقب سے ملقب ہوئے۔ بنابریں حضرت حسان اہل مدر یعنی سکان قریٰ و امصار میں سے ہوتے نہ کہ اہل وبر یعنی ساکنین خیمہ میں سے۔ لہٰذا نقادانِ شعر کی رائے "انہ اشعر اہل المدر" انکے حق میں درست ہے۔

حضرت حسان مدینہ میں اوس و خزرج اور یہود میں پروان چڑھے۔ اوس و خزرج کی آپس میں ٹھنی رہتی تھی اور ان میں یوم بُعاث، یوم سمیحہ، یوم الدرک، یوم الربیع اور یوم البقیع کے نام سے بڑی بڑی لڑائیاں لڑی جا چکی تھیں جن کا ذکر حسان نے اپنے اشعار میں کیا ہے۔ مگر حسان نے ان بڑی بڑی جنگوں میں وہی پارٹ ادا کیا جو ایک بہترین شاعر سے متوقع ہے وہ اپنی قوم کا ذکر فخریہ انداز میں کرتے ہیں اور اس کی شجاعت و بسالت کا ذکر کرتے نہیں تھکتے۔ وہ اپنی خاندانی نجابت کے گن گاتے ہیں اور اپنی قوم کو انتقامی کارروائی پر اکساتے ہیں مگر وہ بھول کر بھی کوئی عملی حصہ نہیں لیتے ——— آخر کیوں؟ اس لئے اور صرف اس لئے کہ حسان شاعر تھے جنگجو سپاہی نہیں تھے۔ اور شاعر جب تک شاعر ہے سیف و قتال سے بے نیاز ہے۔ جب تک شاعر کی زبان تلوار کا کام دیتی ہے وہ سیف آہنی کا محتاج نہیں اور جب تک وہ قوت بیانیہ سے مسلح ہے خود و زرہ سے بے نیاز ہے۔ اور یہ امر عہد جاہلیت ہی سے مخصوص نہیں۔ حضرت حسان تمام غزواتِ نبوی میں شریک رہے۔ مگر آہنی سلحہ کی ضرورت کبھی محسوس نہ فرمائی ہمیشہ زبان سے تلوار کا کام لیا۔

حضرت صفیہؓ بنت عبد المطلب نے اس ضمن میں بڑا عجیب واقعہ سنایا ہے۔ فرماتی ہیں غزوۂ خندق کے دن حضرت حسان ہمارے ساتھ ایک قلعہ میں تھے اور اس میں بہت سی عورتیں اور بچے بھی تھے ایک یہودی ادھر سے گذرا اور قلعہ کے گرد گھومنے لگا۔ ان دنوں بنو قریظہ معاہدہ توڑ کر مسلمانوں سے برسرپیکار تھے اور ہمیں خطرہ تھا کہ ان کے حملہ کی صورت میں ہمارے پاس مدافعت کا کوئی سامان نہیں۔ صحابہ دشمن کے مقابلہ میں تھے اور کسی طرح ہماری مدد نہ کر سکتے تھے۔ میں نے کہا حسان! یہ

یہودی آپ کے سامنے قلعہ کا چکر لگا رہا ہے اور ... قیاس نہیں کہ یہ یہود کو ہمارے متعلق آگاہ کردے نیچے اتر کر اسے قتل کر دیجئے۔ حضرت حسان نے شاعرانہ زبان میں کہا ——— عبد المطلب کی بیٹی! خدا تمہیں معاف فرمائے آپ جانتی ہیں کہ میں اس قابل نہیں حضرت صفیہ فرماتی ہیں میں نے یہ بات سنی تو ایک کھمبا لے کر نیچے اتری اور یہودی کو جہنم رسید کر دیا۔ واپسی پر حضرت حسان سے کہا کہ اب جاکر مقتول کا اسلحہ اتار لیجئے۔ مجھے یہ امر مانع ہے کہ مقتول مرد ہے اور ایک عورت کے لئے زیبا نہیں کہ وہ مرد کا سامان اتارے۔ حسانؓ نے برملا کہا عبد المطلب کی ... بے سامان سے کیا سروکار؟

حضرت حسانؓ نے پیغمبر صلعم کی خدمت میں جب یہ اشعار پڑھے ؎

لقد غدوتُ امام القوم منتطقاً　　بصارم مثل لون الملح قطّاع

تو آپ نے بے ساختہ تبسّم فرمایا۔ آخر اس سے موزوں تر تبسّم کا موقع اور کیا ہو سکتا تھا کہ حسان کے سے دل گردے کے آدمی کو ادعائے جنگ و جدال ہو۔

بعض لوگوں نے حضرت حسان کے اس حد سے بڑھے ہوئے جبن کی وجہ یہ بتائی ہے کہ واقعۂ افک میں جب انھوں نے صفوان بن معطّل کے متعلق تعریضاً یہ شعر کہا ؎

امسی الجلابیب قد عزّوا وقد کثروا　　وابن الفریعة امسی بیضة البلد

تو صفوان نے سامنے آکر تلوار ماری اور یہ شعر پڑھا ؎

تلقّ ذباب السیف عنّی فانّنی　　غلامٌ اذا هوجیت لست بشاعر

اس واقعہ کے بعد صفوان اور حسان دونوں پیغمبر صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ماجرا عرض کیا۔ آپ نے ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ پھر معاف فرمایا اور ماریہ قبطیہ کی بہن سیرین بخشیں جن سے عبد الرحمٰن پیدا ہوئے جو بعد میں شاعر بنے۔ گو یہ واقعہ درست ہے مگر اس سے ان کے دعوی کو کوئی تعلق نہیں۔

شاعری آلِ حسان میں مبرد نحوی کا قول ہے حضرت حسان کے خاندان میں کئی پشتوں تک شاعری کا پتہ چلتا ہے اور اس امر میں وہ جاہلیت کے مشہور شاعر زہیر بن ابو سلمیٰ سے مشابہ ہیں۔ ان کے خاندان میں علی الترتیب چھ شعراء پائے جاتے ہیں۔

"سعید بن عبدالرحمٰن بن حسان بن ثابت بن المنذر بن حرام"

یعنی ایک طرف اگر ان کا پردادا شاعر ہے تو دوسری جانب پوتا بھی شاعری کی حیثیت سے مشہور ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ شاعری وراثۃ کی چیز ہے مگر اتنا ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ شاعری ان کی رگ و پے میں سمائی ہوئی تھی۔ حسان کے بیٹے عبدالرحمٰن اگر ایک بلند پایہ شاعر کی حیثیت سے مشہور ہیں تو اس میں فی الجملہ کے والد کی شاعری کی شہادت موجود ہے۔ برقوقی لکھتے ہیں عبدالرحمٰن ابھی کم سن تھا کہ بھڑ نے کاٹا روتا ہوا باپ کے پاس آیا۔ حسان نے پوچھا کیا ہوا کہا۔ لسعنی طائر۔ مجھے ایک اڑتے جانور نے کاٹ کھایا۔ کہا وہ کیا تھا۔ بولا خبر نہیں۔ پھر پوچھا کیا صورت شکل تھی؟ بچہ نے بے ساختہ کہا کانہ ملتفٌ ببُردَی حِبَرۃ۔ متعجب ہوئے اور کہا بُحیَّ الشعر و ربِّ الکعبۃ۔

اصمعی مشہور نقادِ سخن کہتے ہیں۔ بادل کی تعریف میں کسی عربی شاعر نے عبدالرحمٰن بن حسان سے بڑھ کر نہیں کہا۔ اور سب سے بہترین ہجویہ اشعار وہ ہیں جو عبدالرحمٰن نے مروان کے بھائی عبدالرحمٰن بن الحکم کے بارہ میں کہے۔ ایک دن حسان نے یہ شعر پڑھا ؎

وانّ امرأ یُمسی و یُصبحُ سالماً — من النّاس الّا ما جنیٰ لسعیدُ

تو عبدالرحمٰن بن حسان نے برجستہ کہا ؎

وانّ امرأ نال الغنیٰ ثمّ لم ینل — صدیقاً ولا ذا حاجۃ لزهیدُ

حسان کے پوتے سعید بن عبدالرحمٰن نے فی الفور کہا ؎

وانّ امرأً لاحی الرجال علی الغنیٰ — ولم یسأل اللّٰہ الغنیٰ لحسودُ

حضرت حسان کی تشبیب | حضرت حسان اپنے اشعار میں دو عورتوں سے تشبیب کرتے ہیں شعثار اور عمرہ۔

شعثار کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ سلام بن مشکم یہودی کی بیٹی تھی۔ حسان نے ایک شعثار نامی عورت سے شادی بھی کی تھی جس سے ابو فراس پیدا ہوا اور یہ قبیلۂ خزاعہ سے وابستہ تھی۔

دوسری عورت عمرہ ہے یہ صامت بن خالد بن عطیہ کی بیٹی ہے اس سے حضرت حسان نے نکاح

کیا۔ پھر طلاق دے دی مگر بعد ازاں نادم ہوئے اور اشعار میں اظہارِ افسوس کیا۔ حضرت حسانؓ کا مشقیہ کلام دورِ جاہلیت سے متعلق ہے۔ مشرف باسلام ہونے کے بعد ان کی شاعری مدح و ہجا اور فخر میں محدود ہو کر رہ گئی۔ اور یہ بھی غنیمت ہے کہ انھوں نے جاہلیت کے مشہور شاعر لبید کی طرح اسلام لانے کے بعد شاعری مطلقاً چھوڑ نہیں دی اور صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا ؎

الحمد للہ اِذ لم یاتنی اَجلی　　حتیٰ لبستُ منَ الاسلام سِربالا

حضرت حسانؓ کا ذریعۂ معاش | آلِ غسان اور آلِ منذر سے ان کے خاندانی روابط تھے۔ اسلام سے پہلے ان دونوں شاہی درباروں میں جاتے اور نعمانی و غسانی بادشاہوں کی تعریف میں معرکے کے قصیدے کہتے۔ یہ لوگ بھی دل کھول کر انعام دیا کرتے تھے۔ اسی لئے نقادانِ سخن کی رائے ہے کہ حضرت حسان کے سب سے زوردار اشعار وہ ہیں جن میں ملوکِ غسان کی ثنا خوانی کی گئی ہے۔

علامہ ابن رشیق قیروانی نے کتاب العمدہ کے ایک باب میں یہ مبحث چھیڑا ہے کہ مدح میں سب سے بڑھ کر کون سا شعر ہے اور اس ضمن میں ائمۂ فن کے مختلف اقوال نقل کئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ حطیئہ جو مشہور مخضرمی شاعر تھا جب مرنے لگا تو کہا کہ انصارِ مدینہ کو میرا یہ پیغام پہنچا دینا کہ تمہارا بھائی حسان سب سے بڑا مدح گو ہے جس کا یہ شعر ہے ؎

یُغشَونَ حتیٰ ما تھرّ کلابُھم　　لا یسئلون عن السوادِ المُقبِل

عرب میں عموماً لوگ کتے پالتے تھے یہ کتے اجنبی آدمی کو دیکھ کر بھونکتے تھے شاعر کہتا ہے کہ ملوکِ غسان کے پاس مہمان اس کثرت سے آتے جاتے ہیں کہ ان کے کتے کسی کو دیکھ کر بھونکتے نہیں کیوں کہ آنے والوں سے مانوس ہو گئے ہیں اور وہ کسی سے یہ نہیں پوچھتے کہ وہ کون ہیں اور کس مقصد کے پیش نظر آئے ہیں ملوکِ غسان کے الطاف کریمانہ دورِ جاہلیت تک محدود نہیں رہے بلکہ حسان کے مشرف باسلام ہونے اور ان کی وفات کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ آلِ جفنہ کا آخری تاجدار جبلہ بن ایہم غسانی جب اسلام لانے کے بعد مدینہ وارد ہوا اور عدلِ فاروقی کی تاب نہ لا کر عیسائیت قبول کر کے قسطنطنیہ پہونچا۔ تو حضرت عمرؓ نے جثامہ بن مساحق کنانی کو ہرقل شاہِ روم کے نام دعوتِ اسلام پر مشتمل خط

دے کر قسطنطنیہ روانہ کیا۔ وہ دعوتِ اسلام تو کیا مانتا قاصد کی تعظیم و تکریم بجالایا اور واپسی کے وقت ان کے عرب برادر جبلہ کو ملنے کی رغبت دلائی۔ وہ ملاقات کے لئے گئے تو جبلہ کے ہاں عجب شان و شوکت ملاحظہ کی۔ سونے چاندی کے برتن زریں کرسیاں مطلا قالین اور زرق برق لباس آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا۔ ملاقات کے بعد مے نوشی کا دور چلا پھر نازک اندام لونڈیوں نے مجلس سرود گرم کی۔ اور حضرت حسان کے یہ اشعار سازوں کی جھنکار میں گانے شروع کئے ؎

لِلّٰہ درّ عصابۃٍ نادمتھم — یوماً بجلّقَ فی الزمان الاوّل

جبلہ نے بتایا کہ اشعار میں جن مقامات کا نام آیا ہے وہ ان کے وطن مالوف دمشق کے نواح میں ہیں اور یہ اشعار رسول اللہ صلعم کے شاعر حسان کے ہیں۔ جثامہ نے کہا حسان تو بوڑھے اور اندھے ہو گئے جبلہ نے اسی وقت پانچ صد دینار اور پانچ ریشمی خلعت منگوا کر ان کے حوالہ کئے اور کہا سلام کے بعد یہ تحفہ انھیں دے دیں۔

پھر اسی قدر رقم جثامہ کو پیش کی۔ وہ رقم تو کیا لیتے رو پڑے جس سے جبلہ بھی اپنے آنسو نہ تھام سکا اور لونڈیوں سے غم افزا ترانہ سننے کی فرمائش کی۔ انھوں نے حضرت حسان کے یہ اشعار گانے شروع کئے ؎

تنصّرتِ الاشرافُ من عارِ لطمۃٍ — وما کان فیھا لو صبرتُ لھا ضررُ

تکنّعنی فیھا لجاجٌ ونخوۃٌ — وبعت بھا العینَ الصحیحۃَ بالعورِ

فیالیتَ اُمّی لم تلِدْنی ولیتنی — رجعتُ الی القول الذی قال لی عمر

جثامہ کہتے ہیں ہم دونوں اس قدر روئے کہ آنسوؤں کی لڑیاں موتیوں کی طرح جبلہ کی ڈاڑھی پر بہ رہی تھیں۔ مدینہ آ کر تمام واقعہ عمر فاروقؓ کو سنایا۔ دریافت کیا کیا آپ کو کچھ دیا؟ میں نے کہا حسان کے لئے پانچ سو دینار اور پانچ خلعت بھیجے ہیں۔ حسان بلائے گئے نابینا ہونے کی وجہ سے قائد ساتھ تھا سلام کے بعد کہا امیر المومنین! مجھے آل جفنہ کی روحوں کی خوشبو آ رہی ہے۔ حضرت عمر نے فرمایا خدا نے اسی ذریعہ سے آپ کی مدد کر دی۔ حسان یہ اشعار گنگناتے گھر لوٹے۔

اِنّ ابن جفنۃ من بقیّۃ معشرٍ — لم یغذھم آباؤھم باللّوم
لم ینسنی بالشام اذھو ربّھا — کلّا ولا متنصّراً بالروم
یعطی الجزیل ولا یراہ عندہ — الّا کبعض عطیۃ المذموم

مشرف باسلام ہونے کے بعد حضرت حسان نے اپنی مرضی سے کفار کی ہجوگوئی کا کٹھن کام اپنے ذمہ لیا اور دل وجان سے اسے نبھایا۔ نبی اکرم صلعم فرمایا کرتے تھے کہ حسان کے اشعار کفار کے لئے تیر سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہیں۔ رسول مقبول کو آپ کی اس قدر خاطر منظور تھی کہ آپ کے لئے مسجد نبوی میں منبر رکھا جاتا تھا۔ اس پر چڑھ کر آپ اپنا قصیدہ سناتے۔ اس لئے اسلامی بیت المال ان کی سرپرستی کرتا تھا اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب ۵۴ھ میں حضرت معاویہؓ کے عہد خلافت میں آپ نے وفات پائی۔

حضرت حسانؓ پر قائم کئے ہوئے اس الزام کا کوئی معقول جواب نہیں دیا جا سکتا کہ آپ نے غساسنہ و مناذرہ کی مدح گوئی کو اپنے لئے ذریعہ معاش بنایا۔ یہ بات عربی شاعری کا طغرائے امتیاز ہے کہ یہاں شاعری کا آغاز فطری جذبات واحساسات سے ہوا۔ ایران کی طرح مداحی اور خوشامد گوئی میں اس کی زبان نہیں کھلی۔ عرب ہمیشہ سے جنگجو، بہادر و مہمان نواز، سیر چشم، غیور اور بلند ہمت تھے اور انھیں باتوں کو نظم میں ادا کرتے اور یہی ان کی شاعری تھی۔

سب سے پہلا شخص جس نے بادشاہ کی مدح لکھی وہ زُہیر بن ابی سُلمیٰ تھا جس نے ہرم بن سنان کی مداحی کی۔ تاہم اُس نے یہ آن قائم رکھی کہ ہرم نے جب یہ حکم دیا کہ زہیر جس وقت دربار میں آئے اور مجھ کو سلام کرے تو اس کو انعام دیا جائے۔ اس حکم کے بعد زہیر جب کبھی دربار میں جاتا تھا تو کہہ دیتا تھا کہ بادشاہ کے سوا اور سب کو سلام کرتا ہوں۔

زہیر کے بعد نابغہ ذُبیانی نے سلاطین کی مداحی کی اور اس وجہ سے تمام عرب میں ذلیل ہوا اور اس کی قدر و منزلت جاتی رہی۔ ابن رشیق قیروانی کتاب العمدہ میں لکھتے ہیں۔ فَسقطت منزلتہ وتکسّب مالاً جسیماً۔

اہل عرب مداحی کو جس قدر ذلیل پیشہ سمجھتے تھے اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ عمر بن ابی ربیعہ مشہور قریشی شاعر کو جب عبد الملک نے اپنی مدح کے لئے کہا تو اس نے جواب دیا کہ میں صرف عورتوں کی مدح کیا کرتا ہوں۔

ابن میادہ نے خلیفہ منصور کی مدح میں قصیدہ لکھا اور قصد کیا کہ بغداد جا کر دربار میں سنائے سوار ہو رہا تھا کہ اس کا نوکر حسب معمول اونٹنی کا دودھ لے کر آیا۔ ابن میادہ نے پی کر پیٹ پر ہاتھ پھیرا اور کہا استغفر اللہ اس کے ہوتے ہیں امیر المومنین کی مدح لکھتا اور بغداد جاتا ہوں!

حسان عرب شعراء کے اس معیار پر پورے نہیں اُترتے اور ان کی جانب سے جو اعتذار کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ملوک غسان ان کے ممدوح ہی نہ تھے بلکہ نسلی قرابت داری کے مضبوط بندھنوں نے بھی ان کو آل غسان سے جکڑ رکھا تھا۔ وہ جب ان کے آباء و اجداد کی ثنا خوانی کرتے ہیں تو یہ ان کی اپنی قوم کی مدح ہے کیوں کہ وہ آل غسان سے غیر نہیں۔ وہ ان کی مدح بڑے بڑے صلات کی امید پر نہیں بلکہ اپنی قوم کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے کرتے تھے اور یہ ایک عربی شاعر کا حق ہے کہ وہ فخریہ انداز میں اپنے آباء کرام کی تعریف کے گن گائے اور ان کی مدح خوانی میں فصاحت و بلاغت کے دریا بہائے۔ دوسری جانب ملوک غسان کے عطیات اگر مدح گوئی کا صلہ ہو سکتے ہیں تو ان میں صلہ رحمی اور قرابت داری کا پہلو بھی موجود ہے۔ اور یہ زیادتی ہے کہ دونوں امکانات کے ہوتے ہوئے ایک کو نظر انداز کر کے دوسرے پر زور دیا جائے۔

نقادانِ سخن کی رائے ان مختصر سوانح حیات کے بعد اب ان کے کلام پر اجمالی تبصرہ سنئیے!

شاعری کے لحاظ سے آپ کا رتبہ بہت بلند ہے۔ آپ بالاتفاق "اشعر اہل المدر" یعنی شہری شاعروں میں سب سے افضل ہیں ابو عبیدہ مشہور ناقدِ سخن کا قول ہے۔ حسان کی تین خصوصیات ان کو دوسرے شعراء سے ممتاز کرتی ہیں۔ آپ دورِ جاہلیت میں انصار کے، زمانہ نبوت میں رسول اللہ صلعم کے اور زمانہ اشاعت اسلام میں تمام یمن کے بہترین شاعر تھے۔ اسی فاضل کا یہ قول بھی ہے کہ بالاتفاق تمام صحرا کے باشندوں میں اہل مدینہ کے اور پھر قبیلہ عبد القیس کے اور پھر ثقیف والوں کے شعرا اچھے ہیں

اور اہل مدینہ میں سب سے بڑے شاعر حضرت حسان ہیں۔

عمرو بن العلار کہتے ہیں حسّان اشعرُ اھل الحضر۔

ابوالفرج اصفہانی صاحب کتاب الاغانی کا قول ہے۔ حسان فحلٌ من فحول الشعراء

نابغہ ذبیانی نے حسان کے اشعار سن کر کہا۔ انّک لشاعرٌ۔

اعشیٰ حسان کا دوست تھا اور ان کو شاعر عظیم سمجھتا تھا۔ حطیہ انھیں اشعر العرب کہا کرتا۔

ائمہ لغت اور نامور شعرائے عرب کی یہ شہادت پتہ دیتی ہے کہ وہ حسان کو بہ حیثیت شاعر کے مانتے ہیں اور یہ ایسی بات ہے جس میں کسی کو اختلاف نہیں۔ وہ فطری شاعر تھے۔ شاعری کئی پشتوں تک ان کے خاندان میں رہی۔ ادھر ان کے باپ دادا اور پردادا شاعر تھے اور دوسری طرف ان کا بیٹا اور پوتا شعر گوئی کا ملکہ رکھتے تھے گویا حسان کی حیثیت ان کے درمیان ایسی تھی جیسے خوبصورت موتیوں کے ہار کے عین وسط میں کوہ نور ہیرا جڑ دیا جائے۔

اصنافِ سخن کے اعتبار سے بھی حسان کی شاعری کافی وسعت رکھتی ہے۔ آپ نے جاہلیت کے مروجہ جملہ اصنافِ شعر میں طبع آزمائی کی ہے اور کسی میں ناکام نہیں رہے۔ آپ کی شاعری مدح و ہجا فخر و تشبیب مرثیہ و وصف پر مشتمل ہے۔ آپ کا اسلوبِ بیان جزالتِ کلام اور فخامتِ الفاظ میں شعرائے جاہلیت کی مانند ہے تعقید لفظی و معنوی سے بڑی حد تک پاک ہے۔

آپ میدانِ بدیہہ گوئی کے شہسوار ہیں اور اس معاملہ میں زہیر اور حطیہ اور ان کے مکتبِ خیال سے تعلق رکھنے والوں سے قطعی مختلف جنہیں اصمعی عبید الشعر کا لقب دیتا ہے۔ آپ حطیہ کی طرح "خیر الشعر الحولی المنقّح المحکّک" کے قائل نہیں بلکہ ارتجالاً شعر کہتے ہیں۔ جب بنی تمیم کا وفد بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا تو آپ نے فی الفور وہ بہترین اشعار کہے جو دیوان حسان کے قافیہ میم میں موجود ہیں۔ پہلا شعر یہ ہے ؎

ھل المجد الّا السُّودد والعود والندیٰ ۔۔۔ وجاہ الملوک واحتمال العظائم

اسی طرح یہ اشعار فی البدیہہ کہے جو قافیہ عین میں ہیں ؎

ان الذوائب من فهر و اخوتهم قد بیّنوا سنّۃً للناس تُتّبع

حسان کا ماحول احسان کی شاعری پر نقادانِ عرب کی رائے آپ سُن چکے۔ ان کے کلام پر اجمالی تبصرہ کرنے سے قبل یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس ماحول کا جائزہ لیا جائے جس میں ان کی شاعری پروان چڑھی۔ آپ مخضرمی شاعر ہیں اور کفر و اسلام کے دونوں ادوار میں آپ نے شاعری کے جوہر دکھاتے ہیں۔ اصمعی اور ان کے ہم نوا کہتے ہیں کہ عہدِ اسلام میں حسان کی شاعری میں وہ بات نہ رہی جو جاہلیت میں تھی۔ مگر وہ دونوں ادوار کے مختلف ذہنی سیاسی اور ادبی رجحانات میں فرق نہیں کرتے اور دونوں کو ایک ہی نکتۂ خیال سے دیکھتے ہیں۔

اے کاش! وہ یہ خیال کرتے کہ جب تک عرب عرب کے ریگستانوں میں بند اور اپنی بدویانہ زندگی پر خورسند رہے۔ عربی شعر باہمہ جدّتِ ادا بھی مدتوں ایک محدود دائرے میں ایک ہی مرکز پر گھومتا رہا مگر جب اسلام آیا اور فتوحات کے ساتھ حضارت و تمدن لایا۔ شعراء کا گرد و پیش بدلا۔ ٹیلوں پہاڑوں ریگستانوں بیابانوں خیموں اور قناتوں کی جگہ سر سبز و شاداب باغ و گلزار سر بفلک ایوان و قصور پیشِ نظر رہنے لگے۔ سادگی تکلف سے خشونت تنعّم سے غریبی امیری سے وحشت و جہالت علم و مدنیت سے بدلی۔ غرض مشاہدات و معلومات کا دائرہ وسیع ہوا تو ان کے شاعرانہ تخیل میں تبدیلی واقع ہوئی اور زمینِ شعر میں نئے نئے گل بوٹے نظر آئے۔ نئے نئے خیال اور نئی نئی تشبیہوں نے ان کی شاعری کے انداز اور طرزِ ادا کو بدلنا شروع کیا۔ لہٰذا یہ کسی طرح قرین انصاف نہیں کہ جاہلیت و اسلام کی شاعری کو ایک ہی ترازو میں تولا جائے۔

ایک ادیب و لغوی کی حیثیت سے اصمعی جزالت الفاظ اور فخامتِ اسلوب کے دلدادہ ہیں اور الفاظ کا زیر و بم ان کے نزدیک عمدہ ترین شاعری کا معیار ہے۔ مگر نزولِ قرآن نے الفاظ کے اس طلسم کو توڑ دیا اور شعراء و خطباء معنویت پر نظر رکھنے لگے۔ قرآن نے سادہ مگر سہل ممتنع اسلوب کو اپنایا اور عہدِ اسلام میں اسی انداز نے رواج پایا۔ لہٰذا حسان کے اشعار میں اگر جاہلیت کی وہ غرابت و خشونت اور بے جا تکلف و تصنع موجود نہیں تو یہ اسلامی ماحول کی تاثیر ہے جس سے اثر پذیر نہ ہونا حسان کے بس کا روگ نہ تھا۔

کچھ قاہرہ کے بارے میں

(اڈیٹر صاحب برہان کی فرمائش پر)

از
(جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب فارق استاذ ادبیات عربی - دہلی یونیورسٹی)

"یہ میرے ذاتی مشاہدات و تاثرات ہیں جن میں غلطی اور سہو کی گنجائش ہے"۔ (فارق)

قاہرہ کی آبادی لگ بھگ تیئیس ۲۳ لاکھ اور کل مصر کی تیئیس بلین ہے - مصر اور خصوصاً زیریں مصر (ڈیلٹا) کی آب و ہوا معتدل اور نشاط انگیز ہے - یہاں بارش بہت ہی کم ہوتی ہے - اور موسم سال بھر اچھا رہتا ہے، عام طور پر گرمی ۹۵، ۹۶ ڈگری سے زیادہ نہیں ہوتی اور شاذ و نادر ہی بارہ سو ڈگری سے آگے بڑھتا ہے - یہاں نہ آندھیاں آتی ہیں، نہ گرج چمک ہوتی ہے اور نہ گھٹائیں اٹھتی ہیں، آسمان صاف رہتا ہے، فضا روشن اور موسم سہانا - گرمیوں میں صبح و شام بڑی لطیف ہوا چلتی ہے جس سے جسم اور دل دونوں تازہ رہتے ہیں - قاہرہ دریائے نیل کی دو شاخوں پر واقع ہے، نیل کا پانی بڑا خوش ذائقہ اور صحت بخش ہوتا ہے - اچھے موسم اور عمدہ پانی کی وجہ سے یہاں صحت کا معیار ہندوستان سے بہت بلند اور اعلیٰ ہے، آپ منحنی جسم اور جھکے سینے بہت کم پائیں گے - مردوں کی نسبت عورتیں زیادہ فربہ ہوتی ہیں - رنگ گورے ہیں، جسم بڑے متوازن، بال چھوٹے اور گھنگریالے، آنکھیں معمولی، پیشانی کشادہ، قد اونچے، چہرے بالعموم کتابی، قاہرہ میں کالے اور نامقبول صورت لوگ بھی کافی ہیں، یہ زیادہ تر سوڈانی یا حبشی نسل کے ہوتے ہیں، خدمت اور چاکری ان کا خاص پیشہ ہے -

مصر کے اچھے موسم کا اثر یہاں کے طرز تعمیر پر بھی پڑا ہے، یہاں کے مکانوں میں صحن نہیں ہوتا، اور نہ آسمان کے نیچے سونے کا رواج ہے - قاہرہ کے مکان طبق بر طبق بنے ہیں، زیادہ تر چار سے لے کر گیارہ طبقوں کی عمارتیں ہیں، ہر طبقہ میں کئی فلیٹ ہوتے ہیں اور ہر عمارت پندرہ سے لے کر تیس چالیس فلیٹ پر مشتمل ہوتی ہے جس میں پانی، بجلی، فلش اور چڑھنے اترنے کے لئے زینہ کے علاوہ لفٹ کا انتظام ہوتا

ہے، یہ عمارتیں عام طور پر صاف ستھری اور قاعدے کی بنی ہوتی ہیں۔ آج کل شاہ سعود کے بھائی فیصل (وزیر خارجہ مملکت سعودیہ) نیل کے کنارہ ایک پینتیس[۳۵] منزلہ عمارت بنوا رہے ہیں جو قاہرہ ہی نہیں بلکہ سارے مشرق میں سب سے اونچی عمارت ہوگی۔

قاہرہ کی لمبائی زیادہ سے زیادہ بارہ میل اور چوڑائی کوئی چار میل ہے۔ اس بڑے رقبہ کا بیشتر حصہ خوش وضع اور نئے طرز کا ہے، کچھ حصے واقعی گندے، پرانے اور فلاکت زدہ ہیں، لیکن رونق، چہل پہل اور ہماہمی ہر جگہ ہے۔ شہر کی چوتھائی آبادی عیسائیوں پر مشتمل ہے، ان میں اکثریت قبطیوں کی ہے، باقی آرمینی، یونانی، اطالوی، فرانسیسی اور برطانوی نسل کے لوگ ہیں۔ شاہی زمانہ میں تجارت، صنعت اور تجارتی اداروں پر ان کا غلبہ تھا، جو قومی حکومت کے بعد تیزی سے کم ہوتا جا رہا ہے۔ شہر کو زیور تجدد سے آراستہ کرنے میں مغربی تسلط کی طرح انھوں نے بھی بڑا پارٹ ادا کیا ہے جہاں افلاس اور جہالت ہے اور یہ وہ علاقے ہیں جن میں خالصتہً مسلمان آباد ہیں، راستے تنگ، ناہموار اور گندے ہیں، مکانات بدہیئت ہیں، جامعہ ازہر کے ارد گرد کے محلے دیکھ کر کوچہ چیلان اور بلی ماران کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

معاشی اعتبار سے شہر کی آبادی کو تین بڑے حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے: خوب خوش حال طبقہ: اس میں مقامی یا دوسرے عرب ممالک کے رئیس، بڑے تاجر، کارخانوں اور کرایہ کی عمارتوں کے مالک، اعلیٰ سرکاری ملازم، آزاد پیشے ور جیسے ڈاکٹر، انجنیئر اور ٹھیکہ دار شامل ہیں، یہ طبقہ سارے قاہرہ کی اجتماعی اور اقتصادی زندگی پر چھایا ہوا ہے۔ اس میں عیسائیوں کا تناسب کافی ہے۔

(۲) معاشی سیڑھی پر اس کے بعد والے طبقہ کا مقام بہت نیچا ہے، یہ چھوٹے تاجروں، سوم اور چہارم درجہ کے سرکاری اہل کار، تجارتی اور صنعتی اداروں کے ملازموں پر مشتمل ہے۔

(۳) تیسرے درجہ میں کارخانوں کے مزدور، صنعتی دستکار، مستری اور گھریلو خدمتگار شامل ہیں۔ یہ معاشی ناہمواری اور دولت کی غیر متناسب تقسیم ملوکیت کی یادگار ہے جس کی مصر میں ہمیشہ کے لئے بنیادیں کٹ چکی ہیں۔ جمال عبدالناصر کی حکومت کے سامنے اس وقت دو سب سے اہم مسئلے ہیں: ایک تعلیم کی توسیع اور دوسرے دولت کی منصفانہ تقسیم۔ ان دونوں میدانوں میں شوق اور خلوص سے

کام شروع ہوگیا ہے۔ ملوکیت کے خاتمہ کے بعد گذشتہ پانچ سال میں ۱۲۱۵ نئے اسکول قائم ہوئے ہیں اور ہر تین دن میں ایک نیا اسکول وجود میں آرہا ہے طالبات کی تعداد میں اڑتالیس فیصدی اضافہ ہوا ہے، اس وقت ان کی تعداد لگ بھگ دس لاکھ ہے جن میں ۸۰۸۷، قاہرہ یونی ورسٹی کے کالجوں میں ہیں[1] اعلیٰ فنی اور سائنٹیفک مہارت کے لئے طلبہ اور فن دانوں کو بڑی فیاضی کے ساتھ یورپ اور امریکہ بھیجا جارہا ہے معاشی ناہمواری کا ایک مظہر یہ ہے کہ قاہرہ میں گھریلو نوکر اور نوکرانیاں جن میں جوان لڑکیوں کا نمایاں تناسب ہوتا ہے، بہت ہیں اور بڑی آسانی سے مل جاتی ہیں، ان کی ماہانہ تنخواہ، کھانے کپڑے کے علاوہ تیس سے ستر روپئے تک ہوتی ہے۔ قاہرہ کے باشندے کھانے اور پہننے دونوں کے شوقین ہیں، جو لوگ دونوں شوق پورے نہیں کرسکتے، وہ پہننے کے شوق کو ترجیح دیتے ہیں۔ آپ ادنیٰ ملازم اور مزدور کے پیر میں بھی موزہ اور پالش کیا جوتا دیکھیں گے۔

لباس کئی صنف کے ہیں: مردانہ لباس میں کوٹ پتلون اور ٹائی کو غلبہ حاصل ہے۔ خوش حال، تعلیم یافتہ اور ملازم پیشہ لوگوں کا یہ عام لباس ہے۔ بہت سے نادار، جاہل یا نیم جاہل ایک نہایت چوڑی آستینوں کی ڈھیلی ڈھالی قمیص پہنتے ہیں جو ٹخنوں یا زمین تک نیچی ہوتی ہے۔ اس قمیص کو جَلَّبِیَہ کہتے ہیں، یہ مصریوں کا آبائی لباس ہے، بعض جَلَّبِیَہ پوش کپڑے یا اون کی گول ٹوپی بھی پہنتے ہیں۔ ازہر یونی ورسٹی کے استاذ اور طلبار کا لباس قفطان ہے جو جَلَّبِیَہ کی کچھ ترمیم شدہ شکل ہے دونوں میں فرق یہ ہے کہ جَلَّبِیَہ کا گریبان قمیص کی طرح چھوٹا ہوتا ہے، اور قفطان میں گریبان نہیں ہوتا اس کے دونوں پلّے اوور کوٹ کی طرح ہوتے ہیں۔ زنانہ لباس دو سے زیادہ رائج ہیں: نصف پنڈلی اور بانہیں کھلا اسا (۲) بلاؤز اور ایک چسپت نصف ساق غرارہ جس میں کولھوں اور رانوں کے نشیب و فراز صاف نظر آتے ہیں۔ اس زیریں لباس کا نام فُستان ہے۔ زیادہ شوقین طبیعت اور آزاد منش، خصوصیت کے ساتھ عیسائی خواتین یہ لباس پہنتی ہیں۔ محتاط گھروں کی مسلمان عورتوں نے ابھی اس کو اختیار نہیں کیا ہے، لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ ایک دن چھا جائے گا۔

---

[1] یہ وزیر تعلیم کی رپورٹ سے اقتباس ہے جو "الاخبار" میں ۲۷ اگست ۵۸ء کو چھپی تھی۔

(۳) سایہ، سر کا رومال اور ایک سیاہ چادر جو چہرہ چھوڑ کر باقی جسم پر لپیٹ لی جاتی ہے یہ غریب، جاہل یا نیم جاہل گھرانوں کی عورتیں یہ لباس پہنتی ہیں۔ میں نے ایک معزز مصری سے پوچھا: کیا یہ چادر پردہ کے لئے اوڑھی جاتی ہے؟ بولے: جی ہاں، لیکن جسم کے پردہ کے لئے نہیں بلکہ افلاس کے۔ چونکہ ان کے کپڑے میلے پھٹے یا گھٹیا ہوتے ہیں اس لئے چادر کے غلاف سے ان کو چھپائے رکھتی ہیں، اگر ان کی مالی حالت بہتر ہو جائے تو یہ چادر اوڑھنا چھوڑ دیں۔

قاہرہ کے لوگ عام طور پر خلیق، ملنسار اور ہم سے بہتر شہری ہیں۔ آپ کسی طبقہ میں چلے جائیے آپ کا استقبال ضرور "اہلاً و سہلاً" کے محبت بھرے الفاظ سے کیا جائے گا اور آپ کی خاطر قہوہ یا چائے کی پیالی سے کی جائے گی۔ یہ اچانک آنے والے مہمان کی تواضع کا عام طریقہ ہے، جب کسی کو مدعو کیا جاتا ہے تو کھانے کی چیزیں۔ کیک، پیسٹری وغیرہ بھی پیش کی جاتی ہیں۔ ہند کے سیاسی موقف کی وجہ سے ہند اور اہل ہند کا خیال کیا جاتا ہے۔ بارہا سڑکوں پر آتے جاتے مجھ سے پوچھا تم کس ملک سے آئے ہو اور جب میں کہتا ہند سے تو پوچھنے والا خوش ہو کر فرماتا: ہند کُوَیس، نہرو کُوَیس۔ یعنی ہندوستان اچھا ہے، نہرو اچھے ہیں۔

قاہرہ میں اخبار اور رسالے بہت پڑھے جاتے ہیں۔ وہاں پر صبح کے وقت انگریزی اور فرانسیسی کے علاوہ عربی کے پانچ چھ اخبار نکلتے ہیں جیسے الأخبار، شعب، اہرام، جمہوریہ اور دو پہر کو غالباً دو۔ مسار اور قاہرہ ان کے علاوہ متعدد رسالے اور میگزینیں۔ ہر تیسرے چوتھے دن شائع ہوتی ہیں جن کو بڑے شوق اور دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے۔ اخباروں میں مقامی یا مشرق اوسط کے احوال و کوائف روس، یورپ اور امریکہ کی سیاسی، صنعتی اور علمی خبروں کی خاص اشاعت کی جاتی ہے، مشرق یا مشرق بعید سے التفات کم ہے ہاں پنڈت نہرو کی تقریروں، اپیلوں کے اقتباس جلی قلم میں دئے جاتے ہیں اور ہندی وباؤں اور طغیانیوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاتا۔ مصری صحافت اور مصر کے تعلیم یافتہ لوگ جن کو چند سال پہلے تک مغرب میں آزادی اور روشنی اور مشرق میں غلامی اور اندھیر نظر آتا تھا، اپنی اور ہندوستان کی آزادی کے بعد، ہندی فلسفہ، تاریخ اور ہندی مسائل سے دلچسپی لینے لگے ہیں جس کے زیر اثر اخباروں

اور رسالوں میں کبھی کبھی کسی ہندی موضوع پر مضمون نظر آجاتے ہیں۔

رسالوں میں سماج و سیاست کے ہنگامی مسائل کو اہمیت دی جاتی ہے اور ہر مضمون کے ساتھ عمدہ فوٹو ہوتے ہیں، مصر میں طباعت اور اخباری فوٹوگرافی دونوں کا فن اور مذاق اعلیٰ ہے۔ شائع ہونے سے دو ایک دن پہلے رسالوں کے مضامین کا روزناموں میں جاذب نظر انداز سے اعلان ہو جاتا ہے۔ وہ رسالے زیادہ محبوب ہیں جن میں شوق انگیز موضوع دل کش اسلوب میں پیش کئے جاتے ہیں یا سماجی حادثوں کا ذکر ہوتا ہے۔ جیسے قتل، خودکشی، یا کسی فلم ایکٹرس یا کسی مشہور گانے والے، یا کسی عرب رئیس کی شادی، طلاق اور عشق کی روداد، ان رسالوں میں حادثوں کی صحافتی تحقیق، کسی مختلف خبر یا چھپے ہوئے مسئلے پر صحافتی ملاقاتیں، شارٹ اسٹوریاں اور افسانے بھی چھپتے ہیں اور ہر عنوان کے تحت کئی کئی عمدہ فوٹو ہوتے ہیں سماجی حادثوں اور صحافتی تحقیقات کو پیش کرنے کا مقصد محض سامان تفریح فراہم کرنا نہیں ہوتا بلکہ غیرت دلانا، ضمیر بیدار کرنا اور افراد کی برائیوں کو بے نقاب کرنا ہوتا ہے۔ سماج و افراد کی برائیوں کا پردہ چاک کرنے میں اخبار بھی پیش پیش رہتے ہیں، ہمارے اخبار اور خاص طور سے انگریزی کے معیاری روزنامے پہلے صفحے پر یا بڑی سرخی دے کر جرائم، یا افراد کے کرتوتوں کا مشکل ہی سے ذکر کرتے ہوں گے، لیکن قاہرہ کے اخبار بڑے جوش سے ایسا کرتے ہیں۔ اکتوبر کی ایک صبح وہاں کے روزنامہ "الاخبار" میں یہ بڑی سرخی دیکھ کر حیرت ہوئی: "سعود یتزوج" یعنی شاہ سعود جن کی عمر ۶۱ سال ہے لبنان کی ایک سولہ سالہ لڑکی سے شادی کر رہے ہیں۔ کئی دن تک اس موضوع پر مفصل خبریں آتی رہیں، اس سلسلہ میں کئی فوٹو بھی چھپے، ایک میں شاہ سعود مسکراتے ہوئے لڑکی سے ہاتھ ملا رہے ہیں، دوسرے میں لڑکی کی ماں کے ساتھ کمرے میں بیٹھے چائے پی رہے ہیں، "الاخبار" جو میں روز پڑھا کرتا تھا دلچسپ اور متنوع معلومات سے پر ہوتا ہے، اس کی قیمت ایک قرش یا نو پیسے ہے، قاہرہ کے سارے روزناموں کی یہی قیمت ہے، اس میں آٹھ صفحے ہوتے ہیں، صنعتی نمائشوں کے زمانہ میں جو قاہرہ میں تیسرے چوتھے مہینے ہوتی رہتی ہیں اس کا حجم بڑھ جاتا ہے، اس کے آخری صفحہ پر "یومیات" کے عنوان سے کئی کالم ہوتے ہیں جن میں اس کے کئی اڈیٹروں میں سے کوئی ایک مصر کے کسی معاشی یا سیاسی یا تاریخی موضوع پر اپنے تاثرات پیش کرتا ہے یا کسی کتاب یا اکتشاف یا کسی ملک کی ترقی پر تبصرہ کرتا ہے۔ "یومیات" کے موضوعات کا دائرہ

بہت وسیع ہے۔ اس صفحہ پر جلی خط میں ایک کالم "فکرہ" کے عنوان سے ہوتا ہے جس میں کوئی مشورہ یا نصیحت ظریفانہ انداز میں قوم کے لئے ہوتی ہے۔ ہفتہ میں ایک بار اس صفحہ پر "للنساء فقط" کے عنوان سے ایک کالم ہوتا ہے جس میں عورتوں کے مطلب کی باتیں ہوتی ہیں۔ اس صفحہ کا چھٹا حصہ ادب، یونیورسٹی، فلم، عورتوں اور بچوں کے لئے مخصوص ہے۔ شاید ستمبر کے مہینہ میں قصابوں کی یونین اور حکومت کے مابین نرخ کے معاملے میں اختلاف ہوگیا تھا، "الاخبار" نے سیدات یعنی عورتوں کے نام پہلے صفحہ پر موٹے حروف میں ایک اپیل چھاپی کہ جب تک قصاب حکومت کے مقررکردہ نرخوں پر گوشت نہ بیچیں، ان کا بائیکاٹ کیا جائے۔ اپیل نے جادو کا اثر کیا، سیدات نے گوشت خریدنا اور کھانا بند کردیا، قصاب گھٹنوں کے بل گر پڑے۔ مصر میں لیلۃ القدر کے موقع پر خدا کے حضور تمنائیں پیش کی جاتی ہیں۔ مثلاً کوئی نوکری کی تمنا کرتا ہے، کوئی ریڈیو کی۔ کوئی سینے کی مشین کی، اور کوئی پہننے کے کپڑوں کی۔ الاخبار نے ایک "فنڈ" قائم کیا اور ڈاک کے ذریعے تمنا کرنے والوں کے اقتصادی حالات اور تمنائیں دریافت کیں۔ ایک کمیٹی نے موصول شدہ حالات اور تمناؤں کا جائزہ لے کر ان اشخاص کی تمنا پوری کرنے کی سفارش کی جو معاشی اعتبار سے اس کے مستحق سمجھے گئے۔ اس کے بعد "الاخبار" کی وہ موٹر تمنا کردہ اشیاء اور ضروری اسٹاف کے ساتھ باری باری سے تمنا کرنے والوں کے گھر جاتی ہے تمنا کرنے والا اپنی "مانگی چیز" دیکھ کر مبہوت رہ جاتا ہے، پھر "الاخبار" کے محرر اور اس میں جو دلچسپ اور رقت انگیز مطالعہ ہوتا ہے وہ دوسرے دن صبح کو "لیلۃ القدر علی بابک" کے زیرعنوان نشر کردیا جاتا ہے۔ جن لوگوں کی تمنائیں پوری ہوئیں ان میں ایک عیسائی خاندان بھی تھا۔

قاہرہ بڑا روشن اور رنگین شہر ہے، دہلی کی نسبت آپ وہاں کی سڑکوں، چوراہوں اور بازاروں کو بہت زیادہ روشن پائیں گے۔ گھروں میں بلب کی جگہ برقی جھاڑ فانوس استعمال ہوتے ہیں اور سڑکوں چوراہوں پر تیز دودھیا روشنی کے گلوب اور دکانوں اور نیل کے شاندار پلوں پر برقی ٹیوب۔ رات کو آپ جدھر نکل جائیں، عمارتوں، بازاروں اور چوراہوں پر رنگ برنگے برقی اشتہار انوکھے اندازوں میں آپ کو دعوت دیتے نظر آئیں گے۔ قاہرہ کی دکانیں دہلی کی دکانوں

سے زیادہ صاف، خوش ترتیب اور سجی ہوتی ہیں، یہاں کے پنساری کی دکان ایک قسم کی نمائش گاہ ہوتی ہے جہاں جانے اور خریدنے کو جی چاہتا ہے۔ اس کا نام عربی میں "بقالہ" ہے، یہاں کھانے پینے کا سب سامان بکتا ہے، لیکن یہ سامان یا تو خوب صورت رنگا رنگ لیبل لگے ڈبوں کی شکل میں اونچے اونچے ریکوں میں خوش اسلوبی سے جا ہوتا ہے یا بوتلوں اور پیکٹوں کی صورت میں شیشہ کی الماریوں اور شوکیسوں میں، یہ سامان اتنی مختلف قسموں کا ہوتا ہے کہ اس کی فہرست دینا مشکل کام ہے۔ ہر "بقالہ" میں ایک ریفریجریٹر ہونا لازمی ہے جس میں گرمی سے پگھلنے یا خراب ہونے والی چیزیں جیسے مکھن، پنیر، ابلا گوشت اور انڈے رکھے جاتے ہیں، ایک کاؤنٹر پر دیدہ زیب اسپرنگ دار ترازو لگا ہوتا ہے جس پر از خود سامان تل جاتا ہے۔ قاہرہ میں ہاتھ کا ترازو کوئی نہیں جانتا۔ بقالہ کا بیشتر سامان بر آمد کیا ہوا ہوتا ہے، گھی، دودھ، مکھن، پنیر، انڈے ہند سے بہتر اور سستے لگ بھگ دہلی کے نرخوں پر مل جاتے ہیں، لیکن گوشت بڑا مہنگا ہے، چار سوا چار روپے سیر، گوشت والوں کی دکانیں خوب صاف ستھری ہوتی ہیں اور وہ خود وجیہ و گرانڈیل، ایک سنگ مرمر کا لمبا سا سینہ تک اونچا کاؤنٹر ہوتا ہے جس کے اندر کی جانب اکثر پھول اور گل دستے لگائے جاتے ہیں، دکان کے کسی نمایاں گوشہ میں ایک بڑا ریفریجریٹر ہوتا ہے جس میں گوشت ذخیرہ کر دیا جاتا ہے۔ بہت سے بقالے بالخصوص وہ جن کے مالک .... غیر مسلم ہیں ولایتی شراب بھی بیچتے ہیں، قاہرہ میں ایسی دکانیں بھی ہیں جہاں صرف شراب بکتی ہے، میرا خیال ہے یہاں شراب بیچنے کے لئے کسی خاص لائسنس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ایک باخبر مصری مسلمان نے جو اوامر و نواہی کی تیز حس رکھتے ہیں مجھے بتایا کہ مصری مسلمان شراب نہیں پیتے۔ قاہرہ کے ہر بازار میں آپ کو ایسی دکانیں ملیں گی جہاں محض گل دستے بکتے ہیں، پھول ہی کی بہتات نہیں، اقسام کی بھی کثرت ہے اور گل دستہ بنانے کے ڈھنگ نرالے ہیں۔ ترکاریاں خوب شاداب ہوتی ہیں، گوبھی کے پھول میں نے اکثر بڑے تربوز کی برابر دیکھے۔ کریلے اور لوکی کے لئے مصر کی آب و ہوا سازگار نہیں ہے، بتھوے کا ساگ گھوڑے اور گدھے کھاتے ہیں۔ ہندوستان کے تقریباً سارے مشہور پھل فراوان ہیں: خربوزہ، تربوز، نارنگی، مالٹا، خوبانی، آلوچہ، امرود، ناشپاتی اور سیب، سیب لبنان سے

آتا ہے اس لئے کافی مہنگا بکتا ہے کیلے نہ تو زیادہ عمدہ ہوتے ہیں نہ ہمارے ملک کی طرح ارزاں، روپیہ چودہ آنے کے درجن سوا درجن ملتے ہیں۔ انگور روپیہ سیر ہے۔ مصر کی کھجور لذیذ نہیں ہوتی۔ تازہ انجیر بہت اور سستا ہے۔ چیزوں کے نرخ حکومت مقرر کرتی ہے اور مقررہ نرخ کا لیبل ہر قسم کے سامان پر لگانا ضروری ہوتا ہے، با ایں ہمہ سب دکانوں کے نرخ ایک نہیں ہوتے۔ مصر میں روٹی کو عیش کہتے ہیں، یعنی زندگی۔ ایک موٹی تنوری روٹی کا وزن ڈھائی تین چھٹانک ہوگا ایک آنے میں ملتی ہے۔ ایک میانہ خوراک ہندی دو روٹی سے زیادہ نہ کھا سکے گا اور ایک مصری جوڑا خوش خوراک ہوتا ہے چار سے تجاوز نہیں کرے گا۔ قاہرہ کا مزدور آٹھ آنے کے روٹی سالن میں پیٹ بھر سکتا ہے۔ بنیادی ضرورت یا عام استعمال کی اشیاء پر حکومت کڑی نظر رکھتی ہے، روٹی کی قیمت اور وزن حکومت کا مقرر کردہ ہے، کوئی اس میں کمی بیشی نہیں کر سکتا۔ اور یہی حال مثلاً انگور کا ہے، آپ قاہرہ کے کسی کونے میں چلے جائیں، اس کے نرخ کا لیبل آپ کو ہر جگہ ایک ملے گا۔ قاہرہ کے لوگ جس طرح کھاتے زیادہ ہیں پیتے بھی زیادہ ہیں، ہر چند دکانوں کے درمیان آپ کو ایک شربت کی دکان ملے گی جہاں، نارنگی، انار، انگور، سیب، آم اور دوسرے پھل حسب موسم ہر مرکے کاؤنٹر یا شیشے کی الماریوں میں چنے رکھے ہوں گے، شیشہ کی بڑی صراحیوں میں پھلوں کے شربت بھرے ہوں گے، اگر آپ کسی پھل کا تازہ شربت چاہیں گے تو مشین سے نکال کر فوراً آپ کو دے دیا جائے گا۔ تمر ہندی یعنی املی کا شربت بھی پیا جاتا ہے، گرمیوں میں کوکا کولا بری طرح قاہرہ پر چھا جاتا ہے۔ اس کی بوتل ساڑھے تین آنے میں ملتی ہے۔

میں نے ابھی ادھر کہا کہ قاہرہ بڑا رنگین شہر ہے، واقعی قاہرہ بڑا رنگین ہے، یہاں کے باشندے خوش رنگ اور خوش اندام ہوتے ہیں، آپ کو یوسف و زلیخا کے ہر طرف جلوے نظر آئیں گے۔ یہاں بہت سے پارک اور نزہت گاہیں ہیں، یہاں سے ہو کر سارے عالم کا حسین ترین دریا۔ نیل، نکلتا ہے، قاہرہ کا سب سے بارونق حصہ اس کی دو شاخوں کے اردگرد یا ان سے بننے والے دو بڑے جزیروں پر واقع ہے۔ ان شاخوں میں آپ بہت سے بوٹ ہاؤس دیکھیں گے جن میں قہوہ خانے، نائٹ کلب وغیرہ قائم ہیں، یہاں بہت سے سینما ہیں جہاں یورپ اور امریکا کے اچھے برے فلم دکھائے جاتے

ہیں" یہاں تھیٹر ہیں جہاں کام کے مختلف پہلوؤں پر اصلاحی طنز ہوتا ہے، یہاں ایسے کاؤ ہیں جہاں رات کو ناچ گانا، اور جسم فروشی ہوتی ہے۔ یہاں کئی بڑے اور دل چسپیوں سے بھرے متاحف ہیں اور ایک بہت اچھا زُو (چڑیا گھر) ہے جس میں دنیا بھر کے چرند، پرند اور درندے، سانپ اور بچھو جمع کردئے گئے ہیں، ایک "حدیقۃ الاسماک" ہے جہاں نہایت عمدہ لانوں اور پھولوں کے درمیان رنگ برنگی مچھلیوں کے تالاب ہیں، یہاں بہت سے چائے خانے ہیں جہاں یار دوست مل بیٹھتے ہیں، یا محبوب شامیں گذارتے ہیں، یا چوٹ کھائے دل قہوہ کی پیالی اور سگرٹ کے دھوئیں اور آنے جانے والی صورتیں دیکھ کر غم غلط کرتے ہیں۔ مغرب سے ایک گھنٹہ پہلے قاہرہ کے پارکوں میں بہت سی عورتیں، لڑکیاں اور بچے جمع ہو جاتے ہیں بچے کھیلتے کودتے ہیں، لڑکیاں اپنی ہجولیوں سے، عورتیں اپنی سہیلیوں، شوہروں اور بھائیوں سے ہم کلام ہوتی ہیں، یا اُن ختم نہ ہونے والے قافلوں کو دیکھ کر دل بہلاتی ہیں جو اُن کے آس پاس کی سڑکوں سے برابر گذرتے رہتے ہیں۔ مصر کی موجودہ حکومت نے نیل کے کنارہ میلوں تک ایک خوش نما جنگلا بنوایا ہے جس سے متصل ایک وسیع چبوترہ ہے جس پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پتھر کی بنچیں، سبزہ اور پھول کے تختے ہیں اور سال بھر سبز رہنے والے درختوں کی سیدھی قطاریں، نیل کے کنارہ میلوں تک پھیلے اسی چبوترہ کا نام کورنش ہے، یہاں شام کو بڑی رونق رہتی ہے اور گرمی کے دنوں میں تو میلہ سا لگا رہتا ہے جس میں عورتیں اور بچے زیادہ ہوتے ہیں۔ قاہرہ کی آبادی تیئیس لاکھ ہے لیکن یہاں سائکل اور گھوڑا گاڑی نہ ہونے کے برابر ہے۔ شاید سو میں دو آدمی بھی سائکل نہ چلاتے ہوں۔ عوام کے دو بڑے مصنوعی پیر ہیں: ایک ٹرام اور دوسرا بس، پیسے والے اور ایسے بہت ہیں ذاتی موٹریں رکھتے ہیں جو ایسا معلوم ہوتا ہے سارے قاہرہ میں بکھری ہوئی ہیں۔ موٹر اور پیٹرول دونوں کی قیمت قاہرہ میں کم ہے۔ سارے شہر میں ٹرام کا جال پھیلا ہوا ہے، ہر ٹرام میں بالعموم دو ڈبے ہوتے ہیں، ایک تیسرے درجہ والوں کے لئے، دوسرا پہلے اور دوسرے درجہ کے مسافروں کے لئے، پہلے درجہ میں آرام دہ گدّے ہوتے ہیں، کرایہ ہر فاصلہ کے لئے ایک ہے، پہلے درجہ کا تین سوا تین آنے، دوسرے کا دو آنے، تیسرے کا ایک آنہ، یہ کرایہ دے کر چاہے آپ ٹرام کے ایک ٹرمی نس سے دوسرے تک سفر کیجئے جو کم از کم پانچ چھ میل ہوتا ہے یا ایک دو فرلانگ کا

آتا ہے اس لئے کافی مہنگا بکتا ہے کیلے نہ تو زیادہ عمدہ ہوتے ہیں نہ ہمارے ملک کی طرح ارزاں، روپیہ چودہ آنے کے درجن سوا درجن ملتے ہیں۔ انگور روپیہ سیر ہے۔ مصر کی کھجور لذیذ نہیں ہوتی، تازہ انجیر بہت اور سستا ہے۔ چیزوں کے نرخ حکومت مقرر کرتی ہے اور مقررہ نرخ کا لیبل ہر قسم کے سامان پر لگانا ضروری ہوتا ہے، با ایں ہمہ سب دکانوں کے نرخ ایک نہیں ہوتے۔ مصر میں روٹی کو عیش کہتے ہیں، یعنی زندگی۔ ایک موٹی تنوری روٹی کا وزن ڈھائی تین چھٹانک ہوگا ایک آنے میں ملتی ہے۔ ایک میانہ خوراک ہندی دو روٹی سے زیادہ نہ کھا سکے گا اور ایک مصری جو بڑا خوش خوراک ہوتا ہے چار سے تجاوز نہیں کرے گا۔ قاہرہ کا مزدور آٹھ آنے کے روٹی سالن میں پیٹ بھر سکتا ہے۔ بنیادی ضرورت یا عام استعمال کی اشیاء پر حکومت کڑی نظر رکھتی ہے، روٹی کی قیمت اور وزن حکومت کا مقرر کردہ ہے، کوئی اس میں کمی بیشی نہیں کر سکتا، اور یہی حال مثلاً انگور کا ہے، آپ قاہرہ کے کسی کونے میں چلے جائیں، اس کے نرخ کا لیبل آپ کو ہر جگہ ایک ملے گا۔ قاہرہ کے لوگ جس طرح کھاتے زیادہ ہیں پیتے بھی زیادہ ہیں، ہر چند دکانوں کے درمیان آپ کو ایک شربت کی دکان ملے گی جہاں، نارنگی، انار، انگور، سیب، آم اور دوسرے پھل حسب موسم مرمر کے کاؤنٹر یا شیشے کی الماریوں میں چنے رکھے ہوں گے، شیشہ کی بڑی صراحیوں میں پھلوں کے شربت بھرے ہوں گے، اگر آپ کسی پھل کا تازہ شربت چاہیں گے تو مشین سے نکال کر فوراً آپ کو دے دیا جائے گا۔ تمر ہندی یعنی املی کا شربت بھی پیا جاتا ہے، گرمیوں میں کوکا کولا بری طرح قاہرہ پر چھا جاتا ہے۔ اس کی بوتل ساڑھے تین آنے میں ملتی ہے۔

میں نے ابھی ادھر کہا کہ قاہرہ بڑا رنگین شہر ہے، واقعی قاہرہ بڑا رنگین ہے، یہاں کے باشندے خوش رنگ اور خوش اندام ہوتے ہیں، آپ کو یوسف و زلیخا کے ہر طرف جلوے نظر آئیں گے۔ یہاں بہت سے پارک اور نزہت گاہیں ہیں، یہاں سے ہو کر سارے عالم کا حسین ترین دریا، نیل، نکلتا ہے، قاہرہ کا سب سے بارونق حصہ اس کی دو شاخوں کے اردگرد یا ان سے بننے والے دو بڑے جزیروں پر واقع ہے۔ ان شاخوں میں آپ بہت سے بوٹ ہاؤس دیکھیں گے جن میں قہوہ خانے، نائٹ کلب اور ناچ گھر قائم ہیں، یہاں بہت سے سینما ہیں جہاں یورپ اور امریکا کے اچھے برے فلم دکھائے جاتے

ہیں" یہاں تھیٹر ہیں جہاں کام کے مختلف پہلوؤں پر اصلاحی طنز ہوتا ہے، یہاں ایسے کاڈیتو ہیں جہاں رات کو ناچ گانا، اور جسم فروشی ہوتی ہے۔ یہاں کئی بڑے اور دل چسپیوں سے بھرے متاحف ہیں اور ایک بہت اچھا زُو (چڑیا گھر) ہے جس میں دنیا بھر کے چرند، پرند اور درندے، سانپ اور بچھو جمع کردیے گئے ہیں، ایک "حدیقۃ الاسماک" ہے جہاں نہایت عمدہ لانوں اور پھولوں کے درمیان رنگ برنگی مچھلیوں کے تالاب ہیں، یہاں بہت سے چائے خانے ہیں جہاں یار دوست مل بیٹھتے ہیں، یا محبوب شامیں گذارتے ہیں، یا چوٹ کھائے دل قہوہ کی پیالی اور سگرٹ کے دھوئیں اور آنے جانے والی صورتیں دیکھ کر غم غلط کرتے ہیں۔ مغرب سے ایک گھنٹہ پہلے قاہرہ کے پارکوں میں بہت سی عورتیں، لڑکیاں اور بچے جمع ہوجاتے ہیں بچے کھیلنے کودنے ہیں، لڑکیاں اپنی ہجولیوں سے، عورتیں اپنی سہیلیوں، شوہروں اور بھائیوں سے ہم کلام ہوتی ہیں، یا اُن ختم نہ ہونے والے قافلوں کو دیکھ کر دل بہلاتی ہیں جو اُن کے آس پاس کی سڑکوں سے برابر گذرتے رہتے ہیں۔ مصر کی موجودہ حکومت نے نیل کے کنارہ میلوں تک ایک خوشنما جنگلا بنوایا ہے جس سے متصل ایک وسیع چبوترہ ہے جس پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پتھر کی بنچیں، سبزہ اور پھول کے تختے ہیں اور سال بھر سبز رہنے والے درختوں کی سیدھی قطاریں، نیل کے کنارہ میلوں تک پھیلے اسی چبوترہ کا نام کورنش ہے، یہاں شام کو بڑی رونق رہتی ہے اور گرمی کے دنوں میں تو میلہ سا لگا رہتا ہے جس میں عورتیں اور بچے زیادہ ہوتے ہیں۔ قاہرہ کی آبادی تیئس لاکھ ہے لیکن یہاں سائکل اور گھوڑا گاڑی نہ ہونے کے برابر ہے۔ شاید سو میں دو آدمی بھی سائکل نہ چلاتے ہوں۔ عوام کے دو بڑے مصنوعی پیر ہیں: ایک ٹرام اور دوسرا بس، پیسے والے اور ایسے بہت ہیں ذاتی موٹریں رکھتے ہیں جو ایسا معلوم ہوتا ہے سارے قاہرہ میں بکھری ہوئی ہیں۔ موٹر اور پٹرول دونوں کی قیمت قاہرہ میں کم ہے۔ سارے شہر میں ٹرام کا جال پھیلا ہوا ہے، ہر ٹرام میں بالعموم دو ڈبے ہوتے ہیں، ایک تیسرے درجہ والوں کے لئے، دوسرا پہلے اور دوسرے درجہ کے مسافروں کے لئے، پہلے درجہ میں آرام دہ گدّے ہوتے ہیں، کرایہ ہر فاصلہ کے لئے ایک ہے، پہلے درجہ کا تین سوا تین آنے، دوسرے کا دو آنے، تیسرے کا ایک آنہ، یہ کرایہ دے کر چاہے آپ ٹرام کے ایک ٹرمی نس سے دوسرے تک سفر کیجیے جو کم از کم پانچ چھ میل ہوتا ہے یا ایک دو فرلانگ کا

ٹرامیں اتنی زیادہ چلتی ہیں کہ بھیڑ کے مواقع کم پیدا ہوتے ہیں، اسکول، کالج اور دفتر کو جانے اور وہاں سے لوٹنے کے وقت یا شام کو جب سیر و تفریح کا دور شروع ہوتا ہے ٹراموں پر کم اور بسوں میں زیادہ رش ہو جاتا ہے۔ بس سروس ٹرام سے زیادہ وسیع اور ہمہ گیر ہے، بسیں ان محلوں اور راہوں سے بھی گذرتی ہیں جہاں ٹرامیں نہیں جاتیں یا جہاں گذشتہ پندرہ بیس سال میں نئی بستیاں ابھر آئی ہیں۔ بس سروس منظم و باضابطہ ہے لیکن بعض وقت بسوں میں پریشان کن بھیڑ ہو جاتی ہے۔ ہر بس اسٹاپ پر بڑی خوش سلوبی سے لوہے کے رنگے کھمبوں پر شیشہ کی تختیاں لگی ہیں جن پر موٹی سُرخ لکیر سے بس کا راستہ اور کالے خط میں راستہ پر واقع ہونے والے اسٹاپوں کے نام درج ہیں۔ یہ تختیاں رات میں مخفی بلبوں سے منور ہو جاتی ہیں۔ بسیں اور ٹرامیں دونوں دہلی کی بسوں اور ٹراموں سے زیادہ صاف رکھی جاتی ہیں۔ نئی بسیں جرمنی سے آئی ہیں، ان کے انجن پیچھے ہوتے ہیں اور اسپرنگ اتنے لچکدار کہ مسافر بڑے آرام سے سفر کرتے ہیں۔ قاہرہ کی سڑکیں کافی چوڑی ہیں، سڑک کے وسط میں ٹرام کی پٹری اور اس سے چڑھنے اترنے کے لئے پتلے لمبے اسٹاپ اور پٹری کے دائیں بائیں سڑک پر ٹریفک کے جانے اور آنے کے الگ راستے ہیں۔ سڑک کے دونوں جانب پیدل چلنے والوں کے لئے فٹ پاتھ ہیں۔ قاہرہ کی بسیں ٹرامیں صبح پانچ بجے سے رات کے ایک بجے تک چلتی ہیں، اتنی رات گئے تک چلنے کی وجہ یہ ہے کہ قاہرہ کے بہت سے باشندے آدھی رات گھروں سے باہر تفریح گاہوں میں گذارتے ہیں۔ (باقی آئندہ)

ضروری اطلاع

"بھوک سے خطرہ ہے!"

از

(جناب شمس نوید صاحب)

سماج اور تمدن کے حدود اربعہ پر ایک ہی تحریر آویزاں ہے "بھوک سے خطرہ ہے!"۔ آبادی کے تمام تر طول و عرض میں عجیب عجیب نیرنگیوں کے ساتھ اس تحریر کی تشریح و ترجمانی ہو رہی ہے۔

• کہکشاں کی طرح خوبصورت چراغاں میں جگمگاتی ہوئی سربفلک حویلیاں خمیدہ جھونپڑوں سے سراسیمہ نظر آتی ہیں کہ مبادا وہ ایک بے پناہ انتقام کے طور پر کسی دن اُن پر طوفانی ظلمتوں کی بوچھار کر ڈالیں! سکوں اور روٹیوں کے ڈھیر سے لدے ہوئے انسان ان فاقہ کش روحوں سے خوفزدہ ہیں جو ان ایوانوں کے نزدیک سے یوں افتاں خیزاں گذر رہی ہیں جیسے موت کے سائے۔ وہ اس لئے "خوفناک" ہیں کہ کہیں ایک دن مجنونانہ بدحواسی کے عالم میں وہ اپنے معدہ کی ساہا سال کی اشتہار کے خلاء پر کرنے کے لئے دیوانہ وار ٹوٹ نہ پڑیں! یہ روشنی کے بھکاری اور اندھیروں کے لیٹرے انسانیت کے اس متعفّن مادہ سے "دودھاری" خطرہ کی تخلیق کرتے ہیں۔

• اخلاقی جنون رکھنے والے مصلحین اس خیال سے لرزہ براندام ہیں کہ بھوک ناداری و افلاس کی گود میں گناہ کو جنم دے رہی ہے۔ یہاں تک کہ سلطنتیں اور ریاستیں بھوکوں اور ننگوں کو اس لئے ایک وسیع پیمانہ پر کھلا ہوا خطرہ تصور کرتی ہیں کہ حکومت کے خلاف جب کوئی سیاسی وبا پھیلتی ہے تو یہی لوگ اس کا بدترین شکار ہوا کرتے ہیں۔ آہ زندگی کے اس جھلستے ہوئے "کچھ نہیں" کی تقدیر زبوں! یہ سب سے ڈرتا ہے اور سب اس سے ڈرتے ہیں! - یہ خود ہی اندر ہی اندر منجمد ہوا جا رہا ہے مگر دنیا اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہے "یہ ایک سربستہ آتش فشاں کا دہانہ ہے جو کسی بھی لمحہ ناگہانی طور پر اپنے اندر چھپی ہوئی "آتشِ سیال" کو آزاد کر سکتا ہے اور تباہی کے گوناگوں شعلوں اور چنگاریوں

کی مہیب لپیٹ میں تمدن کے قلب کو راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کر سکتا ہے!"

مصلحین اس محاذ پر ابھرتے ہیں۔ فلسفہ، آرٹ اور سائنس بھوک کے خلاف عرق ریز مہم کو کامیاب بنانے کے لئے اپنا بہترین سرمایہ پیش کرتے ہیں۔ فلسفہ بھوک کے اسباب و عوامل کو تلاش کرتا ہے سائنس بہترین فصلیں اگانے کی راہیں دکھاتی ہے اور آرٹ انقلاب کی لہروں کو زندگی کے ہر ایک گام تک پہنچاتا ہے —— بایں ہمہ بھوک جہاں تھی وہیں پر ہے! اگر مشکل یہ ایک جگہ سے ہٹتی ہے تو دوسری جگہ پر متمکن ہو جاتی ہے۔ اگر اس کی ایک صورت پر قابو پا لیا جاتا ہے تو یہ دوسرا روپ دھارن کر لیتی ہے۔ کچھ ملک ایسے ہیں جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انھوں نے بھوک کو اپنی سرحدوں سے باہر نکال دیا ہے اور وہ اس دعوے میں بالکل سچے بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس حقیقت کی طرف سے ان کی آنکھیں بند ہوتی ہیں کہ اگرچہ وہاں بھوک کا دور دورہ نہیں مگر وہ "خطرات" جو وہ اخلاقی انحطاط، روحانی خودکشی اور فرد کی سیاسی پائمالی کی صورت میں اپنے پیچھے چھوڑ آئی ہے وہ ضرور زندہ اور موجود ہیں۔ جہاں بھوک کی جگہ اس قدر "نگلنے والے جبڑوں" نے لے لی ہو وہاں بھوک کو جلاوطن کرنے کے دعوے میں کیا دلکشی باقی رہ سکتی ہے! ایسی مثالوں سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بھوک اپنا کام کر چکی اور تباہ شدہ علاقہ کو خیرباد کہہ دیا! یہ تو فائدہ کم ہے اور نقصان زیادہ۔

مدت دراز سے بھوک کا مسئلہ انسانی عقل و شعور کو پیچ و تاب کھلا رہا ہے۔ فکری نوبنو سطح پر بھوک پھیلنے کی مختلف وجوہات کا سراغ لگایا گیا ہے۔ ان میں سے وہ چند وجوہات جو سب سے زیادہ معقول اور اہم تسلیم کی گئی ہیں یہ ہیں:۔

۱۔ **زمین کی زرخیزی کی تباہی** زمین پر بار بار کاشت کرنے، فصلوں کی تباہی اور جنگلوں کی قطع و برید کر کے ان کی جگہ نئی نئی شہری تعمیرات پھیلانے سے زمین کی زرخیز فطرت کو جو صدمات پہنچے ہیں ان سے پیداوار کے زوال اور اس سے بھوک کے پھیلاؤ کا نقطۂ نظر قایم کیا جاتا ہے۔ "سر جان ہائیڈ اور" نے اپنے ایک مضمون میں جو ڈیلی میل لندن کے اولین صفحات پر شائع ہوا ہے اس ضمن میں حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا ہے:۔

"کاشت شدہ زمینوں کی قوت نمو کی تباہی سے زرخیزی کو جو نقصان پہنچ رہا ہے اس نے صورت حال کو

نازک سے نازک تر بنا چھوڑتا ہے۔ قدرت کو زرخیز اور قابل کاشت زمین کا ایک انچ حصہ دوبارہ بحال کرنے میں پانچ سو سال درکار ہوتے ہیں۔ انسان اپنے غلط استعمال کی بدعنوانی سے آٹھ انچ زمین کو دو تین پشتوں اور نسلوں میں خراب کر دیتا ہے۔

جب سے نوع انسان نے بڑے بڑے شہر تعمیر کرنا شروع کئے ہیں ٹھیک اسی وقت سے زمین کی تباہی کا سلسلہ جاری چلا جا رہا ہے۔ جنگل کاٹ ڈالے گئے اور ان کی لکڑی شہر کے ایندھن اور تعمیراتی ضرورتوں کے لئے سپلائی کر دی گئی۔ اور جو زمینیں شہروں کے بالکل متصل تھیں ان پر کاشتکاری نے ضرورت سے زیادہ کاشت کا بوجھ ڈال دیا تاکہ اس طرح شہر میں غذا کی ضرورت پوری کی جا سکے"۔

۲۔ آبادی میں اضافہ | ماہرین حیاتیات کا اندازہ ہے کہ دنیا کی آبادی روز افزوں ترقی پذیر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا کی مردم شماری تمام دنیا میں ہر دس سال کے اندر پندرہ کروڑ کے حساب سے ضرب کھاتی ہوئی بڑھ رہی ہے اگر امراض اور وباؤں سے واقع ہونے والی اموات پر کامیابی کے ساتھ قابو پایا جا سکے تو یہ دس سالہ اضافہ ایک ارب کے پیمانہ پر چل پڑے گا۔ بحولہ سابقہ مسٹر آور کے اسی مقالہ کے الفاظ میں "آبادی کا بڑھتا ہوا دھارا اور زمین کی زرخیزی کا گرتا ہوا ذخیرہ ہماری تہذیب کے لئے عظیم ترین خطرہ بن کر رہ گیا ہے"۔

۳۔ دولت کی غلط تقسیم | بھوک کی آتش فشانی کے سلسلہ میں یہ "تازہ ترین" زاویۂ خیال ہے جو انقلابی زور کے ساتھ سماجی اقتصادی اعتبار سے پیش کیا جاتا ہے اس نظریہ کے مطابق سماجی زندگی اقتصادیات کے دائرہ میں کمزور پر طاقتور کی لوٹ کھسوٹ اور غارت گری (Exploitation) کے ذریعہ دھیرے دھیرے بگڑتا رہتا ہے بہت سے لوگوں کا خون محنت کے ظالمانہ حقیر اور غیر منصفانہ معاوضہ کے ذریعہ چوسنے کے لئے کچھ لوگ دولت پر قابض ہونے لگتے ہیں اور سرمایہ اندوزی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ سماجی اقتصادی ناانصافی اور عدم مساوات کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ سوسائٹی خواص اور عوام کے بکھرے ہوئے شیرازہ میں تبدیل ہو جاتی ہے اور انسانیت کا سحابیہ پھٹ کر سیکڑوں ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتا ہے جن کی اکثریت ماتحت سیاروں کی حیثیت سے چند بڑے ستاروں کے گرد گردش کرنے لگتی ہے۔ وہ غالب و حکمراں سرمایہ پرست جو "دولت کو برائے دولت" جمع کرتے ہیں گوشہ گوشہ سے صرف اس لئے دولت کھینچتے ہیں تاکہ اس کو تہ بہ تہ جمع

کرتے چلے جائیں مارکسی اصطلاح میں اس "مردہ سرمایہ" کے اضافہ سے سرمایہ کی گردش جو اقتصادیات کا خون حیات ہے سُست ہونے لگتی ہے اور عوامی اقتصادی نشو و نما کی رفتار رک جاتی ہے۔ یہیں سے سماجی زوال کا رُخ افلاس اور بھوک کے پھیلاؤ کی طرف تیز ہو جاتا ہے۔

آیئے اب ذرا ان تینوں زاویہ ہائے نگاہ اور ان مسائل کے حل کے لئے انسان کے رائج الوقت اقدامات کا جائزہ لے کر ان کی معنویت و حقیقت کی آزمائش کریں۔ یہ تمام نظریات اگرچہ نظریاتی انداز میں مختلف ہیں لیکن پھر بھی ایک مشترک کوتاہی بصیرت اور کم نگاہی سے دھندلائے ہوئے ہیں۔ پُرجوش اور شاید پرخلوص طور پر آگے بڑھتے ہوئے نظریات اس سے پہلے کہ بھوک کے پھیلاؤ کے آخری سبب کو گرفت میں لا سکیں اچانک اور قبل از وقت دھاگے کی طرح ٹوٹ جاتے ہیں اور بے وقت مرجاتے ہیں!"

۱۔ زرخیزی کی تباہی کیوں؟ پہلے قدم پر ہم زرخیزی کی تباہی کی بحث کو لیتے ہیں۔ اس اسلوب فکر کے نزدیک شہروں کی تعمیر جدید سے جس کو "غلط استعمال کی بدعنوانی" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے زرخیزی کی طاقت کو سنسنی خیز صدمہ اور مہلک نقصان پہنچا ہے۔ لیکن اس کے بعد؟۔ یہ قدرتی وسائل کی غلط استعمال کی بدعنوانیاں آخر کیوں؟۔ اس باب میں ایک حرف نہیں کہا جاتا!۔ اس سمت میں مرض کی بنیادی اور آخری وجہ کا کوئی سراغ نہیں ہے! زمین کی قوت پیداوار کے لئے اندھا دھند نظام تعمیرات کو مضرت رساں تسلیم کیا جاتا ہے مگر ہم ایک قدم اور آگے بڑھ کر یہ سوچنے سے ہچکچاتے ہیں کہ کیا ان سنگ و خشت سے سبزہ زار جھلسے ہیں یا انسانی ہاتھوں سے جنہوں نے زرخیز اور قابلِ کاشت زمین کے کھنڈروں پر نئی تعمیر کی بلند بنیادیں اُٹھائی ہیں؟۔

اشتراکِ عمل کی ضرورت اور انسان کے جمالیاتی رجحانات نے مل کر شہری زندگی اور تمدنی ارتقار کی تعمیر کی ہے۔ قدرت کی سادگی و پرکاری کی فنکارانہ نمائندگی کی سمت میں یہ انسان کا خوبصورت و لطیف اقدام تھا۔ قدرت نے زندگی اور ماحول کا جو سادہ خاکہ انسانیت کے سامنے رکھا تھا انسان کا جذبۂ تخلیق اس میں رنگ آمیزی کے لئے بے چین تھا۔ کائنات کے خواب کی تکمیل کے لئے قدرت خود انسانی

وجود میں ودیعت کی ہوئی صلاحیتوں کو خوابیدگی سے بیداری کی طرف لانا چاہتی تھی۔ انسانی جذبات وافکار سے اُبلتا ہوا یہ تہذیب کا دھارا اپنی ہر حیوانی خواہش اور ضرورت کو نفاست اور لطافت، حسن وجمال اور تعمیر وارتقار کے سانچہ میں ڈھالنے کے لئے آگے بڑھا۔ یہ طوفان جس قدر حسین تھا اتنا ہی ہولناک اور پُرخطر بھی تھا! کیوں کہ خارجی اور داخلی قوتوں کے درمیان "ہم آہنگی" آسان نہ تھی۔ ایک طرف فطری حقایق اور قدرتی اقدار کی دعوت تھی کہ آرٹ اور تہذیب کو اس کے سانچہ میں ڈھالا جائے تو دوسری طرف انسانی نفس وجبلت کی جذباتی کشش تھی جو تہذیب کو تصنع اور تکلف کی قدروں پر تشکیل دینا چاہتی تھی۔ ایک طرف یہ امکان تھا کہ انسانی آرٹ اور تہذیب کی تخلیقی صلاحیتیں فطری قوانین اور آداب زندگی میں خود کو جذب کردیں تو دوسری طرف یہ خطرہ کہ انسانیت کے تخلیقی جنون میں خود فطرت کا نظام حیات گم ہو کر نہ رہ جائے۔ اس دوسری صورت حال کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ زندگی کا پورا نظام ایک مصنوعی فطرت بن کر رہ جائے جس میں بظاہر وہی حسن وجمال پایا جائے جو فطرت کے تقاضوں میں موجود ہے مگر اندر سوائے ایک مہیب خلا اور کھوکھلے باطن کے کچھ باقی نہ رہے بالکل جس طرح ماحول میں آج چاروں طرف ہم ہزاروں مصنوعی اشیار کی نمائشی تصاویر زندگی کے ہر گام پر آراستہ دیکھ رہے ہیں کہ وہ حقیقت کی کامیاب ترین نقل کے باوجود خود کوئی مفید حقیقت نہیں ہیں۔ مذہب — صحیح اور صحت مند مذہب اس خارجی اور داخلی انتخاب کے معرکہ زار میں طبیعات اور مابعد الطبیعات، مادہ اور روح کو ایک دوسرے سے وابستہ کئے ہوئے انسانی تخلیقی قوت کو فطری صداقتوں کی شاہراہ پر تیز گام دیکھنا چاہتا تھا مگر تہذیب کے پردہ میں انسانی نفس وجبلت کی طاقت تہذیب وتمدن کے قافلے کو مصنوعی صداقتوں اور خوبصورت منافقت کی سمت میں مسلسل کھینچ رہی تھی۔ شاید اسی رجحان پر الیکسس کارل نے اپنی کتاب "انسان — ایک راز سربستہ" (Man - the Unknown) میں روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:— "واقعہ یہ ہے کہ محض سائنس اور علم ہمیں براہ راست کوئی گزند نہیں پہنچاتے۔ لیکن جس وقت ان کی دل فریب رعنائی ہمارے ذہن پر غالب آتی ہے اور ہمارے خیالات کو "بے جان مادہ" کے دائرہ میں گرفتار کرلیتی ہے تو یہ ہمارے لئے مخدوش ہو جاتے ہیں۔" تہذیب کی

مصنوعی اور مادہ پرستانہ قدروں کے برخلاف مذہب کی فطری اقدار کے متعلق ہند کی روحانی اور علمی شخصیت راجگوپال اچاریہ نے اس طرح اظہارِ خیال کیا تھا:۔

"تمام ممالک اور تاریخ کے ہر ہر دور میں ـــــ اگر ہم غیر متعصب ذہن کے ساتھ معاملات کا تنقیدی جائزہ لیں ـــــ تو ہم یہ بات دیکھ سکتے ہیں کہ اپنی ہر کوتاہ کاری یا خامی کے باوجود یہ صرف "مذہب ہے جس نے اقدارِ خیر کے شعور کو پروان چڑھایا ہے، ہر قسم کی ترغیباتِ گناہ کے مقابلہ میں انسان کی حفاظت کی اور نیک معرکوں کے لئے جینے، جدوجہد کرنے اور جان دے دینے کی جرأت عطا کی"

(رسالہ الاسلام (انگریزی) کراچی - ۱۵ر جنوری ۵۸ء)

یورپ میں تہذیب جدید کا آغاز ہی مذہب کے خلاف ردِ عمل سے شروع ہوتا ہے ـــــ ایک تہذیب جس میں انسانی جذبۂ تخلیق قدرتی تخلیق اور فطری اقدار سے ہم آہنگ ہونے میں ناکام ثابت ہوا ہے۔ ایک تہذیب جس کو انسان کی مادہ پرستی کے مصنوعی میلانات نے تراشا ہے اور انسانیت کے لئے ایک بناوٹی، پر تکلف زندگی کی تعمیر کا زبردست تجربہ کیا ہے۔ اس کا روشن ثبوت یہ ہے کہ جہاں جہاں تک اس تہذیب کا سیلاب پہنچا ہے وہاں وہاں مذہبی صداقتوں اور فطری سادگی پر زوال آتا گیا۔ آج دیہات اور شہر کے درمیان جو نمایاں فرق پایا جاتا ہے وہ اسی حقیقت کی تصویر کشی کرتا ہے۔ دیہات جو تہذیب کی لہروں سے نسبتاً دور رہے ہیں فطری سادگی اور سچائی کے زیادہ قریب ہیں۔ اگرچہ ان کی یہ سادگی حقیقی تہذیب سے ناآشنا ہونے کی وجہ سے اجڈ اور اکھڑ ضرور ہے۔ لیکن شہر جو تہذیب کے منجدھاروں میں واقع ہیں مصنوعی زندگی میں بالکل غرق اور فطری صداقت سے میلوں دور ہیں۔ یہ شہر انسان کی اسی تہذیب کے ارتقائی عمل سے معرضِ وجود میں آئے ہیں تمام علوم و فنون اور ادبیات نے مشینی اور تکنیکی ارتقاء کے ساتھ ساتھ ذہن کے ان خود پرستانہ مصنوعی رجحانات میں شدت بھی پیدا کی ہے۔ انسانی فطرت کو اب ایک بدلے ہوئے برعکس ماحول میں اس تبدیلی سے خود بھی گذرنا پڑا جو اس کے چاروں طرف ہر شے پر پرتو ڈالتی جا رہی تھی فنی اور مصنوعی رنگینیوں کی طغیانی میں انسان کی "قدرتی تمنائیں" پس منظر میں ڈوبتی چلی گئیں۔ مذہبی مابعد الطبیعاتی میلانات کی کمزوری سے دنیا کا رشتہ باقی کائنات سے ٹوٹتا چلا گیا۔ زندگی کا زاویۂ نظر

دنیوی، مادی اور تنگ و محدود ہوتا چلا گیا۔ مادی تہذیب نے دنیا کو انسان کی آخری قیام گاہ کی دیدہ زیب شان و شوکت میں غرق کر دیا۔ دنیا کی ساری زندگی کسی دوسری زندگی اور دوسرے بلند تر مقصد کا ذریعہ بننے کے بجائے اب خود آخری مقصد بن گئی۔ دنیوی زندگی کا استحکام اور مادی خوشحالی ایک منزل کی طرح قلب میں پروان چڑھنے لگی۔ ذاتی مفادات دوسروں کے مفادات سے ٹکرانے لگے۔ تہذیب کے پردہ میں محبت منافقت میں تبدیل ہونے لگی۔ قربانی اور ایثار اب ایک ماہرانہ کاروباری خود کامی کے سانچے میں ڈھل گئے۔ جہد للحیات کا نظام تہذیب کے مصنوعی حسن و جمال سے آراستہ خود غرضی کے تصادم کو تیز کرتا گیا۔ اور خود غرضی کا یہ سیاہ دھبہ تمام قلب انسانی پر پھیلتا چلا گیا جس نے تہذیب کے قلب کو سیاہ کر کے رکھ دیا! ۔ اور ایسا ہونا ہی تھا! ۔ زندگی اپنی فطرت کے تقاضوں کو ختم نہیں کر سکتی ان کے راستوں کو بدل سکتی ہے۔ خود کو باقی رکھنے کا جذبہ جو مذہب کے زیر سایہ آفاقی اور کائناتی تھا وہ ارضی زندگی کے ہر اخلاقی عمل کے انعام کا انتظار قبر کے بعد کی دوسری زندگی کے حصول تک بخوشی کر سکتا تھا۔ یہ کائناتی نقطۂ نظر ایک وسیع نقطۂ نظر تھا لیکن جیسے جیسے یہ نقطۂ نظر کرۂ ارض تک محدود ہوتا چلا گیا۔ گہوارہ سے قبر تک کے مفادات کی محبت نے ایثار و قربانی کے امکانات ختم کرنا شروع کر دئے۔ دل و دماغ تنگ ہوتے چلے گئے اور زندگی کی بقا کے جذبات ہولناک حد تک خود غرضی کا شکار ہو گئے۔ اب محبت اور ایثار کے سارے فطری تقاضے مفاد پرستی کے لئے مصنوعی محبت، اور کاروباری ایثار کے دل فریب انداز میں تبدیل ہو گئے۔ صورت پورے حسن کے ساتھ باقی رہ گئی مگر روح فنا ہو کر رہ گئی۔

خوبصورت شہری تعمیرات اور انسان کی بدعنوانی سے زمین کی زرخیزی کو جو نقصان پہنچ رہا ہے اس کو دور کرنے کے لئے اسی خود غرضانہ مصنوعی زندگی کے ضمیر پر اخلاقی آپریشن کی ضرورت تھی مگر تہذیب جدید اس میں بری طرح ناکام نظر آتی ہے۔

مادی تہذیب کی پرتکلف اور مصنوعی زندگی میں لذت اندوزی اور سہل انگاری کے رجحانات تیزی سے کام کرنے لگتے ہیں۔ مشینی ارتقاء کی مفید خصوصیات کے ساتھ ساتھ مشین کاری نے محنت سے جی چرانے اور سہل پسندی کی خواہشات کو تسکین بھی دی ہے۔ یہ جغرافیائی حقیقت ہے کہ انسانوں کی گھنی

آبادیاں ان زرخیز اور شاداب علاقوں میں زیادہ واقع ہیں جہاں کاشت کاری اور مشین کاری کے آسان مواقع حاصل ہیں۔ اس کے مقابلہ میں جہاں یہ مواقع زیادہ دقت طلب اور محنت طلب ہیں انسانوں کی کم تعداد نے بود و باش اختیار کی ہے۔ یہ سہل انگاری قدرتی طور پر شہروں کے قریب کی ایک ہی زمین پر بار بار کاشت کرنے اور پیداوار کا بوجہ ضرورت سے زیادہ لاد دینے پر منتج ہونی چاہیئے نتیجہ کے اعتبار سے اس جدید تمدنی رجحان سے ایسا ہی ہوا اور مشینی طاقت کے ذریعہ ان خطوں پر کاشت کاری کے تجربات نہ ہو سکے جو جغرافیائی طور سے بود و باش اور زراعت کے لئے "سخت میدان" کی حیثیت رکھتے ہیں مگر جن کو سائنس اور مشین کی آگ سے "نرم" بنا دینا اب امکانات کی سیدھی سی بات بن کر رہ گیا ہے۔

کوئی شک نہیں کہ سائنٹیفک طاقتیں، تکنیکی فہم و شعور اور مشینی و آلاتی ترقی وغیرہ اس نئی تہذیب کا قابلِ فخر سرمایہ ہیں۔ لیکن جدید تہذیب و تمدن کے سائے میں جو خود غرض اور مصنوعی زندگی کا ذہن تیار ہوتا ہے وہ اس ارتقا اور عام انسانی استفادہ کے درمیان ایک دیو ہیکل چٹان کی طرح ایستادہ ہے سائنس کی مدد سے ہزاروں بے کار زمینیں بحال کی جا سکتی تھیں، سیکڑوں بنجر، بے آب و گیاہ علاقے قابل کاشت بنائے جا سکتے تھے اور عناصر اور جراثیم کی فوج کا مقابلہ کر کے فصلوں کا تحفظ کیا جا سکتا تھا لیکن جنگ کے محاذ پر اسلحہ جات کی ریس میں لگی ہوئی سائنس ان پر امن تعمیری میدانوں سے نظر پھیرے ہوئے چل رہی ہے۔ سائنس کے عظیم کارنامہ "جوہری توانائی" کے ذریعہ زراعت کی دنیا میں جو حیرت ناک انقلاب لایا جا سکتا ہے وہ آج عام آدمی تک کے لئے کوئی سربستہ راز نہیں۔ ہندوستان کے ایٹمی توانائی کمیشن کے صدر نے ایک بار اس باب میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا تھا کہ ایٹمی توانائی کے ذریعہ بلا کسی خاص زحمت کے فصلوں کو کئی گنا بڑھایا جا سکتا ہے۔ امریکن رپورٹر نئی دہلی کے کتابی ضمیمہ زیر عنوان ڈیماکریسی (Democracy) مورخہ ۲۰ جون ۵۶ء میں اس ضمن میں حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا گیا ہے:-

"ریڈیو ایکٹیو ایٹم (ISOTOPES) کے ذریعہ اہم زراعتی معلومات حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ اسی بنا پر اب یہ جاننا ممکن ہو گیا ہے کہ زرخیزی کے لئے کس قدر کھاد کی ضرورت ہے، ہر قسم کی نسل کے لئے کس قسم کی کھاد مناسب ترین رہے گی، اور پودے کی جائے وقوع کے لحاظ سے کس جگہ پر اس کا استعمال بہتر نتائج پیدا

کرے گا۔ سائنسداں اب پالا، گھُن اور پودوں کی دوسری بیماریوں کو باہر نکال دینے کی شاہراہ پر آگئے ہیں۔"

"ایٹمی تابکاری کے ذریعہ نئے قسم کے پودوں کو نشو و نما دینا بہت جلد تاریخِ زراعت کا اہم ترین واقعہ بن جائے گا۔ (ڈاکٹر ڈبلیو رلف سنگل ٹن)

لیکن ہم حیرت سے دیکھتے ہیں کہ ان عظیم سائنٹیفک طاقتوں والی تہذیب ہیروشیما اور ناگاساکی کی سیکڑوں فصلوں کو تباہ کرنے کے معرکہ سے فارغ ہو کر آج زراعت کے اس خوش آیند انقلاب کی نوید سنا رہی ہے! درحقیقت سائنس بھی تہذیب و تمدن کی اسی تہذیب، سہل انگار خود پرستی اور درندگی کے قدموں پر سجدہ ریز ہے جس نے موجودہ تمدنی محلوں کو انسانی خون اور گوشت سے تعمیر کیا ہے۔ قومی خود غرضی کے محاذ پر ان عملی طاقتوں کی برق رفتار چستی اور امن و ایثار کی سمت میں مضمحل و سست دیکھ کر جارج برنارڈ شا کے وہ الفاظ حقیقت بن کر سامنے آجاتے ہیں کہ جنگ کے لئے محیر خیز انکشافات کرنے والا دماغ زمانۂ امن میں سوئی ایجاد کر سکتا ہے!

واقعہ یہ ہے کہ بادی النظر میں مختلف وجوہ سے زمین کی زرخیزی اور پیداوار گھٹ رہی ہے مگر باطنی طور پر خود انسانی ضمیر تمدن کے ایک چمکدار پیغام اور مشین کے ایک طاقتور فولادی ٹکڑے میں تبدیل ہو کر اخلاقی اعتبار سے بنجر ہوتا چلا جا رہا ہے!

اضافۂ آبادی کی شکایت کیوں اضافۂ آبادی ایک دوسرا مسئلہ ہے جو ایک طرف بڑی حد تک زرخیزی کی تباہی سے ہی نکلا ہے تو دوسری طرف انسان کی بعض المناک تنگ خیالیوں پر سے پردہ اٹھاتا ہے ہمیں اس مسئلہ پر دو مختلف زاویوں سے نظر ڈالنی چاہئیے۔ اول یہ کہ اس مسئلہ کی حقیقت حال کیا ہے دوم یہ کہ آبادی اور پیداوار کے درمیان عدم توازن کی حقیقت کیا ہے؟۔

اضافۂ آبادی کا براہ راست تعلق انسان کے جنسی جذبات و تعلیمات سے ہے۔ یہ جذبہ جس قدر اعتدال کے دائرہ میں رہے گا آبادی کو بھی اعتدال کے حدود میں رکھے گا۔ یہ جذبہ جس قدر بے قابو اور انتہا پسندانہ ہوگا نسل انسانی میں اتنا ہی قابو سے باہر ہمہ گیر اضافہ ہوگا۔ نئی تہذیب میں جنسی خراج پایا جاتا ہے۔ دونوں صنفوں کے بے روک ٹوک آزاد رابطہ اور اختلاط نے نفسانی اور جنسیاتی ہیجانات

میں سرگرم مدہوشی پیدا کی ہے جس کے نتیجہ میں نئی نسل نے دنیا کو بچے پیدا کرنے کا گھر بنا دیا ہے۔ اب دنیا کے بڑے حصہ میں جنسی اختلاط کے لئے شادی اور ازدواج کی کوئی اخلاقی قید نہیں ہے۔ غیر قانونی پیدائشیں جن کا ہر طرف دور دورہ ہے اس تلخ حقیقت پر شاہد ہیں۔ آج ایک کمسن بچہ جو ماضی میں جنس کے شعور کا وہم بھی نہ کر سکتا تھا اچھا خاصا جنسی شعور رکھتا ہے۔ جوانی کی سرحدوں کو چھوتے چھوتے یہ شعور ایک جنسی دیوانگی میں تبدیل ہو چکا ہوتا ہے جس کو ماحول کی فلمی اور ادبی ہوائیں چنگاری سے آتش کدہ بنانے میں پورا کام کرتی ہیں۔ اس کے ہولناک نتائج جب کثرت آبادی کی شکل میں سامنے آتے ہیں تو ماہرین مادیات ضبط تولید کے لئے چیختے ہیں تاکہ تخلیقی مرحلہ میں ہی معصوم روحوں کو گوناگوں طریقوں سے ہلاک کر ڈالا جائے! یہ رجحان بھی جنسی بے راہ روی پر شاہد ہے کیوں کہ جنسی شدت کا نتیجہ ہی یہ ہوتا ہے کہ انسان میں خود غرضی، لذت پرستی اور خون آشام بربریت کا جوالا مکھی پھوٹ پڑتا ہے اور اپنی پرسکون لذت اندوزی کے لئے بڑی سے بڑی چیز کو تباہ کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ یہ ذہنیت بھی جدید تہذیب و تمدن کی پیداوار ہے۔ کیوں کہ جب لذت و آسائش کی حسین فضائیں تیار ہو گئی ہوں اور لذت اندوزی کی اخلاقی حد بندی نہ ہو تو زندگی ہر لذیذ گناہ کا تجربہ کرنے پر مجبور ہے۔

یہ وہ دور ہے جب کہ انسان کی عظمت کے راگ گائے جا رہے ہیں۔ قدرت پر اس کی طاقت اور عظیم کے کارناموں کو سراہا جا رہا ہے۔ اور انسان کو "مافوق الانسان" اور بلند ترین مخلوق بنانے کے نظریات بڑی فن کاری سے ڈھالے جا رہے ہیں۔ لیکن دوسری طرف عملی دنیا میں اس کے لئے ضبط تولید کا جذبہ ہو رہا ہے۔ اس کی آبادی کے اضافہ کو زمین کی تہذیب کے لئے خطرہ بتایا جا رہا ہے! کس قدر شاندار تضاد کا کھیل ہے یہ!۔

جہاں تک غذا کے ذخیروں کی کمی کا تعلق ہے وہ اس قدر کم نہیں جتنے نظر آتے ہیں۔ انسان کے پیدا کردہ قحط اور بلیک مارکٹ کی خبروں سے کون آشنا نہیں ہے؟۔ دیہات کے سیلابوں کے وقت غلوں کے مینار ٹھیک اس وقت پانی کی موجوں پر بہتے دیکھے گئے ہیں جب کہ اس علاقہ میں انسان بھوکے مر رہے تھے اور غلہ کی کمی کی عام شکایت تھی! ماہرین مادیات کا ایک گروہ یہ رائے بھی رکھتا ہے کہ غذا کی کمی کے

مقابلہ میں غذا کی غیر دیانت دارانہ فروختگی و تقسیم بھوک کے پھیلانے کی ذمہ دار ہے۔ یہ نظریہ اس قدر استحکام حاصل کرچکا ہے کہ اس کے آہنگ میں جمہوری رائے میں انقلابی اشتعال پیدا کئے جارہے ہیں۔ گویا ضبط تولید اور غلہ کے ذخیروں پر قبضہ کرنے کے دونوں مادی نظریوں کا خلاصہ یہ ہے کہ تمام غلہ حاصل کرنے کے بعد جس قدر آبادی کے لئے کافی ہوسکے اس کو باقی رکھا جائے اس کے علاوہ جو روحیں آنے والی ہیں ان کو ہلاک کرکے آبادی اور ذخیرہ غذا میں توازن پیدا کیا جائے! اگر حقیقت یوں ہی ہے تو شاید انسانی تاریخ میں اس سے زیادہ یاس انگیز نظریہ کوئی نہیں ہوسکتا!۔ اور —— بظاہر حقیقت یوں ہی نظر آرہی ہے!۔

درحقیقت اضافۂ آبادی یا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں اور اگر ہے تو کوئی نیا مسئلہ تو ہرگز نہیں ہے۔ تاریخ کی ابتدار سے آبادی اور غذا کے دائرہ میں ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا رہا ہے۔ جیسے جیسے انسانوں میں اضافہ ہوا زیادہ انسانوں نے زیادہ پیداوار کے طریقے معلوم کرکے زمین کے سینہ سے غذا کے ذخیرے نکالنے شروع کردیئے۔ لیکن ایک عرصہ سے آبادی اور پیداوار کے اضافہ میں توازن ختم ہوچکا ہے۔ آبادی جس جنسی مزاج کے زور میں زیادہ شدت سے بڑھتی رہی اتنی تیزی سے غذا اور پیداوار کے اضافہ کی کوشش نہیں ہوسکی۔ اب رفتہ رفتہ یہ توازن اس قدر بگڑ چکا ہے کہ آبادی اور پیداوار کے دونوں سروں کو ایک دم ملا دینا ناممکن نظر آنے لگا ہے۔ اس کے برخلاف اگر آبادی اور پیداوار کا توازن برقرار رکھتے ہوئے پہلے سے سماجی، اجتماعی جدوجہد جاری رہتی تو آبادی کا اضافہ ایک بلا نظر نہ آتا۔ بلکہ اس اضافہ کے ذریعہ زیادہ دماغ، زیادہ ہاتھ پاؤں زرخیزی کی طاقت بڑھانے اور پیداوار گنی دوگنی کرنے میں مدد دیتے۔ ضبط تولید کا پرچار کرنے والے یہ بات بھول جاتے ہیں کہ ہر آنے والی روح دنیا سے جس قدر لیتی ہے اس سے کہیں زیادہ دیتی بھی ہے!۔ مگر شرط یہ ہے کہ اس سے اس کی صلاحیتوں کا تعاون حاصل کرنے کے لئے ایک صحیح انسانی معاشرہ اور اجتماعی ماحول پہلے سے چاروں طرف موجود ہو۔ زمین کے اوپر اس وقت جتنے انسان سانس لے رہے ہیں ان کو ایک اجتماعی شعور کے ساتھ حرکت میں لانے کی دیر ہے جس کے بعد موجودہ سائنٹیفک طاقتوں اور انسانی طاقت (Man Power) کے ذریعہ قحط رسیدہ دنیا کو باسانی فصلوں سے لبریز کیا جاسکتا ہے اور ہر آنے والا نیا انسان اس مہم کو اور آگے اور آگے بڑھا سکتا ہے۔

اگر سائنس کا یہ مفروضہ صحیح ہے کہ کائنات متوازن ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ قدرت نے آبادی اور پیداوار کے امکانات میں توازن قایم نہ رکھا ہو! ۔ لیکن اس حقیقت کا احساس وہ باپ اور وہ مائیں کیا کر سکتی ہیں جو ضبط تولید کی کند چھری سے اپنی اولاد کو زندگی سے پہلے ہی ہلاک کر ڈالتی ہوں ۔ ان کی گنہگار فطرت اضافۂ آبادی کے سلسلہ میں اپنی خود غرض خوں آشامی کو اپنے آپ سے اور دنیا سے چھپانے کے لئے سیکڑوں غیر متعلق اور غیر حقیقی وجوہ و اسباب تلاش کر کے اضافۂ آبادی کے مسئلہ کو حل کرنا چاہتی ہے ۔ اصل حقیقت سے اغماض کر کے پرچھائیوں سے لڑنا اسی کا نام ہے! ۔

۳ ۔ دولت کی غلط تقسیم کا نظریہ یہ بات اپنی جگہ حقیقت ہے کہ بھوک کے پھیلاؤ میں دولت کی غلط اور غیر منصفانہ تقسیم اور حق ملکیت کی بدعنوانی کو بہت بڑا دخل ہے ۔ لیکن مادہ پرست نقطۂ نظر سے اس کا جو علاج سوچا جا رہا ہے وہ ایک خوبصورت فریب کے سوا کچھ نہیں! ۔ کسی مغربی مفکر نے سچ کہا تھا کہ "کمیونزم جہاں پر ختم ہوتا ہے وہاں سے مذہب کی سرحدیں شروع ہوتی ہیں" مادہ پرست نظریات جن کی بہترین مکمل شکل کمیونزم ہے اقتصادی ناانصافی کے نظریہ پر ختم ہو جاتے ہیں ۔ اس سے آگے ان میں کوئی "کیوں" نہیں ہے ۔ مذہب اس سوال کو اٹھاتا ہے کہ اقتصادی ظلم و ناانصافی کیوں ہوتی ہے آخر؟ اور پھر اس کا سیدھا اور صاف جواب دیتا ہے کہ "اخلاقی ذمہ داریوں کے فقدان سے" ۔ عام زندگی میں اخلاقی احتسابِ نفس کا عادی انسان ہرگز خود غرضی کی قربان گاہ پر جذبۂ ایثار کے سینہ میں خنجر اتار دینے کی جسارت نہیں کر سکتا ۔ زندگی کے ہر موڑ پر اخلاقی زوال سے معاشی ظلم و استبداد پیدا ہوتا ہے ۔ اس لئے اقتصادی ناانصافی سے دست بردار ہونے کے لئے اقتصادیات کی پرستش کے بجائے اخلاقی اقدار کو بلند کرنے کی ضرورت ہے ۔

درحقیقت کمیونزم خود سرمایہ داری کا ردِ عمل ہے ۔ وہ کوئی مثبت عمل نہیں ۔ اس کو زیادہ سے زیادہ مثبت ردِ عمل کہا جا سکتا ہے ۔ ہر ردِ عمل جس عمل کے خلاف ہوتا ہے اس میں اس عمل کے جراثیم بدرجہ اتم پائے جانے ضروری ہیں بشرطیکہ ردِ عمل سوائے جذباتی بازگشت کے کچھ نہ ہو ۔ کسی کے غصہ کے جواب میں بلا سوچے سمجھے غصہ آ جانے سے اس کا ثبوت ملتا ہے ۔ جوابی غصہ زیادہ

شدید اور بے قابو قسم کا ہوگا۔ اگر زیادتی نہ بھی ہو تو اس جوابی اقدام پر سوائے غصہ کے کوئی صحیح لفظ چسپاں کرنا مشکل ہوگا۔ کمیونزم کا یہی حال ہے کہ وہ سرمایہ داری سے بغاوت کرتا ہے مگر سرمایہ سے نہیں، دولت کی غلط تقسیم سے جنگ کرتا ہے مگر دولت کی قدر و قیمت کو تسلیم کرتے ہوئے! اس کا منشاء سوائے اس کے کچھ نہیں کہ دولت جس پر چند لوگوں کا قبضہ ہے بہت سے انسانوں کے قبضہ میں آجائے اور ان چند لوگوں سے چھین لی جائے۔ حالانکہ اصل سرچشمۂ فساد یہ حقیقت ہے کہ "دولت" نے زندگی میں غیر معمولی اور ضرورت سے زیادہ وقعت حاصل کر لی ہے۔ اور ہر انسان، ہر گروہ اور ہر قوم زندگی میں وقیع پوزیشن حاصل کرنے کے لئے دولت کے ذرائع پر زیادہ سے زیادہ اجارہ داری حاصل کر لینا چاہتا ہے۔

کمیونزم کے مطابق سرمایہ دار کے دل میں انسانی محنت سے ہمدردی و محبت کے بجائے دولت اور "قدر زائد" بچا لینے سے محبت ہوتی ہے۔ وہ دولت کو صرف دولت کے لئے جمع کرتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اصل لوٹ کھسوٹ کی جڑ دولت اور اس کی محبت ہوئی۔ کمیونزم دولت کی اس بھوک کو مٹاتا نہیں بلکہ خوبصورت نظریہ کے پردہ میں عوامی پیمانہ پر اس کو مشتعل کر دیتا ہے۔

پھر یہ بات بھی ناممکن نہیں کہ دولت کی اس وقعت کو انسانی نگاہ میں کم کر کے اصل معمول پر لے آیا جائے کیوں کہ ماحول میں اپنی شخصیت کو وزنی بنانے کے لئے دولت کے علاوہ اور بہت سی حقیقتیں بھی ہیں۔ مثلاً اپنی مسرت کو دوسروں کی مسرت کے ذریعہ حاصل کرنے کا شوق، فرد کی تعمیر ذات کے بجائے پوری سوسائٹی کی تعمیر کا جذبہ۔ لذت و آرائش کے بجائے صداقت اور سادگی کی عظمت کا یقین۔ پھر یہ بات عملی طور پر ہمارے سامنے ہے کہ جو لوگ اس عام انسانی فلاح و بہبود کے نیک اصول اور اونچے اخلاقی آدرشوں کے حامی ہوتے ہیں وہ اکثر مفلسی اور معمولی لباس کے باوجود سوسائٹی میں اس سرمایہ دار سے کہیں زیادہ وقیع اور موثر ہوتے ہیں جو دولت کے انبار رکھتا ہے اور خوبصورت زرق برق لباس زیب تن کئے ہوئے ہوتا ہے۔ خود تاریخ اس کی شاہد ہے کہ بڑے سے بڑے کروڑ پتی انسان کے مقابلہ میں ایسی ہی شخصیات کو تاریخ نے اپنے بلند ترین صفحات میں جگہ دی ہے۔

کمیونزم اس بنیادی علاج میں ناکام ہے۔ وہ دولت کی غلط پوزیشن کو مٹانے کے بجائے عوام

میں اس کو چھین لینے کے جذبات کو اشتعال دیتا ہے اور اس طرح دولت کی محبت کو کم کرنے کے بجائے کچھ اور بڑھا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اصل اقدام سے ناآشنا ہونے کی وجہ سے وہ عوامی اور اجتماعی بہبود کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے مجبوراً جبر کے غیر فطری طریقہ کو اختیار کرتا ہے اور زبردستی سماج کی ناہمواریوں کو مٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ "جبر" انسان کے اندر ہرگز وہ گہرا جذبہ عمل پیدا نہیں کر سکتا جو اختیاری طور پر اس کے قلب کو اپیل کر کے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس سے سطح بدل سکتی ہے مگر گہرائیوں میں کوئی انقلاب نہیں آتا۔ یہ کام اخلاقی تمیز پیدا کر کے پورا ہو سکتا ہے جس سے کمیونزم مذہب دشمنی کی وجہ سے ناآشنا ہے۔ اقتصادی انصاف اور تقسیم دولت کے لئے اجتماعی دردمندی اور عوامی بہبود سے محبت کا جذبہ دل و دماغ کی اخلاقی تبدیلی سے وجود میں لایا جا سکتا ہے۔ جبر و تشدد اور طاقت کے ذریعہ یہ جذبہ مستقل طور پر پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ "جبر" سے انسانی فطرت کو نفرت ہے کہ وہ حق و باطل کے تجربات کی آزادی چھین کر ذہنی ارتقاء کو روک دیتا ہے۔ آج کمیونزم کے سلسلہ میں یہ بات ثابت کرنے کے لئے دلائل کی ضرورت نہیں کہ وہ دولت و اقتدار کی بھوک کو مصنوعی طریقوں سے صرف عارضی طور پر پرسکون بنا سکا ہے۔ کیوں کہ حالیہ ہنگری کی بغاوت اور خود روس کے سیاسی بحران کے پیش نظر مشاہدہ کی بنیادوں پر کمیونزم کی یہ نفسیاتی خامیاں آنکھوں سے دیکھی جا رہی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ مشاہدہ کو کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ سورج کو چراغ دکھانے کی حماقت کسی کے نزدیک ضروری نہیں!۔

ہنگری کی بغاوت کے سلسلہ میں ابھی روس کی خبر رساں ایجنسی "تاس" کی طرف سے جو کتاب "True facts on Canents in Hagne" (ہنگری کے واقعات کی اصل حقیقت) شائع ہوئی ہے اس میں صاف طور سے اعتراف کیا گیا ہے کہ یہ عوامی اضطراب ایک حد تک نظام حکومت میں افراد کی نالائقی کے خلاف بجا ردعمل تھا۔ کمیونزم کے قلب روس میں مارشل اسٹالن کے فولادی پنجہ سے نجات پاتے ہی سیاسی رسہ کشی، جوڑ توڑ اور غداری کے ہنگامے آئے دن اخبارات کے کالموں سے گذر رہے ہیں۔ یہ سب واقعات اس بات کا زندہ ثبوت ہیں کہ جبر و تشدد کے ذریعہ سرمایہ دارانہ بھوکی ذہنیت کو مٹانے کے لئے کمیونزم کا نفاذ ہمیشہ کے لئے ممکن نہیں اور اس

کو بھوک کے پھیلاؤ کے خلاف ایک اکسیر تریاق کے طور پر تسلیم اور قبول نہیں کیا جا سکتا۔

بھوک کے مسئلہ کا اسلامی حل | بھوک ایک نہیں کئی طرح کی ہوتی ہے۔ روٹی کی بھوک، زمین کی بھوک، جنسی بھوک۔ لیکن ان سب میں بنیادی اور شدید ترین بھوک خود زندہ رہنے کی بھوک اور موت کا خوف ہے۔ انسان اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے جنون میں ہر چیز کی قیمت پر خود غرضی کا وحشیانہ کھیل کھیل سکتا ہے۔ غیر مذہبی اور مادہ پرستانہ نظریات میں زندگی کا تصور محض گہوارہ سے قبر تک پھیلا ہوا ہے زمانی اعتبار سے اس کی چھوٹی سے چھوٹی مدت یقین کے ساتھ مقرر نہیں کی جا سکتی۔ ظاہر ہے کہ یہ زندگی کا ایک محدود ترین، تنگ ترین اور مشکوک ترین تصور ہے۔ ایک تنگ تصور سے ...... تنگ نظری، شک و شبہ اور مفادات کے تحفظ کے لئے تعجیل پسند وحشیانہ خود پرستی پیدا ہونا لازمی امر ہے بہتر سے بہتر مادی نظریات حیات زمین اور زندگی کی حدوں میں کسی نہ کسی ارضی بھوک کو باقی رکھنا چاہتے ہیں اور کسی ایک بھوک کو مٹانے کے لئے کسی دوسری بھوک کے محور پر گردش کرتے ہیں۔ دنیا میں ان کی ناکامی اور انتشار آفرینی کی یہی بنیادی وجہ ہے۔

اسلام زندگی کے اس محدود تصور کو بے کراں وسعتیں عطا کرتا ہے۔ وہ موت کے بعد حقیقی جاودانی زندگی کا یقین دلاتا ہے۔ ایک فرد کا پوری انسانیت اور پوری انسانیت کا پوری مرئی اور غیر مرئی کائنات سے رابطہ پیدا کرتا ہے۔ اس وسیع ترین تصور زندگی کے مفادات کا تحفظ کرنے کے لئے پوری انسانیت اور کائنات کے مفادات کی حفاظت لازمی قرار دیتا ہے۔ ارضی، انفرادی زندگی کی خود غرضانہ بھوک کا تبادلہ ایک دوسری ابدی زندگی کی بھوک سے کرتا ہے جو قدرتی اور نفسیاتی اعتبار سے تنازع للبقار کی ہر کشمکش اور تصادم کو اجتماعی، آفاقی ہم آہنگی میں تبدیل کر دینے کا پہلا اور آخری اسلوب ہے اس مقام پر اپنی ابدی زندگی کے حصول کے لئے ایک فرد پوری انسانیت اور پوری کائنات کو اس ارضی زندگی کی ہر قیمت پر زندہ رکھنا اپنے مفاد میں لازمی سمجھنا سیکھ لیتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پر خودی کی مجرمانہ زندگی موت نظر آنے لگتی ہے اور دوسروں کا پیٹ بھرنے کے لئے خود بھوکا مرجانا زندگی کی جاودانی راحتیں قلب و روح پر انڈیلنے لگتا ہے۔ ابدی زندگی کی یہ بھوک دنیا کا وہ بلند ترین مقصد حیات ہے جس پر زندگی

اور اس کی ہر ایک بھوک کو قربان کرنا ممکن ہو جاتا ہے۔ قربانی کا نفسیاتی اور فطری فلسفہ یہی ہے کہ بلند تر چیز کے لئے کمتر چیزوں کو بے دریغ لٹا دیا جائے۔ یہ بھی ایک خود غرضی ہے مگر وہ بلند ترین خود غرضی جس کے لئے دنیا کی زبان میں خلوص اور بے لوث ایثار کے الفاظ وضع کئے گئے ہیں۔ یہ بھی ایک بھوک ہے مگر اس کی غذا زندگی کی کوئی خود غرضانہ لذت نہیں ہے بلکہ خود غرضانہ جذبات کو خود ہی کھا کر یہ ابدی زندگی کی بھوک کو تسکین دیتی ہے

پھر یہ نظریۂ حیات کوئی کاغذی یا تخیلی نظریہ نہیں۔ بلکہ ہر مذہب اپنی بے داغ، غیر مسخ شدہ سچائی کے دور میں اس کی تاریخ پیش کر چکا ہے۔ بہترین تاریخی معیار پر آخر میں دنیا کا آخری دین اسلام اپنے قرون اولیٰ کی تاریخ میں اس کی تابناک مثال پیش کرتا ہے۔ اس کے واقعات و حقایق ظاہر کرتے ہیں کہ کس طرح ایک اپنے جیسے بھوکے انسان کے لئے صرف ایک روٹی کے دو ٹکڑے کر کے باہم تقسیم کئے جا سکتے ہیں اور ضرورت ہو تو دونوں ٹکڑے قربان کر کے بھوکا رہا جا سکتا ہے، کس طرح خوبصورت بیویوں کو طلاق دے کر ان اجنبی انسانی بھائیوں کے نکاح میں دیا جا سکتا ہے جو مکہ سے ترک وطن کر کے مدینہ میں غیر ازدواجی زندگی اور تنہائی کے دن گذار رہے ہیں اور کس طرح دولت کے آخری سکہ کو ضرورت مندوں پر قربان کئے بغیر رات کو میٹھی نیند سونا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اسلامی دور عروج کی تاریخ اور آغاز اسلام کے زمانہ میں ان جیتے جاگتے ٹھوس واقعات کا سراغ تاریخ کا ہر حق پسند غیر جانب دار طالب علم لگا چکا ہے اور آج بھی بآسانی لگا سکتا ہے۔

اصولی طور پر زندگی کی ہر بھوک کو ابدی زندگی کی بھوک کے ماتحت لے آنے کے بعد پوری زندگی میں اس فیصلہ کو نافذ رکھنے کا راز انسانی ذہن کی اختیاری تبدیلی اور خدا کے تصور میں پوشیدہ ہے۔ ہر جگہ موجود، ہر چیز سے باخبر، ہر چیز کے پالنہار قادر مطلق کا تصور! تاکہ اگر ذہنی لغزش کا مقام آئے تو خدا کا تصور اصولی راستہ سے ذہنی انحراف کا سدباب کرتا چلا جائے۔ دنیا کا بہترین دستور و قانون محض اعمال و کردار پر اور وہ بھی اس کے ظاہری گوشوں پر نافذ کیا جا سکتا ہے، اعمال کا بہت بڑا خفیہ حصہ اور خیالات و جذبات کی ساری دنیا اس قانون کی دار و گیر کے اس پار ہی رہتی ہے۔ انسان کے لئے انسان کے بنائے ہوئے قانون کی یہی بنیادی خامی ہے۔ کیوں کہ عمل ہمارے خیال کا پرتو ہے اور جب تک خیالات زیر نگیں نہ لائے جائیں عمل کے دائمی خلوص و بقا کی کوئی ضمانت نہیں۔ کیسی بے چارگی کی بات ہے یہ! کس قدر مایوسانہ!

اور اسلام ــــ ایک مکمل اور برحق دین کی آخری شکل میں ان اندھیروں کا سینہ چیرتا ہوا طلوع ہوتا ہے۔ گھٹاٹوپ منڈلاتے ہوئے، وحشیانہ اندھیاروں میں امید کی اکیلی شعاع ــــ بھوک کی رات میں تسکین کی تنہا کرن!!

ادبیات

غزل

از

(جناب اکمل مظفر نگری)

دیوانگیٔ عشق کا ساماں لئے ہوئے
ذرّے کدھر چلے ہیں بیاباں لئے ہوئے

رسوائیٔ جنوں کی بہاریں ہیں ذمہ دار
ہر گل ہے میرا چاکِ گریباں لئے ہوئے

اک دل ہے اور اُس میں ہزاروں قیامتیں
پھرتا ہوں ساتھ کوچۂ جاناں لئے ہوئے

وہ جانتا ہے کاوشِ پنہاں کی لذتیں
لختِ جگر ہو جو سرِ مژگاں لئے ہوئے

ہونے لگی حقیقتِ در پردہ آشکار
جب آئے خود وہ جلوۂ امکاں لئے ہوئے

ڈھونڈا بہت پہ دورِ جہاں میں نہ مل سکا
وہ دل کہ جو نہ ہو غمِ پنہاں لئے ہوئے

لیتا ہے جس سے مایۂ صد رنگ و بو چمن
ایسا بھی داغ ہے دلِ سوزاں لئے ہوئے

آزاد جب ہوا تو یہ سمجھا اسیرِ غم
شامِ قفس تھی صبحِ گلستاں لئے ہوئے

دامن سمجھ کے ان کا رہا بے خودِ نشاط
میں تھا اگرچہ اپنا گریباں لئے ہوئے

اہلِ بہار میں کوئی ایسا نہ مل سکا
جو گلستاں میں ہو غمِ زنداں لئے ہوئے

محشر یہ مجھ کو شورشِ ہستی کا ہے گماں
اب تک ہوں یادِ خوابِ پریشاں لئے ہوئے

جنگل کی وسعتوں میں بگولے اِدھر اُدھر
پھرتے ہیں کس کا سازِ غزل خواں لئے ہوئے

جس میں ہیں چند اشکِ ندامت ترے حضور
آیا ہوں میں وہ گوشۂ داماں لئے ہوئے

تاریکیوں میں دہر کی پہلے پہل اکمل
آئے تھے آپ شمعِ فروزاں لئے ہوئے

تبصرے

فکرِ اقبال از ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم تقطیع کلاں ضخامت ۶۷۵ صفحات ٹائپ جلی اور روشن قیمت مجلد غلاف ۱۰ روپیہ پتہ:- بزمِ اقبال نرسنگھ داس گارڈن۔ کلب روڈ لاہور۔

ڈاکٹر اقبال کی شاعری۔ فلسفہ اور اُن کی شخصیت پر مختلف زبانوں میں سینکڑوں مقالات اور بیسیوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور اب تک اُس کا سلسلہ ختم نہیں ہوا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ چونکہ مرحوم کی شاعری زندگی کے اُن حقائق اقدار کی ترجمان ہے جو ازلی اور ابدی ہیں اس لئے انسانی شعور و تجربہ جس قدر زیادہ ترقی کرے گا اُسی قدر کلامِ اقبال کے رموز و غوامض کا انکشاف زیادہ ہوگا اور اُس پر نئے نئے عنوانات سے اور کتابیں لکھی جائیں گی۔ چنانچہ یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے اس میں لائق مصنف نے جو اردو زبان کے نامور ادیب اور ماہرِ فلسفہ ہونے کے علاوہ اقبالیات کے مسلم استاد ہیں۔ اقبال کے تمام مجموعہ ہائے نثر و نظم کا بڑی دقتِ نظر کے ساتھ مطالعہ کرنے کے بعد فکرِ اقبال کی اصل حقیقت اُس کے تدریجی ارتقاء اور اس ارتقاء کے خارجی اور داخلی موثرات و عوامل کا دیدہ وری کے ساتھ جائزہ لیا ہے اور اُن پر بڑا فاضلانہ اور مبصرانہ تبصرہ کیا ہے اس سلسلہ میں انھوں نے اقبال کے محبوب اور عام موضوعاتِ سخن مثلاً مغربی تہذیب و تمدن۔ اشتراکیت جمہوریت۔ عشق و عقل۔ تصوف۔ اسلام۔ خودی۔ بے خودی۔ ابلیس۔ وغیرہ کے مطابق کتاب کو متعدد ابواب میں تقسیم کیا ہے اور ہر باب میں پہلے نفسِ موضوعِ سخن کی اصل حقیقت کو حسبِ موقع علوم جدیدہ و اسلامیہ کی روشنی میں متعین کیا ہے اور پھر اُس کے متعلق اقبال کے فکر و خیال کو وضاحت سے بیان کرنے کے بعد اس پر تبصرہ اور محاکمہ کیا ہے۔ علاوہ بریں اس کتاب کی بڑی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اقبال پر جن لوگوں نے کتابیں لکھی ہیں اُن میں کم ہی ایسے ہوں گے جنہوں نے مرحوم کے انگریزی خطبات پڑھنے کے بعد ان کو پورے طور پر ہضم بھی کیا ہو لیکن لائق مصنف نے امعانِ نظر کے ساتھ ان کا مطالعہ ہی نہیں کیا بلکہ ان خطبات کا خلاصہ بھی اُردو زبان میں کتاب کے آخر میں شامل کر دیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب درحقیقت ایک ایسا صاف و شفاف

آئینہ ہے جس میں فکرِ اقبال کا چہرہ اپنے تمام خد و خال کے ساتھ مکمل طور پر سامنے آجاتا ہے۔ کتاب اگرچہ بڑی ضخیم ہے لیکن زبان و بیان اور اندازِ تحریر ایسا شگفتہ رواں اور دلچسپ ہے کہ پڑھنے والا ذرا نہیں اکتاتا اور جس قدر وہ آگے بڑھتا جاتا ہے اسی قدر اس کی دلچسپی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ روحِ اقبال ڈاکٹر یوسف حسین خاں۔ اور اقبال کامل مولانا عبد السلام ندوی کے بعد اقبال پر یہ تیسری کتاب ہے جو بڑی بصیرت افروز جامع اور محققانہ ہے۔ کلام اقبال پر تبصرہ کرتے ہوئے یا بعض اعتراضات کا جواب دینے میں مصنف نے کسی بے جا طرف داری سے کام نہیں لیا بلکہ جہاں کہیں اقبال سے واقعی زبان و بیان کی غلطی ہوئی ہے اس کا اعتراف بھی کیا ہے، اس زمانہ میں جب کہ بعض کوتاہ نظر اقبال کو اپنے مقاصد مشوہہ کے لئے استعمال کر رہے ہیں یہ کتاب عظیم افادیت کی حامل ہے جس پر ڈاکٹر صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں:

رکعات تراویح از جناب مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی تقطیع متوسط کتابت و طباعت بہتر ضخامت ۹۶ صفحات .... قیمت درج نہیں پتہ:۔ محمد ایوب صاحب اعظمی جامعہ مفتاح العلوم متو ضلع اعظم گڈھ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز تراویح کی رکعات کا کوئی خاص تعین مروی نہیں ہے۔ بلکہ کبھی آپ نے چار پڑھی ہیں۔ کبھی آٹھ۔ کبھی دس اور کبھی بیس اور کبھی امت پر سہولت کی غرض سے سرے سے تراویح پڑھی ہی نہیں۔ حضرت ابو بکرؓ کے عہد میں بھی ایسا ہی ہوتا رہا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے ان کی تعداد بیس مقرر فرمادی اور اس وقت سے آج تک امت کا معمول برابر یہی رہا ہے کہ مسجد میں تراویح کی بیس رکعتیں پڑھی جاتی ہیں لیکن مسلمانوں کا ایک طبقہ ہے جس کو آٹھ رکعتوں پر اصرار ہے اور بیس رکعتوں والی روایت کو مجروح قرار دیتا ہے۔ فاضل مصنف نے جو مشہور محدث اور نہایت وسیع النظر عالم و محقق ہیں اس رسالہ میں اس طبقہ کے اس خیال کی تردید بڑے محققانہ انداز میں کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت عمرؓ کے عہد سے امت مسلمہ کا عمل بیس یا بیس سے زائد رکعتوں پر ہر زمانہ میں اور ہر جگہ رہا ہے اور نیز یہ کہ بیس رکعتوں والی مرفوع روایت کو ناقابل اعتبار قرار دینا اور آٹھ رکعتوں والی روایتوں کو ہی صحیح سمجھنا از روئے اصولِ حدیث درست نہیں ہے۔ نفس موضوع پر جو بحث کی گئی ہے وہ تو بڑی جامع اور فاضلانہ ہے ہی اس کے علاوہ ضمناً بھی اصولِ جرح و تعدیل اور نقدِ حدیث

کے متعلق بعض بڑی کارآمد اور مفید باتیں آگئی ہیں اس لئے علما اور طلبا کو اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے۔

طالب و موہنی مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور تقطیع خورد ضخامت ۸۰ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ پتہ :- سب رس کتاب گھر۔ خیریت آباد۔ حیدر آباد دکن (آندھرا) سید محمد والہ موسوی متوفی ۱۷۶۹ء دکن کے ایک فاضل اور شاعر تھے۔ نظم و نثر کی دوسری تصنیفات کے علاوہ انھوں نے ایک مثنوی بھی لکھی تھی جس میں مہاراشٹر کے ایک تاریخی شہر پنڈو کی پرانی داستان عشق و محبت جس کو والہ نے ایک بوڑھے برہمن کی زبانی سنا تھا۔ اس کو منظوم کیا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب یہی مثنوی ہے حسن اتفاق سے اس مثنوی کے مخطوطہ کا ایک ہی نسخہ ادارہ ادبیات اردو کے ذخیرۂ مخطوطات میں شامل تھا۔ ڈاکٹر زور نے اس کو اپنے فاضلانہ مقدمہ کے ساتھ اڈٹ کرکے شائع کردیا ہے۔ اگرچہ مثنوی کی زبان اردو فارسی اور دکھنی تینوں زبانوں کا مجموعہ ہے اور اس لئے نسبتاً سہل و آسان ہے لیکن پھر بھی اگر غیر معروف الفاظ کے معنی اور ان کی فرہنگ دے دی جاتی تو جو لوگ دکھنی زبان سے بالکل ہی آشنا نہیں ہیں ان کو بھی مثنوی کے سمجھنے میں سہولت ہوتی۔ بہرحال یہ مثنوی زبان کے اعتبار سے بڑی اہم ہے اور اس سے اردو کے لسانی ارتقا کے سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔

کلمات اکابر از مولانا محمد اسحٰق بنارسی تقطیع خورد ضخامت ۱۲۶ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ پتہ :- مولانا محمد اسحٰق بنارسی کھجی باغ بنارس

اس کتاب میں قرآن و حدیث اور اکابر و مشاہیر اسلام کے ملفوظات سے منتخب کرکے وہ فقرے یا جملے منتخب کرکے یکجا کردیے گئے ہیں جن میں اخلاقی۔ اصلاحی اور دینی و معاشرتی تعلیمات ہیں۔ یہ تمام کلمات نہایت مفید اور جامع ہیں ضرورت ہے کہ مسلمان خود ان کو بار بار پڑھیں اور اپنی اولاد کو پڑھائیں۔ چند ماہ میں ہی کتاب کے دو اڈیشن نکل چکے ہیں۔ یہ تیسرا اڈیشن ہے۔ کتاب کی مقبولیت کا اندازہ کرنے کے لئے یہی کافی ہے۔ کلمات سے پہلے چند سطروں پر صاحب کلمات کا تعارف بھی کرادیا گیا ہے۔ کتاب کے نافع ہونے میں اب بھی کلام نہیں۔ لیکن اگر کلمات کی ترتیب بجائے اشخاص و افراد کے مضمون کے اعتبار سے ہوتی تو زیادہ بہتر ہوتا۔

مولانا فیض احمد بدایونی

از جناب محمد ایوب قادری بی۔ اے تقطیع خورد ضخامت ۴۰ صفحات کتابت وطباعت معمولی قیمت ۱۲ر پتہ:- منیجر پاک اکیڈمی ۱۴/۱ جیدآباد گولی مار۔ کراچی۔

۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی میں جن مجاہدوں نے حصہ لیا تھا اُن میں ایک مولانا فیض احمد بدایونی بھی تھے۔ مولانا علمار وفضلا کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور خود بھی بڑے عالم ورصاحب درس وتدریس تھے۔ آگرہ میں انگریزی ملازمت کے زمانہ میں مفید اسلامی خدمات انجام دیں۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف جو جنگ ہوئی اُس میں بڑی بہادری اور شیردلی کے ساتھ حصہ لیا۔ لیکن جنگ کی ناکامی پر غیرت نے گوارا نہیں کیا کہ پھر انگریزوں کو منہ دکھائیں۔ ایسے روپوش ہوئے کہ آج تک ان کا سراغ ہی نہیں لگ سکا۔ مولانا اگرچہ اتنے بڑے عالم اور مجاہد تھے لیکن افسوس ہے کہ خود مولانا کے اہل خاندان نے جو کتابیں لکھی ہیں ان میں بھی مصالحتاً مولانا کے مفصل حالات وسوانح اور کارنامے نہیں لکھے گئے۔ لائق مؤلف لائق مبارک باد ہیں کہ انھوں نے محنت اور تلاش سے اس مجاہد جلیل کو گوشۂ گمنامی سے نکال کر لوگوں سے اُن کا تعارف کرایا۔ کتاب میں مولانا کے حالات وسوانح کے علاوہ آگرہ وبدایوں سے متعلق بعض اور مفید تاریخی معلومات بھی آگئی ہیں۔ اوران کی وجہ سے اس مقالہ کا علمی وزن بڑھ گیا ہے۔

امام ابوحنیفہ کی تدوین قانون اسلامی

از ڈاکٹر محمد حمید اللہ تقطیع خورد ضخامت ۷۶ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت ۱۲ر پتہ:- دارالاشاعت مقابل مولوی مسافرخانہ کراچی ۱۔

لائق مصنف اسلامیات کے نامور محقق اور فاضل ہیں اور ساتھ ہی قانون کے ماہر اور اس کے پروفیسر رہ چکے ہیں اس لئے انھوں نے اس مقالہ میں ایک ماہر قانون کے نقطۂ نظر سے فقہ حنفی کی تدوین کے پس منظر کا جائزہ لیا ہے اور امام اعظم کی زندگی کے حالات، آپ کے شیوخ کی مقامی خصوصیات اور اس عہد کے تہذیبی اور تمدنی عوامل کی روشنی میں بتایا ہے کہ امامِ عالی مقام نے فقہ کی تدوین وترتیب کن دواعی کی بنا پر کی کس طرح کی۔ کن اصول پر کی اور اُس میں کچھ خارجی اثرات پائے جاتے ہیں یا نہیں اس سلسلہ میں موصوف نے ایک اصولی بحث کرنے کے بعد علمی دلائل سے اس خیال کی پرزور تردید کی ہے کہ اسلامی قانون رومن لا سے ماخوذ ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں فاضل مصنف کی یہ عبارت بھی یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ

"شام ومصر کے ابتدائی فقہا نے رومی روایات قبول کئے ہوں گے تو عراق و ایران کے فقہا نے ایرانی

رواجات۔ اسپینی فقہا نے اندلسی اور گاتھک رواجات اور ہندی فقہا نے دھرم شاستر سے متاثر

رواجات۔ یقیناً یہ تمام رواجات ان چیزوں کے متعلق قبول کئے گئے جن کے متعلق قرآن وحدیث

خاموش تھے اور جن کے خلاف کوئی صریح حکم نہیں تھا۔ فقہاء نے یہ رواجات معقول اور قیاساً

درست سمجھے اور قرآن وحدیث کے مطابق ہونے کے باعث قبول کئے۔ جب ہم یہ سب ماخذ

تسلیم کرنے پر آمادہ ہیں تو خود ہی یہ سوال حل ہو جاتا ہے کہ قانون روما کا حصہ کتنا تھا۔" ص ۵۴

علماء اور فقہ اسلامی کے طلباء کو خاص طور پر اس مقالہ کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

ہدیۂ طاہرہ تقطیع خورد ضخامت ۴۴ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت کچھ نہیں مفت برائے

تقسیم پتہ:- بانو طاہرہ سعید گرین ویو نمبر ۴۱ سیف آباد۔ حیدرآباد دکن۔

محترمہ بانو طاہرہ سعید اعلیٰ انگریزی تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔ ایک قدیم ایرانی خاندان سے تعلق رکھتی

ہیں۔ مشرق اور مغرب کے اکثر ممالک کی سیر کر چکی ہیں۔ انگریزی۔ فارسی اور اردو تینوں زبانوں کی شاعرہ

اور افسانہ نگار ہیں لیکن باایں ہمہ اُن کا یہ دینی ذوق لائق صد آفرین و تحسین ہے کہ نعتیہ نظمیں سلام اور

منقبت بھی کثرت سے لکھتی ہیں، یہ کتابچہ موصوف کی اسی قسم کی نظموں۔ غزلوں اور رباعیات و قطعات

کا مجموعہ ہے جو انھوں نے امسال حضرت علی کے چہاردہ صد سالہ جشن ولادت کے موقع پر شائع کیا

تھا۔ کلام میں نسوانی معصومیت کے ساتھ سوز و گداز۔ اور زبان کی شستگی کے ساتھ برجستگی و بے ساختگی

آں محترمہ کے فطری اور پختہ مشق شاعرہ ہونے کی دلیل ہے۔ اہل ذوق کو اس کے مطالعہ سے لطف

و سرور حاصل ہوگا۔

Registered No D 183

ندوۃ المصنفین کی ممبرشپ

۱- لائف ممبر کم سے کم ایک [illegible] روپے یک مشت مرحمت فرمانے والے اصحاب اس حلقے میں شامل کئے جاتے ہیں، ایسے اربابِ ذوق کی خدمت میں برہان اور مکتبہ برہان اور ادارے کی تمام مطبوعات پیش کی جاتی ہیں، کتابوں کی جلد پر لائف ممبر کا نام نامی سنہری حرفوں سے ثبت کیا جاتا ہے۔

۲- معاونین خاص کم سے کم سو روپے سالانہ مرحمت فرمانے والے اصحاب حلقۂ معاونینِ خاص میں داخل کئے جاتے ہیں اور ان کی یہ اعانت عطیۂ خالص کے طور پر قبول کی جاتی ہے، ان حضرات کی خدمت میں بھی سال کی تمام مطبوعات اور برہان بغیر کسی معاوضے کے پیش کیا جاتا ہے۔

۳- معاونین اس حلقے کی سالانہ فیس تیس روپے ہے، معاونین کی خدمت میں سال بھر کی تمام مطبوعاتِ ادارہ اور برہان کسی مزید معاوضے کے بغیر پیش کئے جاتے ہیں۔

۴- معاونینِ عام معاونینِ عام کی سالانہ فیس بیس روپے ہے، ان کو سال کی تمام غیر مجلد مطبوعات دی جاتی ہیں اور برہان بلاقیمت دیا جاتا ہے۔

۵- احبّاء حلقۂ احبّاء کی سالانہ فیس دس روپے ہے، ان کی خدمت میں برہان بلاقیمت پیش کیا جاتا ہے اور ان کی طلب پر ایک فیس کے بدلے میں ایک سال کی غیر مجلد مطبوعاتِ ادارہ نصف قیمت پر دی جاتی ہیں۔

قواعدِ رسالہ برہان

(۱) برہان ہر انگریزی مہینے کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین اگر وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کئے جاتے ہیں۔

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاک خانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیں۔ ان کی خدمت میں پرچہ دوبارہ بلاقیمت بھیج دیا جائے گا اس کے بعد شکایت قابلِ اعتبار نہیں سمجھی جائے گی۔

(۴) جواب طلب امور کے لئے ۲ر آنہ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا چاہیے۔ خریداری نمبر کا حوالہ ضروری ہے۔

(۵) قیمت سالانہ چھ روپے۔ دوسرے ملکوں سے گیارہ شلنگ (مع محصول ڈاک)، فی پرچہ ۱۰ر آنے۔

(۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

حکیم مولوی محمد ظفر احمد پرنٹر و پبلشر نے الجمعیۃ پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر برہان دہلی سے شائع کیا۔